

کونج و چھڑ گئی ڈاروں



فائزہ افتخار

گونج و چھڑگئی ڈاروں

ایک مقولہ ہے ”گھائل کی گھٹ گھٹ گھائل جانے۔“
اسی مقولے کے گرد گھومتی پانچ سہیلیوں کی داستانِ غم۔ ان کے مزاج الگ
تھے، طبیعت جدا تھی، حالات مختلف تھے، ان کی کلاس میں فرق تھا مگر ان کے
خواب، ان کے جذبے، ان کی تھمتیں، ان کی خوشیاں اور غم سب اچھے تھے۔ وہ ڈار
سے بچھڑی کو نہیں تھیں اور خوشوار لبہ ان کو فونپنے کے در پے تھے۔

ہم پانچوں میں کی باتیں مشترک نہ ہونے کے باوجود بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ ہم
پانچوں مختلف طبقوں اور کیونٹیر سے تعلق رکھتی تھیں۔ مختلف مزاج، مختلف خاندانی پس منظر اور
مختلف دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ ایک مشترک دکھ جو ہمیں ایک دوسرے کے قریب لایا وہ یہ تھا
کہ ہم پانچوں ہی اپنی اپنی ڈار سے بچھڑی ہوئی تھیں۔ اگرچہ ہم میں سے چار ایک ہی کالج
میں تھیں مگر ہمارے مضافین تقریباً جدا تھے۔ الگ الگ کلاسز کے بعد ہم چاروں بھولیاں کالج
گراؤنڈ میں اپنی اس مخصوص جگہ پر اکٹھی ہوتیں جہاں ایک درخت کا ٹوٹا ہوا تنہا پڑا تھا۔ اسی
درخت پہ بیٹھ کر ہم اپنی اپنی باتیں چمکتی ہوئی گونج کا انتظار کرتے جو بارہ بجے کے بعد اکثر
ہمارے کالج آ جاتی۔ کبھی تو خوب ہلکا گایا جاتا، دور نزدیک سے گزرنے والی لڑکیوں پہ مختلف
ریمارکس پاس کیے جاتے، خواہ مخواہ دوسروں سے بچنے لے کر جھگڑا کرتے اور کبھی یونہی ہاتھ میں
چپس کی پکٹ پکڑے سر جھکائے سٹیپی رہتیں۔

کالج کی دیگر لڑکیوں کے لیے ہمارا گروپ بے حد ہراساں کرتا تھا۔ ہماری اور کسی سے کوئی
خاص علیک سلیک نہ تھی، عجیب مست موالا ٹائپ لڑکیاں تھیں ہم، لیکن پھر بھی اندازہ تھا کہ
نیچر ز اور دیگر لڑکیاں ہمارے بارے میں کس قسم کے اعلیٰ خیالات رکھتی ہیں۔
اکثریت کے خیال میں ہم آزاد خیال فیملی کی ماؤں لڑکیاں ہیں تو فریفا کالج آتی ہیں،
کچھ کے خیال میں ہم آوارہ لوزر کیئر لڑکیاں ہیں، جدھر منہ اٹھایا چل پڑیں۔ کچھ کے ذہن
اس سے بھی دور کی سوچ لاتے۔

بے چاری بروکن فیملی کی کمپلکڈ گرلز نہ جانے کون کون ہمیں کس کس کے ساتھ رینگے
ہاتھوں پکڑ چکا تھا، نہ جانے کس کس کے منگیترو ہم نے، تھمایا لیا تھا۔ ہم چپ چاپ سہتیں، نہ
تردید نہ تصدیق۔ روزہ منیہ کبھی کبھی جھنجھلا جاتی۔

دے۔ مہا کا تعلق ایک مشہور ادبی و تعلیمی خاندان سے تھا انہیں ہمیشہ اپنے خاندان کی طہیت اور قابلیت پر غور رہا۔ اسی زعم میں انہوں نے سارے بچوں کی تربیت انہی خطوط پہ لی کہ پڑھنے، پڑھنے اور صرف پڑھنے کے علاوہ ان کے نزدیک زندگی کا مقصد کوئی نہیں تھا مگر میری پیدائش کے بعد انہوں نے شاید سوچا کہ صرف اپنی اولاد کو اس کا نہ بنانے سے ملک و قوم کی صحیح خدمت نہ ہو رہی ہو اس لیے بڑے پتے پرانے پر ایک کانونت سکول کھول لیا۔ یوں میرا بچپن مہا کے اس مشن کی نذر ہو گیا۔ اپنے دوسرے بہن بھائیوں کی نسبت میرا تعلیمی ریکارڈ مہا اور پاپا کی عدم توجہ کے باعث کچھ خاص نہ تھا۔ وہ بے سوچے سمجھے تھے کہ شاید ان کی ساری اولاد ہی عالم فاضل پیدا ہوئی ہے اور جب میں نے ان کی توقعات اور اپنے خاندان کے خلاف روایت گزارے لائق زلزلت لانے شروع کیے تو مجھے ہائل بھیج دیا گیا اور اب میں پچھلے چھ برس سے مختلف ہائل میں قید تنہائی جھگرت رہی ہوں۔

یوں یہ مشترکہ کدھ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا اور ڈیڑھ سال تک ہماری دوستی بلا شرکت غیرے چلتی رہی۔ سینڈ ایٹر کے آخری دنوں میں اچانک ہی ہارنیک ایک کلاس فیلو فیر یار شیدہ نامحسوس طریقے سے ہمارے درمیان آگئی۔ ہم میں اور اس میں کوئی بات بھی تو نہیں ملتی تھی۔ ہم دونوں شہر کی کریم سے تھے۔ گچڑ فمیلیر سے اور وہ ڈل کلاس کے ایک غیر تعلیم یافتہ اور کسی حد تک اچنڈ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ہم دونوں بس یونیورسٹی اسٹوڈنٹس تھے اور وہ کالج کی ڈین ترین طالبہ، ایکٹو، انٹیلیجنٹ، ڈیمنڈ اور نہ جانے کیا کیا۔ ہم دونوں انتہائی سنجیدہ اور کونے میں بیٹھ کر باتیں کرنے والے اور وہ ہاتھ پہ ہاتھ مار کے مقہمہ لگانے والی۔ جب شروع شروع میں اس نے ہمارے ساتھ راہ رابطہ بوجھانے کی کوشش کی تو ہم نے زیادہ نوٹس نہیں لیا وہ اسی طرح مختلف گروپس کے ساتھ دو تین دن کی دوڑتیاں رکھ کر نامہ پاس کیا کرتی تھی لیکن وقت گزرتا گیا اور لڑکیوں کی سرگوشیاں جب ہمارے کانوں تک پہنچیں۔

”ڈارا ان دو لڑکیوں کو دیکھنا، یہ آج کل مجھے تین تین کیوں نظر آ رہی ہیں کہیں میری آنی سائنٹ“ اور پھر پوچھتے..... تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم تو واقعی تین ہو چکی ہیں۔

فیر یا بلی آنکھوں، جھکے نقوش اور سرخی مائل بھورے بالوں والی دلی پٹی لڑکی تھی۔ خالص بھائی لکھے میں اردو بولنے والی دھون، پچر سے مہرے سے بھانن پھاڑی دو شیرہ لگتی تھی۔ ہم لوگ کبھی کبھی اسے ریماکس کہہ کے چھپڑے لیکن اس کے خیال میں وہ ریماکس بھانے جو یا رابرٹس سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے۔ اعلیٰ اعلیٰ فیر یا کوسنور نے کاسلیق تھا۔ اپنے علیے سے وہ کبھی بھی طرح رنگ محل کی رہنے والی نہیں لگتی تھی۔ سردیاں ہوں یا گرمیاں یا برستی

”ہاں ہاں، ہم لوگ کریکٹر ہیں۔ وہ نہیں جو باپ اور بھائیوں کے ساتھ چادر اوڑھ کر کالج آتی ہیں اور پھر موٹی ملتے ہیں وہ پٹا ایک طرف کاٹھ سے پرکھ کے کسی کی بائیک کے پیچھے سوار ہو کر چل پڑتی ہیں۔ ہم ماڈرن اور آزاد خیال ہیں۔ وہ معصوم بیہیاں جو گھروں سے سادہ چہرے لے کر یونین میں یا بس میں بیٹھتی ہیں اور کالج پہنچتے تک نکل سبک آپ میں ہوتی ہیں۔ ہم کھلم کھلا کبھی کالج ٹائم کے بعد ”سائنٹ این پیپر“ میں برگر کھانے یا کبھی فری جیرید میں ”کلیف“ سوپ پینے چلے جائیں تو آوارہ اور وہ جو پرنسپل کو تیار دیا بیچا، ماموں کی وفات کا بہانا بنا کر کل چھڑے اڑائیں وہ معصومیت کی تصویریں شریف آبادیاں۔“

”معنی پاؤ یا ر“ فیر یا اپنے شخص بے پرواہ انداز میں کہتی۔ وہ ایسی ہی تھی بے پرواہ سی۔ کسی کو خاطر میں نہ لانے والی۔ حالانکہ اصولی طور پر ایسا ہونا تو نہیں چاہیے تھا کہ اس کا تعلق جس طبقے سے تھا وہاں زندگی گزارنے کا ایک ہی اصول تھا۔ ”لوگ کیا کہیں گے، لوگ کیا سوچیں گے؟“

اس کے برعکس رو مائیل ابرکلاس سے تعلق رکھنے کے باوجود سبھی سبھی سی رہتی۔ اکثر ہمارے ساتھ بسوں پہ دھکے کھاتے ہوئے یا سہرے کنارے کھڑے ہو کر فادہ کھاتے ہوئے اسے یہی دھڑکا لگا رہتا، فلاں انگل نہ کچھ لیں۔ ڈھکاں آگئی کی نظر نہ پڑ جائے۔ بقول اس کے وہ ایک اصول پرست فمیلی سے تعلق رکھتی ہے۔ عجیب سے اصول تھے کچھ اس کی فمیلی کے۔ اگر وہ اسے ہی نہ یا آواری میں کسی امیر زادی یا امیر زادے کے ساتھ بچ کر تے دیکھ لیں تو شاید رگڑ رگڑیں گرا پی فرینڈز کے ساتھ بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بھٹکنا مان کے نزدیکی خاندان کو بل کھانے کے مترادف ہے۔ پاداری رنگت، بڑی بڑی آنکھوں اور بوٹے سے قد والی رو مائیلہ سبب اپنے گھر، ماحول، اپنی فمیلی اور خود پر لگے امتیاز گرل کے نتیجے سے نجات پاتی تھی۔

☆=====☆=====☆

میں یعنی الشاع غار بہت قابل والدین کی ملکی اولاد ہوں۔ میرے والد ڈاکٹر غار علی ملک کے مشہور نورو سرجن ہیں اور مہا سز نیلوفر غار شہر کے سب سے بڑے کانونت سکول کی پرنسپل۔ میرا بچپن شروع ہی سے تنہائی کا شکار رہا۔ پہلے گھر میں اور پھر ہائل میں۔ حالانکہ میرے دو بڑے بھائی اور دو بہنیں بھی ہیں لیکن عموں کے اچھے خاصے فرقے نے کبھی ہمیں ایک دوسرے کے قریب نہیں آنے دیا۔ وہ چاروں پوزیشنز اور ریکارڈز کے چکر میں لکھنے رہتے اور یوں میں نے اپنی زندگی کے ابتدائی تیرہ سال اپنے پیڑم کے بندہ روزانے کے پیچھے گزار

وہ بھی فیروزیا کی طرح اپنے ماحول سے فرار جاتی تھی مگر جب ایسا کر نہیں پائی تھی تو فریڈینڈ ہو کر ایسی ہی عجیب حرکتیں کرتی جو اس کے نزدیک ”جی خوش کرنے والی کل“ ہے۔ جب دونوں ملیں تو خوب گل کھلتے گئے۔ وہ ہفتے میں ایک دو بار ہمارے کالج ضرور آتی اور پھر نہ جانے کس طرح دونوں چوکیدار کو چمکدے کر آڑن چھو جاتیں۔ جلدی کالج کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ان کی آواز گویوں اور محاشوں کے قے مٹھو رہتی ہوتی گئے۔ ان دونوں کی وجہ سے ہم تیسرمی بھی فطرت اور آوارہ بھلائے لگتیں۔ حالانکہ جہاں تک بات ہنسی، مذاق، دل لگی اور سیر سانسوں کی حد تک تھی ہم انچوں افسوس راتیں مگر میں نے رونا میل اور سیریکا نے بھی ان کی ڈینگ وغیرہ میں شیئر نہیں کیا۔ ایسے چکروں میں وہ دونوں ہر جگہ افسوس ہی جاتیں اور افسوس ہی مختلف ماڈل کی کاروں سے اترتیں۔

☆=====☆

اور ہمارے گروپ کی ناچنے میں ممبر سیریکا لارنس جس نے سیالکوت سے ایف اے کرنے کے بعد ہمارے کالج میں ایم ایشن کیا تھا۔ وہ میری روم میٹ تھی۔ پہلے پہل اس اور کھوٹی کھوٹی آنکھوں، گہری سانولی رنگت اور لمبے بالوں والی اس کچھن لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں اس سے دوستی کا کوئی خیال پیدا نہ ہوا۔ میں اول تو کمرے میں آتی ہی صرف رات گزارنے کے لیے تھی اس لیے ہلکی پھلکی علیک سلیک کی نوٹ بھی نہ آسکی۔ میں سونے کے لیے سلیپنگ پلاز کا سہارا لیتی ہوں اور اس رات جب میرا ویٹیم فائیکو کا نوٹم ہو گیا تھا اور میں کروت پر کروت بدل رہی تھی کہ مجھے کمرے میں دلی دلی سکیاں، آہیں سنائی دیں۔ ظاہر ہے سیریکا کے سوا کمرے میں اور کون تھا۔ میں وہ سادھے سنتی رہی۔ یوں بیٹھے۔ اوتے ہوئے لوگ بہت اثریکٹ کرتے ہیں کیونکہ میں خود باوجود کوشش کے کبھی روم نہیں لگتی لیکن اس رات نہ جانے کیسے میرے چہرے پر گرم گرم آنسو پھیلے گئے۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھے میں منہ جھپٹائے رو رہی تھی اور میں اپنے بیڈ پر کروت بدلے آنسو بہا رہی تھی اور پھر رات نہیں کیا ہوا کہ میں نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور اچانک ہی دوسرے بیڈ پر سے آنے والی سسکیاں اٹھتی گئیں۔ کچھ دیر کے بعد مجھے اپنے روتے شانے پر کسی کے گداز ہاتھ کے لمس کا احساس ہوا۔ میں نے تڑپ کے پیچھے دیکھا تو وہ بیجا ہوا چہرہ لیے حیرت سے مجھے دیکھ رہی تھی اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر روئے لگیں۔ اس کے بعد دو سالوں میں میری زندگی میں تھی ہی ایسی راتیں آئیں جب میں اس کے کاندھے پر سر رکھ کے اٹک بھاتی اور وہ میری گود میں سر رکھ کر دل کا غبار ہلاتی کرتی۔

وہ منٹ کے اندر اندر ہمارے درمیان موجود تھی۔ وہ جو دور سے دیکھنے پر بڑی مغرور، بگبگرس سی لگ رہی تھی اندر سے کتنی سادہ اور ملنگ ناٹپ ہے اس کا اندازہ مجھے پہلی ملاقات میں ہی ہو گیا۔ اس کے چہرے کے پیش نظر تو حیران خیال تھا کہ وہ منہ میز حاکم کے انگشٹ نما اردو بولتی ہوگی لیکن وہ تو فیروزیا سے بھی زیادہ کھلے دلمے مزاج کی لکھی ”ڈرنے منہ“ بکواس نہ کر، چل کینی اور کتنی نہ ہو تو جیسے چند مزید ناقابل بیان الفاظ اس کی زبان پر ہر دم بچے رہتے۔ وہ ایک پروفیشنل ماڈل گرل ہے۔ یہ بات اس نے ہمیں ایک انٹلکٹ میگزین میں اپنی تیار کن رٹیکلن وغینہ تصاویر دکھاتے ہوئے کہا۔ بعد میں اس نے وی پی بھی چند کٹر شلز کیے لیکن فیشن شوز اور اسٹائل فوٹو گرافی میں اس کی ڈیمانڈ نہ تھی۔ اس کی دونوں بڑی ہتھیں مہک اور سن بھی نی وی پر کام کرتی تھیں۔

وہ بڑی روانی سے اپنی بہنوں کو گالیاں دیا کرتی تھی کہ انہوں نے گند پھیلائی ہے گھر میں اور اب ماں کو بیٹیوں کی کمائی کا چکا بڑ کیا ہے۔ اس کا بس چلے تو ہمیں فلوں میں ناچنے کے لیے بھیجے دے۔ اس کے والد ایک سرکاری افسر تھے۔ رشوت کی کمائی پر بیوی اور بیٹیوں کو عیش کروانے کے بعد جب چل بسے تو اس کی ماں پشیمانی کی رقم اور مکان کے کرائے کی آمدن میں زیادہ ریزہ ریزہ کرنا نہ کر سکی۔ چنانچہ کوئی تھا نہیں بڑی جی کو کالج سے ہٹا کر گھر سے باہر نکلنے پر اکسایا۔ اسے ایئر ہوٹس بننے کا کر بڑ تھا۔ اس کے لیے پلائی کیا اور پھر کسی دوست کے کہنے پر نیپل ویزن پر اناؤنسمنٹ کے لیے بھی قسمت آزمائی کی۔ اناؤنسرو تو نہ بن سکی، ڈراموں میں چانس مل گیا۔ ابھی ایک ہی سیریل کی تھی کہ کپی آئی اسے کی طرف سے کال آگئی اور وہ اتر ہوٹس بن گئی۔ آزاد خیال ماں دوسری بیٹی کو جو سٹریک کر کے فارغ تھی لے کر نی وی اسٹیشن آگئی اور اس نے بڑی بہن سے زیادہ شہرت کمائی۔ اس وقت وہ نی وی کی مصروف ترین اداکارہ ہے۔ شوق کالج میں پہنچی تو ماں نے فیس اور پاکستانی سے ہاتھ بھیج لیا کہ خود کماؤ اور خود خرچ کرو۔ اب صاف ظاہر ہے کہ وہیں جماعت پاس سترہ سالہ لڑکی کی ملازمت کر سکتی تھی۔ اس کی پردر شاہی حالات میں تو ہوئی نہیں تھی کہ وہ میٹرو پر حانا شروع کر دیتی یا کسی فیکٹری میں پیکنگ کا کام کر لیتی۔ وہی ہوا جو اس کی ماں چاہتی تھی۔ منہ نے اپنے تعلقات کی وجہ سے اسے ماڈلنگ کی دنیا میں انٹرویو سن کر دیا۔ ماڈلنگ سے اسے کوئی خاص انٹرسٹ نہیں تھا اور نہ ہی ناٹپ ماڈل بننے کا جنون۔ وہ بس اتنا ہی کام کرتی جس سے اسے بہنوں کے آگے ہاتھ نہ پھیلا نا پڑے۔ اسے آگے بڑھنے کا شوق تھا مگر قبول اس کے اس ”پٹہ“ میں تعلیم کا کیا کام۔

خاص دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کی زبان سے نکلے ایک خاص لے میں پڑا اشعار مجھے مہمور کر ڈالتے اور جب وہ بھیجی چکوں کو بھٹکا کر یہ کہتی:

زندگی سے بڑی سزا ہی نہیں
اور جرم سے کیا پتا ہی نہیں
تو میری آنکھوں میں بھی شہنشاہ جاتی۔

اور یوں اسی طرح ہم پانچوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اپنے اپنے ستارے ڈھونڈتی رہیں کہ اچانک ہماری زندگی میں ایک اور مشترکہ حادثہ پیش آ گیا۔ ہم پانچوں کو ایک ہی وقت میں محبت ہو گئی۔

☆=====☆

”ایلیشاغ بی بی! آپ کا فون ہے۔“ میں دھلے ہوئے کپڑے تہہ کر رہی تھی جب ماسی نے آکر بتایا۔ میں نے کرسی سے ہٹا ہاتھ کر گنگے میں ڈالا اور یہ سوچتے ہوئے چل پڑی کہ کس کو میری یاد آ سکتی ہے۔

”سیلو۔“

”سیلو ایلیشاغ!“ ماما کی آواز سن کر میں کل سی گئی۔ وہ کبھی بکھار ہی مجھے فون کرتی تھیں۔

”السلام علیکم! کبھی ہیں آپ؟“ میں نے چپک کر پوچھا۔

”کہاں ہوئی ہو تم سارا دون۔ کل بھی دو بار فون کیا، آج بھی یہ تیسرا فون ہے میں تو سوچ رہی تھی کہ اب بھی تم نہیں ملے تو ذرا یورو کو بیجوں کی تمہاری خبر کر کے لیے۔ یہ کوئی طریقہ ہے سارا سارا دون ہاسٹل سے غائب رہتی ہو۔ اپنے ارادے صاف بتا دو مجھے۔ پڑھنا ہے یا بالو کہیں گھر۔“ ماما کا ایسا لہجہ صرف میرے ساتھ ہی ہوتا تھا۔

”وہ دراصل ماما! ہم لوگ حمزہ کو نوٹیکم پارٹی دے رہے ہیں ناں تو نمبر نے فیضی ڈریس شو میں میرا نام بھی لکھ لیا۔ بس روبرسلو وغیرہ ہو رہی ہیں تو انہی میں کچھ لیت ہو جاتی ہوں۔“ فیضی کے ساتھ وہ کہ میرا ڈیوٹی بھی سمجھتے ہوئے میں نے خاصا زوریز ہو گیا تھا اور اب متوقع کی مناسبت سے بھی کئی برکل جھوٹ بولتے ہوئے مجھے کوئی دقت نہیں ہوتی تھی حالانکہ حقیقت تو یہی تھی کہ ہم سب فریڈز شغل خف کے ساتھ ہی ڈی ایمنش مٹی تھیں۔ اسے ایک مشہور پڑوسی نے اپنی سیریل کے لیے بک کیا تھا۔ اس کی پہلی ریکارڈنگ تھی اس لیے اس نے ہمیں بھی ساتھ چلنے کی دعوت دی اور ہر رات ہو گئی۔ آج ہاسٹل میں لیت آنے کی وجہ یہ تھی

اس کا باپ اس کی پیدائش سے پہلے سے لاپتا تھا۔ ماں ابھی چندہ سال کی تھی جب اس کے ساتھ گھر سے بھاگی اور ابھی سولہ برس کی ہو نہ تھی کہ وہ اسے چھوڑ بھاگا۔ پھر ماں زمانے کی تھوکر میں کھاتے کھاتے نرس بن گئی۔ سیریکا نے ابھی نہیں سنبھالا تھا کہ ماں نے اسلام قبول کر کے ایک مسلمان وارڈ بوائے سے شادی کر لی۔ صرف اڑھائی سال اس کے ساتھ گزارا ہو سکا اور پھر طلاق لی۔ ابھی طلاق لیے چند ماہ ہی گزرے تھے کہ ایک مریض اس کے پیچھے گھر آئے لگا۔ اگرچہ عمر اس کی کچھ زیادہ تھی لیکن اس وارڈ بوائے کی نسبت خاص ماں دارا ساسی تھی اور پھر آٹھ سالہ سیریکا ماں کے ساتھ جہیز میں لیاقت ظہور کے گھر آگئی جہاں اس کی پہلی بیوی اور تین بچے پہلے سے موجود تھے۔ یہاں اس نے اپنی زندگی کے بدترین چار سال گزارے۔ سوتیلی ماں، سوتیلی باپ اور سوتیلی بہن بھائی کو تو شاید وہ پھر بھی برداشت کر لیتی ماس کی ساس اور اپنی نام نہاد دادی کی مار پیٹ بھی سہہ لیتی۔ صبر کے ساتھ گھر والوں کے جھوٹے برتن بھی مانجھ لیتی اور گندے کپڑے بھی دھوئی مگر ماں کی بے راہ روی کے طعنے نہیں سن سکتی تھی۔ جسے گھر کی عزت خراب نہ آ یا اور جیسے تیسے چار سال گزارے اس نے اس قید خانے سے آزادی حاصل کی اور یوں سیریکا کے بارہ سال تک کا ہونے پر وہ تین بار گھر بسا کے اچھا چکی تھی۔ جب کسی عورت کے سر سے ایک بار سناہن سرک جائے تو اسے دھوپ سے ڈھنیں لگتا۔ نہ سر پہ ماں باپ کا سایہ، نہ جن کی عزت کا خیال کر کے پٹیاں گھروں میں ظلم کی ہر حد برداشت کر لیتی ہیں مگر سر پہ سے چادر نہیں ہٹے دیتیں اور نہ کوئی بھائی جس کی غیرت اسے چادر دیواری تک محدود رکھتی۔ ہاں اولاد تھی، ایک اگلی بیوی جو بچپن کی سرحدیں پار کر کے تیزی سے جوانی کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ اولاد جس کی خاطر بڑے بڑے تابع ہو جاتے ہیں وہ اولاد بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدموں میں بیڑیاں نہ ڈال سکی بلکہ جب بیوی نے ماں کی غلط روش پر جھنجھٹا نا شروع کیا اور گھر میں نئے نئے لوگوں کی آمد و رفت پہ اعتراض کیے تو اسے دوسرے شہر ہاسٹل بھجوا دیا گیا۔

سیریکا کو فیروز آباد شوق کی طرح آنسوؤں کو کسکر ایٹوں کا لیا۔ ڈھنیں پہناتا آتا تھا اور نہ ہی وہ صبر سے اور نہ بالکل کی طرح ڈھیروں شاپنگ کر کے، پارلیمنٹ کے زندگی کی تحفوں سے چشم پوشی کر سکتی تھی۔ وہ تو بس اپنی اداس اداس آنکھوں میں ڈھیروں حسرتیں سمیٹے اپنے سانولے ہاتھوں کی کیڑوں میں ابھی رہتی۔ اس کے چہرے سے ہر لمحے ایک کرب کا عالم رہتا اور ہاں..... اس کی آواز..... اس کی آواز میں اتنا سوز تھا کہ میں کھٹوں بھی اس سے اس کے پسندیدہ اشعار سنتی رہتی۔ اس کا ذوق بہت عمدہ تھا۔ مجھے اس سے پہلے شعر و شاعری سے کوئی

اگر چہ می کہفون نے کچھ آپ سینت کر دیا تھا پھر بھی میں نے روم میں آکر بیک میں کپڑے سینت کرنے شروع کر دیے۔

گھر پہنچی تو ایک روتی لگی ہوئی تھی۔ ممانے پورے گھر کی ریڈیو بکرویشن کر رہی تھی۔ احمد بھائی جان، سمجھ بھائی اور بچوں کے ساتھ بیٹار سے بھائی کو دیکھ کینے کے لیے آچکے تھے۔ مریم بائی اور فاطمہ باجی بھی ایک بختہ پہلے آچکی تھیں۔ بس ایک میں ہی تھی جس کا خیال تھا کہ ایک دن پہلے آیا وہ بھی نہ جانے کس کے یاد دلانے پر۔

اس دن میں سارا وقت کمرے میں بند نعل والیم پہ بار بار اسرائیلی سینڈ کا Love is dream سنتی رہی۔ دوسرے دن ابھی سب سو رہے تھے کہ میں کالج چلی آئی۔ آج رومانیڈ چھٹی پر تھی، سیریکا کو فلو تھا وہ بھی کلاس میں نظر نہیں آئی میں نے فیروز کا بازو پکڑا کینٹین سے فردوسٹ کے چھ بیٹک اور دو برگر پکڑے اور کالج آڈیٹوریوم کی بیک سائیڈ پہ بنی بیڑھیوں پر آکے بیٹھ گئی۔

”آج کوئی کلاس نہیں لیں گے۔“

”تو کیا بیک ماریں گے؟“

”نہیں بک ماریں گے۔“ میں نے جل کر کہا۔ اس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

”اچھا سنو، فنانسک نیوز۔ سز کوئی فرینڈ اسٹڈیم میں فن فیئر ہو رہا ہے اور میوزیکل ٹائٹ بھی۔ سارے ایٹھ ایٹھ بیٹڑا آئیں گے شوق سے کہیں سے بلوے آئے۔“

”ایسے پروگرامز تو رات گئے تک چلتے ہیں۔ تمہارے کھروالے پریشن دے دیں گے؟“

”ارے نہیں اصل چکر کون بتائے گا بلو۔ تمہاری سنگھی یارو سلیک کی شخصیت کو یادوں کی۔“

اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ہاں میں تمہارا کوئی بلیک کلر کا انسٹلش ساسوٹ پہنوں گی۔ فہد اور میز کہتے ہیں مجھ پہ بلیک کلر سوت کرتا ہے، آفت لگتی ہوں۔“

فہد تو شوق کے ایک ایسے بوائے فرینڈ کاشف کا دوست تھا۔ وہ دونوں اکثر اکٹھے ہی آتے اور کالج سے ان دونوں کو اپنی اسپورٹس مائل سلیک میں پک کرتے لیکن یہ ریمز نیا نام تھا میرے لیے۔ پھر وہ خود ہی بتانے لگی۔ ”پتا ہے یہ جو ریمز ہے ناں، ساڑھ ماڑھ وغیرہ کا بھائی ہے۔ وہ جو آئے سیکشن کی کلاس میں ہاں کھول کے آئی تو میری نہیں۔“

”اچھا اچھا۔“ مجھے یاد آگیا۔ ایک ہفتی سارا کلاس ان دونوں بیٹوں کو لینے آتا تھا اور ہمارے مذاق کا نشانہ بننا رہتا تھا۔ ”ٹوئے اس اوو بلاؤ کو کیسے چاہیں اس چلٹر۔ بڑا سکین سا بندہ تھا وہ تو۔“

کہ رومانیڈ کو اس کے ذہنی نے نئی کارے کر دی تھی۔ ہم نے لاگ ڈرائیو کا پروگرام بنایا۔ سیریکا جتنی روہنگی کہ اس نے نیوٹن پڑھانے کے لیے جانا ہے لیکن میں نے اسے بھی گھبت لیا اور شام بچے مجھ میں ہائل پہنچی ہی تھی کہ کمر کا فون آگیا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے ان فٹولیات کی۔ پڑھائی خاک نہیں ہوتی اور ناچنے کا نے میں بوا دل گلتا ہے۔“ مجھ سے بات کرتے ہوئے ماما کی ساری تہذیب اور شانگلی نہ جانے کہاں چلی جاتی تھی۔ شاید ان کے خیال میں میری یہی اوقات تھی کہ..... میرا گلارندہ گیا۔

”پڑھتی تو ہوں ماما۔“

”اگر پڑھنے میں دل نہیں لگتا تو پھر میں تمہیں ہائل سے گھر واپس بلاؤں گی لہذا پڑھائی پر توجہ دو۔“

”جی اچھا۔“ ماما جاتی تھیں کہ میرے لیے اس سے خطرناک جھکی کوئی نہیں ہو سکتی۔

”ہاں میں تو بتانا ہی بھول گئی۔ وہ عمر آ رہا ہے برسوں۔ اگر تم گھر آنا چاہو تو میں ڈرائیور کو بھیج دیتی ہوں۔“

”رینگی! ہاؤ سر براؤنگ۔“ میرے لیے تو یہ خوشخبری بالکل اچانک تھی کہ میرا بھائی عمر ٹائرسات آٹھ سال کے بعد وطن واپس آ رہا ہے۔ ”ایسا ہے ماما کہ آج تو نہیں ہاں کل میں کالج سے ڈائریکٹ گھر آ جاؤں گی۔ آپ ڈرائیور کو رہنے دیں۔ رومانیڈ مجھے ڈراپ کر دے گی۔“

”ایزیووش..... اوکے۔“ ممانے میرا جواب سنتے ہی فون بند کر دیا اور میں جو پا پا اور احمہ بھائی جان کی خبریت دریافت کرنے والی تھی ریسپونڈ کر رہ گئی۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں شوق کی طرح اپنے گھر والوں سے نفرت نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی فیروز کی طرح ان کے کس لٹی ہو کرنے پر بے بسی کی چادر اڑھ سکتی تھی۔ مجھے ان سب سے محبت ہے، ضرورت ہے ان کی۔ محبت تو بدلے میں صرف محبت مانگتی ہے اور جب محبت کرنے والے اپنی تمام چاہتیں لٹا کر بھی تجی داماں رہیں تو ان کی حالت دیکھی ہی ہو جاتی ہے جیسی میری۔

”تمہیں نہیں جانی، آپ کو آواز سے لگ رہا ہوگا۔ ساری دوپہر سوئی رہی ہوں ناں اب ابھی ہوں تو آواز بھاری سی ہو رہی ہے۔ جی بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی بخار وغیرہ نہیں ہے۔ ہاں ابھی گلہا ٹھیک ہے۔“ سائبر فون پر اپنی مانی تو تسلیم دے رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ میں بھی اپنی ماما کو فون کر کے جھوٹ موٹ کہوں کہ مجھے دو دن سے بخار ہے، مگر گئی تھی یا چوت گٹ گئی ہے۔

ہوا لوا وارہ ہے والو..... می لو سوچو۔

کر کے مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کی۔

”ہاں بھی سیر نہ تہارے ایف ایس سی کے رزلٹ کا کیا بنا؟“

”آئی کمال ہے آپ کو نہیں پتا مجھے تو ڈیڑھ ماہ ہو گئے کہ امی ایڈمیشن لیے۔“

”زیل! پھر تو خوب مار کس لیے ہوں گے۔ کمال بھائی کی طرف ہماری ٹریٹ پکی۔“

”مسز ریم بڑی لگی ہیں آپ۔ آپ کی بیٹی نے ایم ایس سی میں ٹاپ کیا۔“

”میں تو آئی صرف عمر بھائی کے لیے آئی ہوں ورنہ ایگزامززدیک ہوں تو میں کھانا

کھانے کے لیے ڈائننگ روم تک نہیں نکلتی۔“

ایسا موضوع شروع ہو گیا جو میری چڑ اور ماما کی دکھتی رگ تھا۔ ہر کسی کی ایجنڈیشنل

رپورٹ لینے کے بعد وہ عجیب جتانے والی نظروں سے مجھے دیکھتیں۔ میں بوجھل قدموں سے

چلتی ہوئی کچھ ددر آگے جا کر بک اسٹال پہ کھڑی ہو گئی اور city-bug کے صفحات اٹھتے

پلٹنے لگی۔

”ڈارا ان محترمہ کو ملاحظہ فرمائیے ایسی فی تیل باٹم کے ساتھ بد مزہ کی دگ سر پہ تھا کہ

اپنی طرف سے گولڈمی ہائی بن کھڑی ہیں اور وہ ڈرا دیھو اس لیے بالوں والی کو، کتنی ڈھیر ساری

قیمیں پہنے ہوئے ہے۔ کیا وہاں ہفت فٹن ہے یہ بھی کہ پتلی قمیص پہ پتلی اور اس کے اوپر پھر

کالی قمیص۔ سفید فلپر پہ سرخ فلپر اور اس کے اوپر پھر ایک اور بلیز فلپر۔ اومانی گاڈ را یہ 95

کی شریلا بیگور کو تو دیکھنا ایک نظر۔ کالہ ان نماہو ڈاسر پہ نکاتے ہوئے ہے اور اب یہ میں کیا

دیکھ رہا ہوں ایک کان میں اتنے ایئر رگگز، کان نہ ہوا بھول بیگور ہو گیا۔“ کسی کی شون آواز

میں یہ بے لاگ تبصرہ کہیں قریب سے ہی نشر ہو رہا تھا۔

”جسٹ لیو ایٹ یار۔ ہمیں کیا کوئی کان کو بیگز بنائے یا ناک کو۔ ٹریبل لیئر والی شرٹ

پہنے یا ڈرن لیئر والی۔ بد مزہ کی دگ لگائے یا رنگیلی کی۔“

”پھر بھی جمپ یہ اوڑھو پٹے بیگنٹ ہال تو نہیں۔ ہر ڈریس ہر جگہ تو مناسب نہیں

ہے۔ اب وہ دیھو جو سامنے بک اسٹال پہ کھڑی ہے کتنی پھل اور فریش سی ہے۔ وائنٹ کلر

گرمیوں میں کتنا کو لگتا ہے اسی لیے ان ڈھیر د لاڑکیوں میں یہ واحد ہے جو آنکھوں کو چھ

نہیں رہی اور حواسوں میں کھپ نہیں رہی۔ ویسے یہ عمر کی لہری کی تو نہیں لگتی۔“ بلاشبہ یہ بونٹس

میرے لیے ہی تھے۔ میں نے پلٹ کر ایک نظر پھر کھڑے اس کنٹینر کو دیکھا چاہا۔ قایم اوور

جنجھ اور اوکے گائے کی شرٹ میں سینے پہ دونوں ہاتھ باندھے بڑی دھجکی سے مجھے دیکھتا ہوا

ایک چمک لڑکا۔ ”یہ تپائی ہوگا کہیں دیکھا ہوگا رک رہا ہے۔“ میں نے ذہن پر زور دیا اور غمکی

باندھ کے اسے دیکھنے لگی۔ میری ایک انتہائی فضول عادت جس سے میں خود بھی بہت تنگ

ہوں کہ اگر کوئی مانوس سا چہرہ انخر آ جائے تو جب تک یہ سرخ نہ لگائوں کہ آخر وہ ہے کون؟

مجھے چین نہیں پڑتا اور میں اس چہرے کو یوں جھکتی ہوں جیسے اس کے چہرے کے نقوش پہ

ہماری پہلی ملاقات کی تاریخ مع تفصیل لکھی ہی تو ہوگی۔

میرے یوں اس کی جانب مسلسل دیکھنے پر اس کے دوست نے معنی خیز شوکا دیا اور اس

کی مسکراہٹ آخر مزید گہری ہو گئی۔ یہ مسکراہٹ تو بہت ہے، کون ہے آخر؟ میں جھپٹا گئی اور

آنکھیں سکوڑ کر مزید غور سے اس کا جائزہ لینے لگی۔ اچانک ہی اس نے پٹ سے مجھے آنکھ مار

دی۔ ”لوفر“ میں نے ذرا بلند آواز میں اسے نوازا اور پھر سختی ہوئی وہاں سے چل پڑی۔ اس

لٹکتے اور اس کے دوستوں کے مشترکہ قہقیرے نے میرا قیام قیام کیا۔

پاپائے عمر بھائی کے آنے کی خوشی میں ایک زبردست پارٹی ارچنگ کی۔ مریم باجی کی

شادی کے بعد کوئی ڈھائی سال کے بعد ہمارے گھر میں کوئی فٹنشن ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی

تمام فرینڈز کو انوائٹ کیا لیکن سوائے رومائیل کے کسی نے بھی آنے کی ہائی نہ بھری۔ شفق کی

اس رات کوئی آؤٹ ڈور ریکارڈنگ تھی۔ سہیل کا اپنی نیوشو کی وجہ سے معذرت کر لی اور

نیریا کے ایڑی چوٹی کا زور لگانے کے باوجود بھی اس گھر سے اجازت نہ لی۔

میں نے پریذ لٹنگ کے ساتھ کھل کر کلکی لینا لگانا شرٹ اور دو پٹا اوڑھا، بیروں میں

سنہری تیلے والا آئینہ کلر کھسہ۔ میں چاہے سکتے ہی انتہام سے تیار کیوں نہ ہو جاؤں میک

آپ اور خصوصاً ہینر اسٹائل بنانے سے مجھے سخت کوفت ہوتی ہے۔ اس لیے میں نے بالوں کی

اوپر کی پونی بنائی، پکلوں پہ مسکارے کا سٹیکل کوٹ، ہونٹوں پہ پلپ اسٹک کا لائٹ سا بچ اور

Reddoor کا ایک اسہرے کر کے اپنی اپنی تھل کر لی۔ ایک اچھا خاصا عرصہ ہائلز میں

گزارنے کی وجہ سے میری اپنی کزنز اور دیگر رشتہ داروں سے ذرا بھی ایچ منٹ نہیں تھی۔ اس

لیے میں اجنبی اجنبی سی ادھر سے ادھر چکر لگا کر رومائیل کا انتظار کرنے لگی۔ وہ پہنچی تو میری

جان میں جان آئی۔

ڈرپے میں فروٹ نہ اٹھل نکال رہی تھی میری جیبر ہی لگا اس پہ پڑی۔ وہ ڈرافٹا صلی پہ کھڑا

کوک لپی رہا تھا۔ اسزامنہ میں دبائے ہوئے اس نے بھوین اچکا کر شاید یہ کہنے کی کوشش کی

کہ تم یہاں کہاں؟ ”واہیات“ میں نے ناک چڑھائی۔

”کون ہے یہ؟“ رومائیل نے پوچھا۔

”ہے ایک چلتی ہوئی چیز لیکن فیری اور شفق کے کام کی۔“

”کزن ہے تمہارا؟“

”شاید۔“ میں نے اپنی فحوت سویٹ ڈش کا چھچھرے کے منہ میں ڈالا۔

”الیشاع، تم سارے میں۔“ عمر بھائی پیچھے کھڑے اسی لوفر سے میرا تعارف کرا رہے تھے۔ ان کا بچپن کا دوست سارم جو صرف اپنے مفرد نام کی وجہ سے مجھے یاد رہ گیا۔ اس کا بچپن تو تقریباً ہمارے یہاں ہی گزرا پھر بھائی کے امریکہ جانے کے بعد اس کا آنا جانا ذرا کم ہوا تو میں نے بھی ہائل کوسمن بنالیا اور اب کتنے طویل عمر سے بعد اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ دلا پتلا چھوٹے سے قد کا چلبلا سالاکا کہیں سے بھی فرسٹ ایئر کا اسٹوڈنٹ نہیں لگتا تھا۔ اس وقت میرے سامنے اپنے پورے چھٹے قدم کے ساتھ خان کر کے سوٹ میں کھڑا تھا۔

”کمال ہے، شی، تم اتنی سلم کیسے ہو گئی۔ اتنی تو موٹی تھی تم۔“ اس نے گال پھلے کما، لیکن اب مجھے اس کی بے تکلفی بھی نہیں لگی کہ وہ تو شروع ہی سے ایسا تھا۔ تیرہ سال کا تھا جب اس نے فاطمہ حاجی کو پروپوز کیا تھا۔ وہ ان دنوں ایم بی بی ایس کے سائنڈ ایئر میں تھیں۔ کس قدر مذاق بنا کرتا تھا ان دنوں کا اور میٹرک کے بعد سکول چھوڑتے ہوئے وہ کتنا دیا تھا بقول اس کے اسے اپنی حساب کی نیچر سے عشق ہو گیا تھا۔ ”لگتا ہے وہی پرانی عاشق مزاجی اب پوری طرح سر چڑھ چکی ہے برخوردار کی“ میں نے سوچا۔

ڈنز کے بعد محفل غزل تھی لیکن رومانیہ جلدی چلی گئی اور میں پھر سے تنہا تنہا فرشی نشست والی محفل کے پچھلے گوشے میں جا کر بیٹھ گئی۔ مجھے غزلوں اور نضر یوں وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

”سرنے والوں پہ سیف حیرت کیسی۔“ نصرت فتح علی خان سامنے بیٹھے ایک ہی مصرعے کی تکرار کیے جا رہے تھے اور لوگ تھے کہ ہر بار وہاں کا شور مچا دیتے۔ لو بھلا کیا ہے اس میں؟

”کیا مصروفیات ہیں تمہاری؟“ وہ کشن گھمٹ کر میرے نزدیک ہی دراز ہو گیا اور بغیر کسی تمہید کے سوال داغ دیا۔

”بی اے کر رہی ہوں۔“ میں نے اس کے وجود سے ہنسنے کی Jacomma کی مہک لباس سانس لے کر اپنے اندر اتاری۔ آخر شیوا اور میل پر دھوم میری کمزوری ہیں۔

”اچھا کر رہی ہو۔ سبکدستی کیا ہیں؟“ اس نے قبوے کی پیالی میرے ہاتھ میں تھما لی اور میں نے اپنے گھٹیا آنکلیس بقول می کے دہرا دیے۔

”گڈ! خوبصورت لڑکیوں کو ایسے ہی چڑھتا چاہیے۔“

”اور بینڈم لڑکیوں کو؟“ میں نے یونہی پوچھا۔

”انہیں میری طرح بی۔ کام کر کے اسٹوڈنٹ لائف کو بائے بائے کر دینا چاہیے۔“ رنیکل! تم۔۔۔ میرا مطلب ہے تم نے صرف بی۔ کام کیا ہے۔“ مجھے حیرت ہوئی کہ ابھی تک میں نے اس سے عمر بھائی کی دوستی پر اعتراض کیوں نہیں کیا۔

”ہاں ہاں، اس میں اتنا مذکورہ کرنے کی کیا بات ہے۔ ابھی تو پچھلے تین سال سے پرنیکل لائف میں ہوں۔ پاپا کا بزنس سنہال رہا ہوں۔“

”سنہال رہے ہو یا اجاڑ رہے ہو؟“ میں نے اسے گولڈ لائٹ سے ڈن ہل کا سگریٹ سلگاتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔ اس نے فرم دہندہ کی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھٹک کر بات کی۔ لی۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ کم اردو لٹریچر کی اسٹوڈنٹ ہو، شاعری وغیرہ سے خاصی دلچسپی ہوگی، انجوائے کر رہی ہو؟“ میں نے دھیان دیا تو نصرت فتح علی خان کا ریکارڈ ابھی تک اسی مصرعے پہ اٹکا ہوا تھا۔

”قہر یاد آ رہا، ہاں، میں تو پورے پورے ہوں۔ نیند بھی بہت آ رہی ہے۔“ میں نے بوجھل پلکیں تیزی سے جھپکتے ہوئے اسے دیکھا۔ ایک ٹائپ کے لیے سگریٹ اس کے ہونٹوں میں دبسا رہ گیا اور نگاہیں ساکت۔

پھر پلٹ کر نگاہ نہیں آئی

ان پہ قربان ہو گئی ہو گئی

غزل اپنے عروں پہ تھی اور اس کی نروس کر دینے والی خاموشی نظریں میرے ہاتھوں کی پشت پہ جمی تھیں۔ میں نے خواہ خواہ ہاتھوں کو بالوں میں مصروف کر لیا۔

ان کی زلفوں کو چھینتی تھی صبا

خود پریشان ہو گئی ہو گئی

وہ گنگٹانے لگا۔ میں نے گھورا تو بس پڑا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر یہ لوگ ایک ہی مصرعے کی اتنی تکرار کیوں کرتے ہیں۔ شعر کا مطلب سمجھ میں آئے۔ آئے البتہ غزل پوری یاد ہو جاتی ہے صرف ایک بار سن لینے سے۔ مجھے تو ویسے سنو گز زیادہ پسند ہیں یا پھر پنجابی فوک۔ عارف لہو مارا لکھوٹ سنگر ہے۔ فورٹریس میں 17 کو پاپ اینڈ فوک شو ہو رہا ہے۔ چلو گی میرے ساتھ۔“

”بی نہیں۔ مجھے ایسی غیر انسانی آوازوں سے سخت دھشت ہوتی ہے۔ پتا ہے مجھے تو ناریع کے ٹوڈیٹ بہت اچھے لگتے ہیں۔“ اور پھر ہم تھی وی دیہا تیں کرتے رہے یونہی ہلکی

رہی تھیں کہ میں نے ان کے ہزار کہنے کے باوجود انکا کس اور سوکس نہیں لیے۔ پایا مجھ سے مایوس ہو کر اسنڈی میں جا چکے تھے۔ فاطمہ باجی دلال کو گود میں لیے تھک رہی تھیں اور مریم باجی پاؤں صوفے پر پھیلائے کیوں کہ ریسورسور ہاتھ میں لیے مصروف تھیں اور رہے عمر بھائی تو وہ کہنے کی سی حالت میں علامت درج و ملال بنے بیٹھے تھے جیسے ان کا مستقبل مجھ سے ہی تو وابستہ ہے۔ ٹرن..... ٹرن..... منتظر سے غائب ہونے کا اس سے بہتر موقع اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں فون انیڈ کرنے سے چلی جاؤں۔

”بیو! سارم بول رہا ہوں۔“

”تو ڈراکل کے بولو۔“ اس کی آواز سن کر میری ساری ہڈی گھٹکی لوٹ آئی۔

”اب اس سے زیادہ کھل کے کیا بولوں کہ تم آتی اچھی گئی ہو کہ میں تمہیں پرہیز کرنا چاہتا ہوں۔“

اس نے اچانک حملہ کیا کہ میں اس کے لہجے سے یہ اندازہ بھی نہ لگا سکی کہ وہ مذاق کر رہا ہے یا سیریس ہے۔ ”لگتا ہے ہمارا گھر تمہیں زیادہ ہی پسند آ گیا ہے۔“ میں نے کچھ تبصیل کے اسے یاد دلانا چاہا۔

اسے ابھی شاید بارہ سال قبل کا واقعہ یاد آ گیا وہ ڈھیٹ ہوئے بغیر زور سے ہنس پڑا۔

”ایمزنگ، تمہیں اتنی پرانی بات یاد ہے؟“

”مجھے تو اور بھی بہت کچھ یاد ہے۔“ اس کی نین اتج کے زمانے کے سارے لفظ سے ایک ایک کر کے میری نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔

”آتم ل ریڈی ناؤ کہ میرا شاندار ماضی تمہارے سامنے کھلا پڑا ہے اس لیے تم کم ہی یقین کرو گی۔“ یون میں نے اظہارِ محبت کے لیے نہیں صرف تمہیں الٹ کرنے کے لیے کیا ہے ورنہ اصل کام تو شام کو می ڈی آ کر کریں گے۔“ اس نے دوسرا حملہ کیا اور اس سے پہلے کہ میں پہلے رات کو عمر بھائی نے بات چکی ہو جانے کی خوشی میں گلاب جا سن میرے منہ میں خوشی کر مجھے بالکل ہی بے ہوش کر ڈالا۔ مجھے بالکل خبر نہ ہو سکی کہ سارم کے می ڈی کی کب آئے اور انہوں نے کس طرح می کو راضی کیا کہ وہ تو انیس بیس عمر کو شادی کے لیے انتہائی نامناسب خیال کرتی تھیں ان کے خیال میں لڑکی کی شادی پچیس سال سے پہلے اور لڑکے کی تیس سال سے پہلے کرنا سراسر جہالت ہے۔ یہ تو مجھے بعد میں پتا چلا کہ میرے مستقبل سے قطعی مایوس ہو جانے کے بعد انہوں نے اچانک ہی یہ فیصلہ کر لیا۔ دوسرے حالات میں تو شاید میں ہمیشہ کی طرح عماما کے اس طرزِ عمل پر رنجیدہ ہوتی لیکن آج تو مجھے کچھ بہار بہار

پھلکی سی جن میں کہیں نیلے واداکے نیوآئیڈ یا زبردست نہیں آئے۔ جیس کے فیشن بیڈ انڈر کا آنکھوں دیکھا حال نہیں تھا اور نہ ہی کہیں تیسری دنیا کی dirty politics (کنڈی سیاست) کا رونما روایا گیا اور نہ ہی بوہتی ہوئی آبادی پر اتنی اظہار کیا گیا۔ پارٹنر، موسر، روسو کے بارے میں گفتگو کر کے بلکان بھی نہیں ہوئے۔

”شاید آج پوری پارٹی میں ہم وہی تھے جنہوں نے اس قدر غیر علمی اور سراسر فضول باتیں کیں۔ مگر اگر سن لیتیں تو.....“ رات سونے سے پہلے میں نے سوچا۔ میوزک سے فلموں تک سب سے دے چارے کے ساتھ سراسر انصافی ہو رہی ہے۔ شاہ رخ ٹاپ ایکٹر ہے۔ پوجا بھٹ کا جواب نہیں۔ ڈیجی مور سے زیادہ خطرناک حسن کسی میں نہیں۔ واؤ! پلیم از گریت، فوٹو ایکٹرز سے بات فیشن تک پہنچی اترتے کلرز بہت اچل کرتے ہیں۔ آف یہ بیل بائو، جینز سے بہتر کچھ نہیں۔ موسم، ساحل، خوشبو کوئی چیز ایسی تھی جس میں ہماری پسند نہیں ملتی تھی۔

راہ آسان ہو گئی ہو گئی
جان بچان ہو گئی ہو گئی

نصرت فتح علی خان کی آواز اندر جھبے کرے میں پھر سے گونجنے لگی۔ اور اپنے بندے پر لینے لینے میں نے سوچا کیا وہ ویسا ہی ہے جیسا نظر آتا ہے یا ویسا ہے جو وہ بننے کی کوشش کرتا ہے یا پھر ویسا ہے جیسا مجھے پہلی نظر میں لگا تھا۔

لوگ روم میں میرا کورٹ مارشل ہو رہا تھا۔ عمر بھائی کی غیر موجودگی میں ہونے والے میرے کارناموں کو غیر ضروری مبالغہ آرائی کے ساتھ پیش کیا جا رہا تھا۔ ”میٹرک میں بی گریڈ۔ ایف۔ اے میں بی گریڈ شاید بی۔ اے میں ڈی گریڈ لے لی۔“ ماما کا شکوہ تھا۔

”ہماری تواسات نسلوں میں ایسی کتنی ڈی بی نہیں گزری۔“ پاپا کا اندازِ فکر۔

”صرف بی نہیں، ہر کام میں ملتی ہے۔ ایف۔ اے کے بعد فری ڈنر میں کیوئس چیٹنگ اور انٹریز ڈیکوریشن کے کورسز کرانے کی کوشش کی۔ تین مہینے فیس دے کر بھی برش چکانا آیا۔“ مریم باجی نے اطلاع دی۔

”نہ ڈریس آپ ہونے کا سلیقہ نہ بات کرنے کی تیز، ایسے اچھا چلے کی لڑکیوں کو کون پسند کرتا ہے۔“ فاطمہ باجی کی پریشانیوں نرالی تھیں۔

عمر بھائی علامت جبری نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ ٹرن..... ٹرن..... فون کی تیل مسلسل ہو رہی تھی مگر یہاں فرصت کے نمی ریسورسور کرنے کی۔ ماما میری ہٹ دھرمی کا رونا رو

ساگ رہا تھا کہ یہ احساس ہی بڑا خوش کن ہوتا ہے کہ کسی نے مجھے میری ذات کے حوالے سے چاہا ہے۔ میری طلب محسوس کی ہے۔

”کو پھر، مان گی ناں ہمیں۔ کیسے تمہاری خواہش بنا کے پوری کر دی۔“ اگلے روز وہ فون پر اتر رہا تھا۔

”میری خواہش؟“ میں نے بن کر پوچھا۔

”کیوں؟ تم بھی تو چاہتی ہو؟“

”کسے؟“

”مجھے۔“ بڑے اعتماد کے ساتھ کہا گیا اور میں نے اپنا دل ٹولا تو محسوس ہوا کہ وہ لمحہ جس کے لیے کیو پڑنے اپنے تیر سنبھال کر رکھے تھے جب کا آکر گزر رہی گیا۔ اس بار میں پورے پانچ دن گھر گزار کے ہاسٹل پہنچی تو حسب توقع سب کچھ میں تھی سعد اللہ شاہ کی نظموں کے ساتھ ساتھ بہہ رہی تھی۔ ”بڑی گلابی گلابی ہو رہی ہو۔“ اس نے حیرت سے میرے دیکتے چہرے، چست آنکھوں اور گنگناٹے لبوں کو دیکھا۔ اس کے لیے کیا خود میرے لیے بھی یہ کیفیت بالکل نئی تھی۔

”جیجی تانوں گی بلکہ دکھاؤ گی۔ تم سناؤ ناں آج مجھے کوئی ناچھی سی چیز۔“ میں نے کشن اٹھا کر اس کی گود میں پھینکا اور مزے سے سر رکھ کر لیٹ گئی۔

پہلا پہلا ٹکنا اپنا اور اس شوخ کے ڈھنگ

امبر سے پھر چیم چیم اترے نیلے پیلے رنگ

لبو لہو میرے بجلی کوندی رقص چڑھا اٹک اٹک

جذبے ایسے جاگے اندر ہوا لہوہ نہج

اس جانب میرا دل تھا مجھ سے بن کر مست مٹک

اس جانب آواز کسی کی تیز ہوا کے رنگ

میں رانجے کی منگ ہوں لوگو میں رانجے کی منگ

کتنی ہی دیر اس کی آواز کے سحر میں کھوئی میں آنکھیں موندے لیتی رہی اور اس کی انگلیوں کا غنڈک ابھر اس میرے بالوں کو چھیڑتا رہا۔ ”سیدکا!“ میں نے ایک دم آنکھیں کھولیں۔

”ہوں۔“ وہ نہ جانے کہاں کھوئی ہوئی تھی۔

”تم نے بھی کسی سے محبت کی ہے؟“

☆=====☆=====☆

حسن اور حسین کو Better English کا چیلر پڑھاتے ہوئے اس کا ذہن بار بار منتشر ہو جاتا۔ چار ماہ پہلے ہی تو اسے یہ نیوش مل چکی تھی۔ پہلے پہل تو وہ بہت گھبرائی ایک بالکل انجان گھر میں دو اڑھائی گھنٹوں تک تین بچوں کو پڑھاتا لیکن ابجی شہر میں ہاسٹل میں رہتے ہوئے وہ اپنی ضروریات کہاں سے پوری کرتی۔ کہیں تو ہاتھ پیر مارنے ہی تھے۔ اور پھر دو اڑھائی گھنٹوں کے دو ہزار اس کے لیے خاصی کمزور رقم تھی۔ آہستہ آہستہ وہ فیروز پور روڈ پہ بنی اس پرانے طرز کی کوٹھی کے ماحول سے مطمئن ہو گئی۔ سید بھڑعلی شاہ ٹیلی فون کے ٹھکے کے ایک اعلیٰ افسر اپنی خالہ اور تین بچوں سیدہ بول، حسن علی اور حسین علی کے ساتھ رہتے تھے۔ با رعب اور باوقار سے نظر آنے والے بھڑعلی صاحب سے اس کا سامنا کم ہی ہوتا تھا۔ یوں تو وہ شاذ و نادر ہی دفتر سے آنے کے بعد شام کو گھر سے نکلا کرتے ماسوائے باجماعت نماز ادا کرنے کے لیے لیکن گھر میں ہوتے ہوئے بھی اس کی موجودگی میں وہ اپنے کمرے تک ہی محدود دور رہتے اور جو کہیں آنا سامنا تو نظر میں نیچے کیسے سر جھکا کے وہ اپنی تعمیر آواز میں ”السلام علیکم“ کہتے ہوئے ایک سائیڈ پہ ہو جاتے۔ وہ چند ہی دنوں میں ان کی شرافت کی قائل ہو گئی۔ پورے گھر کا ماحول ان کی شرافت اور خاندانی عبادت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ خالہ امی ہر وقت بیچ پھیرنے اور مختلف درود پڑھتے ہوئے کتنی پُر نوری لگا کرتی تھیں۔ تینوں بچے بھی خلاف توقع بڑے سنجیدہ حراج اور مودب سے تھے۔ سیدہ بول میٹرک کی طالبہ تھی اور انگلش، سائنس اور ہسٹری میں کمزور تھی۔ وہ اسے کبھی تینوں مضمون پڑھاتی تھی۔ جب کہ باقی دونوں بچے پانچویں جماعت میں تھے اور ڈی جی بھی تھے۔ ان پر اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔

”بھجرا! میرا essay چیک کر لیں۔ میں نے حسن سے پہلے Complete کیا ہے۔“

حسین کی آواز سے خیالات سے کھینچ لائی۔ ”اوہ، گلد! اور حسن تم بھی جلدی سے کام ختم کرو۔“

”I am all ready late“ وہ حسین کی کاپی چیک کرنے لگی مگر اس کے ذہن میں بار بار ایک ہی مسئلہ چٹکھاتا ہوا سامنے آ جاتا۔ آنکھوں کے سامنے الفاظ دھندلے پڑنے لگے۔ اس نے ہنسنے کا کاپی بند کی۔

”حسین بیٹا میں پوچھنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ آج طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے دونوں ہاتھوں سے کپٹیوں کو دباتے ہوئے کہا۔

شام کے چھ بج چکے تھے مگر بارش تھینے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ”ڈواری کا ڈنار کے تومیں اس شاپ تک چلی جاؤں۔“ وہ بار بار کھڑکی سے باہر کا جائزہ لیتی۔ دونوں بیچ پچھتر یا اس تانے پتی اور کینڈی کی کوان کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے۔ اس نے سوچا وہ بھی بعض خاصہ کوئی پچھری لے کر چل جائے۔ باہر آئی تو شلوار اوپر کے کٹھن میں جمع شدہ پانی واپیر سے نکال رہے تھے۔ اسے دیکھا تو جلدی سے پانچپے درست کیے۔

”نہ کرو تو ابھی پانی کروں میں چلا جائے گا وہ حلال ہے یہاں سے“ انہوں نے
 وضاحت کی تو اسے احساس ہوا کہ واقعی ان کا بہن عین عام طور پر دیگر سرکاری افسران سے
 کس قدر مختلف ہے۔ نہ تو گھر میں قیمتی فرنیچر اور دوسرے سازوسامان کی افراطی کمی اور نہ ہی
 بچوں کے اور خود ان کے سادہ حلیے سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ حرام کی کمائی پہ چل رہے ہیں۔
 وہ ان کی سادگی اور دیانتداری سے مرعوب ہی ہو گئی۔ ”لایئے میں کر دیتی ہوں۔“ وہ فوراً
 آگے بڑھی۔

لوخ وچرنگی داروں 280

نکل رات کے ملبے سے سفید ممل کے کڑے پاجامے میں تھی جو پچھلے بارہ گھنٹوں سے ہسپتال
 کروٹیں بدلتے سے جگہ جگہ سے مل گیا تھا۔ چنیا کو لیٹ کر جوڑا سا کرکھا تھا جس سے چند
 ٹیس چہرے پہ جھول رہی تھیں اور جوڑے سے عین وسط میں ایک لٹ بالکل سیدی اینٹینے کی
 طرح کھڑی تھی۔ اسے اپنی ہست کڈانی پہ خود بھی ہنسی آگئی۔ جلدی جلدی منہ پہ دو چھینٹے پانی
 کے مارے۔ بالوں کو سلیمکا کر سنوارنے کا وقت تھا نہیں، کھول کر دو بارہ جوڑا لیٹ لیا اور
 کلپ کو مضبوطی سے جمادیا۔ پیچ کر کرنے کے بجائے صرف دھلا ہوا گلف لگا دو پٹائیے پہ اکٹھا
 کیا اور تقریباً بھیٹا ہوئی کوری ڈور میں سے نکلی۔

”حسن بیٹا آپ کی ٹیچر آگئی ہیں ٹی وی بند کریں اب۔“ جعفر شاہ نے کال بیل کی آواز سن کر کہا اور لمبے۔ سامنے ہی وہ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ”آپ نے آج کیوں زحمت کی؟ موسم اتنا خراب ہے واپسی پر مشکل پیش آئے گی۔“

”یہ بادل برسنے کے نہیں ہیں۔ صبح کے یونہی منڈلا رہے ہیں۔ میں تو جان بھی اسی وجہ سے نہیں گئی کہ۔۔۔ لیکن بارش تو ہوئی نہیں فصول میں کلاسز سمر کریں۔ صبح میں سے سوچا تو تھا کہ بخوش بھی ڈراما کروں لیکن۔۔۔ بات کرتے کرتے اسے احساس ہوا کہ بھلا اس کی ان سے اتنی بے تکلفی کبھی جوہ اتنی لمبی تفصیل میں جا چکی۔ واہ ایک دم چپ سی ہو گئی۔“

”جی وہ بچوں کو بھیج دیجیے۔“ وہ خواہ خواہ سی بڑے انہماک سے اپنی رست و اچ کو صاف کرنے لگی۔

”جی بہتر۔“ وہ جاتے جاتے بس ایک لمحے کے لیے رکے، مڑ کر ایک نظر اسے دیکھا اور باہر نکل گئے۔

”خالہ جان سو رہی ہیں۔“ گھر میں غیر معمولی خاموشی کا احساس کر کے اس نے حسین سے پوچھا۔

”نہیں نیچر..... وہ اور بتول باجی تو کل ملتان چلے گئے تھے چچا کی طرف..... ایک ہفتے بعد آئیں گے۔“

”تو تم لوگ..... آئی مین کو کنگ وغیرہ کون کرتا ہے؟“ اسے پتا تھا کہ گھر میں صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے بس ایک ہی ملازمہ ہے۔

”بریک فاسٹ تو بابا نے بنا لیا تھا۔ دوپہر کو ہم نے گر گر کھائے، ویسے بابا کہہ رہے تھے کہ رات کو وہ ہمیں سمن زار سے کباب لا دیں گے۔“ آخر یہ جعفر صاحب نے دوسری شادی

”مہم... میں واپس جانا چاہتی ہوں۔“ وہ ہم گئی۔

”آں... آپ ڈارک جائیے۔“

”نہیں نہیں پلیز! مجھے جانا ہے۔“ وہ زور زور سے سر ہلاتی ہوئی چلی۔

”رہیے مس لارنس! ایک منٹ۔“ وہ کبڑ کر اندر چلے گئے لیکن عیب سے احساسات میں گھری سہیا کو راہ فراری کی یہی صورت نظر آئی وہ ان کے باہر آنے سے پہلے ہی بھاگی ہوئی سڑک پہ آ گئی۔

”انسان کیا سوچتا ہے اور حقیقت کیا ہوتی ہے۔ ایک لمحہ پہلے کیا میں یقین کر سکتی تھی کہ سید جعفر علی شاہ بہک سکتے ہیں۔ اسے سخت انفس ہو رہا تھا۔“ ہمیں اس بری طرح کرتے دیکھ کر انہیں تمہارے زخمی ہونے کا خدشہ ہو گا اسی لیے شاید نادانستہ میں... دماغ نے صفائی چیش کی۔“ ہو سکتا ہے... مگر وہ اندر تک انڑی گئی، وہ کا پتلی انگلیاں وہ دود دیتا بس۔ نہیں نہیں وہ کوئی فرشتہ تو نہیں تو جو بہک نہ سکے۔ اسے اپنی بے بسی پہ رونا آ رہا تھا۔ کاش میرا باپ یوں مجھے سے سہارا نہ کرتا۔ کاش میرا کوئی بھائی ہوتا تو میں بھی عزت سے گھر بیٹھی ہوتی یوں سڑکوں پہ خوار نہ ہوتی۔ کاش خدا نے میری ماں کو ماں کا دل بھی دے دیا ہوتا۔ کاش... کاش...“ وہ مٹنی سڑک پہ بارش میں بھیستے ہوئے ہر بات سے قطعاً بے نیازی بس خدا سے گلے شکوے کرتی جا رہی تھی۔

”گرتے کے نیچے کیا ہے۔ گرتے کے نیچے۔“ جھوٹی آوازوں میں یہ بے ہودہ بول سن کر وہ چوکی۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تو جان فنا ہو گئی۔ چار سڑک چھاپ آوارہ لڑکے نکلیں پہنے ہوئے، بھانڈوں کی طرح تالیاں بجاتے اس کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ ”اگر تے میں دل ہے میرا“، بڑی بڑی مومچوں والے لڑکے کی سرخ آنکھیں اس کے سفید گرتے گئی تھیں۔ ”آف...“ وہ پانی پانی ہو گئی گھر سے نکلے ہوئے اسے بالکل بھی خیال نہ آیا کہ ایسے موسم میں یہ بازی ڈیس اس کے لیے پریشانی کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ بارش کی وجہ سے اس کا ملل کا سفید گرتا اس کے سافو لے جسم سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے وہ بھری سڑک پہ لگی ہو گئی ہو۔ دوپٹے کو پھیلا کر پھینٹا چاہا مگر دوپٹا بھی بھیگ کر اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ بار بار گچے گر رہا تھا۔ اس نے ایک پلو پکڑ کر تجوڑا۔ ”اورنگ برے جھیکے چڑ والی رنگ برے۔“ ان آوارہ نوتوں نے تان بدل لی۔ وہ جیسے پیسے تیز چلنے کی کوشش کرنے لگی مگر ٹانگ کی چوٹ بار بار کراہنے پہ مجبور رہتی جب کہ وہ آہستہ آہستہ اس کے گرد گھیرا ڈالتے جا رہے تھے۔ ”اوجھٹکی سڑک پہ سچ بھائی سوئے گوری کا یار بلہم ترے رنگ برے۔“ ایک مکروہ صورت

والے نے آگے بڑھ کر اس کا دوہنا کھینچا چاہا کہ پانی میں سکڑ کے چلنے کی آواز نے سٹنی سڑک کا ہیبت ناک سکوت توڑ دیا۔

”اوتے بیڑا غرق، یہ شاہ جی کتھوں آگئے؟ ہماگو؟“ ایک نے زمین پہ تھوکتے ہوئے کہا اور وہ سارے شوپ شوپ کر کے زو کی گلی میں گھس گئے۔ ”کھٹکس گاڈ!“ اس نے سینے پہ کراس بنایا۔ سکڑ اس کے قریب آ کے رکا جعفر شاہ نے ہاتھ بڑھا کر اسے چادر تھمائی۔

”میں یہ لینے اندر گیا تھا۔“ اس وقت ان کی نظروں میں وہی خلوص اور نرمی تھی۔ سہیا ان کے شانے پہ سر کا کر سسک پڑی۔

”آئی انکم سو ری سرا! میں نے بے اعتباریوں میں آنکھ کھولی ہے۔ پاکیزہ رشتوں کی ہوسناکیوں سے فوج کے زندگی گزار دی ہے۔ میں بدگمان ہو گئی تھی آپ سے سر۔ مجھے معاف کر دیں۔ پلیز مجھے معاف کر دیں۔“ وہ ان کے گریبان کو پکڑے جھکے دے دے کر رو رہی تھی۔ انہوں نے آنکھیں سے اس کے ہاتھ سے اپنا گریبان چھڑا اور اپنے شانے پہ اس کے سر کو سہلا کر کہا۔

”چلو میں باسل جھوڑ آؤں۔“

بارش میں بھیسنے کی وجہ سے اسے فلو ہو گیا تھا۔ وہ اگلے دن کالج بھی نہیں گئی۔ دو پہر کو ایلاش آئی تو اسے 102 بخا تھا اس نے تپتی سے اسے ٹیوشن کے لیے جانے سے منع کیا۔ حالانکہ وہ خود کب بہت پارسی تھی ان کا سامنا کرنے کی۔

”کیا میں یہ استرا ف کر لوں سید جعفر علی شاہ ک میں آپ کے سحر میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ حقیقت کی حد تک آپ کو پوچھنے کی ہوں۔ میرا درم درم آپ کے آگے سر جھکا رہا ہے۔ میں بار چکی ہوں سب کچھ۔ دل، روح، ایمان سب کچھ بار دیا ہے میں نے، لیکن نہیں، جب باری بھی ہوں تو پھر بار کا اعلان کیا کرنا۔“ اس نے ارادہ کر لیا اپنی بار کو تسلیم کرنے کے بعد چپکے سے اس جذبے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے دل میں محصور کرنے کا لیکن اگلے روز وہ حیران رہ گئی سر جانے کی حد تک جب وہ اس کے سامنے بیٹھے کہنے لگے۔

”سہیکا! میں جانتا ہوں یہ بڑی نامناسب سی بات گئی ہے کہ میں ایک جوان بچی کا باپ ہو کر جو تم سے چند ہی برس چھوٹی ہو کی یہ کیوں کہ... کہ میں تم سے... میرا مطلب ہے مجھے تم... کچھ عجیب سی کشش محسوس ہوتی ہے تم میں جیسے... جیسے محبت ہو گئی ہو تم سے۔“ انہوں نے سر اٹھائے بغیر انک ایک کر کہا تو اس کی نبض جیسے رک گئی اور وہ سب کچھ بھلا کے اس راہ

لوٹ وچھڑنگی ڈاروں 33 O
اوقات سے بہت زیادہ ہے۔“ وہ لڑکی جو جیون ہار چکی تھی اس کے لیے خواب ہارنا کون سی بڑی بات تھی۔

☆=====☆=====☆

”میں تجھے کہہ رہی ہوں گھر سے باہر جانا ہے تو پہلے یہ وامبیات پڑے اتار کے دوسرے ہمکن۔ شریفوں کی طرح نکل گھر سے۔“

”اوہو اماں دیر ہو رہی ہے۔ پورے بارہ بجے فنکشن شروع ہو جاتا ہے اور میں نے کوئی نہیں پڑے بدلے، بس نے اپنی کپڑوں میں آئے کا کہا ہے۔“ فیرا بھٹلا کر بولی۔
”ہر روز پارٹیاں، ہر روز مینا بازار، ہر روز ڈراے، ناہے کاٹے ہے کچھ خاندان۔“
”آف اماں۔ بولنے سے پہلے سوچ تو لیا کر۔“

”سوچ لیا ہے میں نے بہت اچھی طرح۔ بڑی پڑھائی کر لی ہے ٹوٹے۔ گھر بیٹھا آرام سے اور یہ چنگ سنگ چھوڑ دے۔“

”اماں آج تو جانے دے۔“ اسے جج جانے کی جلدی تھی۔ فورنریس اسٹڈیم کے فن فیئر میں جانے کا سب فرینڈز نے مل کے پروگرام بنایا تھا۔ وہ پہلے ہی کافی لیٹ ہو چکی تھی۔ گلی میں شوق کی گاڑی کا بارن بجنا۔ وہ جلدی سے باہر لگی مگر جمشید اس سے پہلے دروازہ کھول کے باہر جا چکا تھا۔ ”میں کہہ رہی ہوں آرام سے بیٹھا جا۔“ اماں نے اسے بیگ سنبھالنے دیکھ کے چٹایا۔ جمشید اندر آیا تو اس نے پوچھا۔
”شوق آئی تھی ناں۔“

”ہاں واپس بھیج دیا ہے میں نے تیری اس کپڑی کو۔“
”کیوں؟ تجھے کیا تکلیف ہے۔“ فیرا کیا پارہ چڑھ گیا۔
”نہیں پسند مجھے یہ لڑکی۔ میں برداشت نہیں کر سکتا کہ ایسی دودھ کنکے میں کبے والی لڑکیوں کے ساتھ میری بہن کسی کو نظر آئے تو وہ تجھے بھی ایسا ہی سمجھیں۔“
”جشیدا! آئندہ اپنی گندی زبان پیہ یہ بات مت لانا۔ شرم نہیں آتی تجھے کسی شریف لڑکی کے بارے میں ایسی کبواں کرتے ہوئے۔“

”آئے ہائے، شریف لڑکی۔ چلو میں کہیں کر سرفی پاؤں لگا کر کرنی دی پر سٹکنے والی شریف لڑکی، ہر روز اخبار میں اس کی تصویریں ہوتی ہیں جنہیں گلی کے لڑکے آپس بھر بھر کے دیکھتے ہیں اور جب اس کی گاڑی اس گھر کے آگے کھڑی ہوتی ہے تو ذرا دیکھ جا کے کتابت جمع اکٹھا ہو جاتا ہے۔ یہ شریفوں کا گھر ہے تیری بد معاش کپڑی کا ڈھونڈیں۔“

پہ چل پڑی جس کا انجام نہ اسے معلوم تھا نہ جعفر شاہ کو۔
کون ہے وہ کیا ہے وہ مجھے اس سے کیا غرض
وہ مجھے اجمالا میں نے سوچا کچھ نہیں
میں بھی تو انسان تھا ایک خالی رہ گئی
میں نے جس کو دل دیا میں نے سوچا کچھ نہیں
ایک دن انہوں نے بڑے عجب سے انداز میں اس سے پوچھا۔
”سہیکا! تم مجھ سے کس چیز کی توقع رکھتی ہو۔“
”کچھ بھی نہیں شاہ جی۔ آپ خود ہی تو کہتے ہیں عشق حقیقی تو وہی ہے ناں جس میں کوئی غرض رکھے بغیر عبادت کی جائے۔“
”سلی گراں! میں نعوذ باللہ خدا نہیں ہوں۔ انسان ہوں۔ ہر انسان محبت کے بدلے میں کچھ تو چاہتا ہے۔“

”محبت کا بدلہ محبت کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔“
”تم سمجھ نہیں پا رہی۔“
”آپ سمجھا دیں۔“ اس نے ٹھوڑی پھٹیلی پہ نکائی۔
”دیکھو سہیکا! میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔“ وہ بھرنا انداز میں بولے۔
”مجھے پتا ہے شاہ جی آپ کے اور میرے درمیان مذہب کی دیوار حائل ہے لیکن اگر میں۔۔۔“

”نہیں سہیکا ایسا نہیں ہے۔ اگر تم مسلمان ہوتا جا تو بسم اللہ میرے لیے اس سے بڑی سعادت کیا ہوگی کہ میں نے کسی کو صحیح منزل دکھائی لیکن شادی میں پھر بھی نہیں کر سکوں گا تم سے۔“ کچھ کرچی چھیٹی دل میں شاہید کا ٹائپا جلتے ہوئے تیل کا کوئی چھینٹا اس کے سارے وجود میں لاؤ۔ جمل اٹھا۔ ان کی آواز سائیں سائیں کرتے کانوں میں کہیں دور سے سنائی دے رہی تھی۔

”میری جوان ہوتی بچی، باشعور ہوتے بیٹے، میرے گھریلو حالات، خاندانی مسائل اس بات تو اور ڈھنیں کر سکتے کہ میں شادی کر سکوں۔“

کچھ ہوا تو ضرور تھا جو ایک بل کے لیے اس کے دل کی دنیا ڈول گئی لیکن اس نے آنکھیں جھکا کر آنسو پے۔ سینے میں جلتے لاؤ کے شعلے کچھ کم ہوئے۔

”شاہ جی میں آپ سے کچھ نہیں مانگتی، کچھ نہیں چاہتی، جو آپ دے رہے ہیں میری

”میں منذ توڑوں گی تیرا جشید۔“ وہ پھری ہوئی اس کی طرف لگی۔

”چپ کر مر جائے۔ بھائی کے آگے تن کے کھڑی ہوتی ہے۔ بتا کون ہے تیری سبیلی کیا کرتی ہے؟“ اماں کو بول اٹھنے لگے۔

”ہونہار بھگری ہے۔“ جشید نے باہر جاتے ہوئے شیشہ چھوڑا۔

”ہائے میں مر گئی۔“ اماں نے سینے پہ دو ہاتھ مارا۔

”بک رہا ہے یہ اماں! وہ بہت بڑے سرکاری افسر کی بیٹی ہے۔ اس کی بہن ہوائی جہاز چلاتی ہے اور ماں ایک سکول میں پڑھاتی ہے۔“ اس نے تھوڑا جھوٹا جھوٹ بول کر اماں کو تسلی دی۔ ”یہ تو ایسے ہی کند پھیلا تا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ اس نے اپنے یاروں کے ساتھ مل کر اسے چھیڑا تھا تو اس نے بھی اسے اچھی سمجھائی تھی۔ بھری سڑک پہ بے عزتی کر ڈالی تھی۔ اسی لیے اتنا روتا ہے۔ اس کے نام ہے۔“

”یہ تو ہے ہی بد ذات۔ باپ یہ گیا ہے بالکل۔ وہ بھی کی عمر کا ہو گیا تھا لیکن نیت میں وہی نور تھا۔ اس کی وجہ سے تو میری سگی بہنوں نے میرے گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ بد نیت۔“

”اماں! دیکھ مجھے جانے دے۔ تھوڑی دیر اور ہو گئی تو مس بہت ڈانٹے گی بہت سا کام میرے ذمے ہے فکشن کا اگر زندگی تو نام نہاں نہ کر جائے گا کاٹھ ہے۔“ اس نے پھر سے منت کی۔

”اچھا ہے کٹ جائے روز روز کی مصیبت ختم ہو۔“

”اماں، اماں! تو سمجھتی کیوں نہیں..... سارا پرگرام خراب ہو جائے گا۔ مس کی الماری کی چابی بھی میرے پاس ہوتی ہے۔ بس آج جانے دے۔“

”جاسر۔“ اماں نے ہاتھ جھکا کہ وہ جلدی سے بیگ اٹھا کے باہر بھاگی۔

”تو پھر مجھے سرنگی باہر۔ دو دنالے ہے جیسا سارا حملہ با تیں سنا تا ہے تیرے پیچھے۔“

اس نے ایک پوسر پر پھینکا اور جلدی جلدی چلنے لگی۔ راستے میں ایک ہلی سی۔ او سے شفق اور رو با نیلے کے گھر ہو گیا۔ وہ دونوں ہی جا چکی تھیں۔ ”اوہو! اب بس میں ہی جانا پڑے گا۔“ اس نے سوچا۔

سناپ پہ آکر وہ مرے مرے قدموں سے چلنے لگی۔ کتنا شوق تھا اسے فن فیر میں آنے کا۔ البتہ اس سے بلکہ کلر کا سوٹ بھی لیا تھا اور رو با نیلے کے کورٹ شوز بھی۔ کیا لیا پلان بنائے تھے انجوائے کرنے کے لیے، بلا گھا کرنے کے لیے۔ وہ جھٹوں سے پیسے بھی جوڑ رہی تھی اور اماں اور جشید نے موڈ خراب کر دیا۔ دو دنالے سر پہ..... وہ بڑبڑائی۔ جیسے میں نہیں جانتی فرقہ پسند والی بہن نے کیسے شادی سے پہلے سارے محلے کے لڑکوں کو چمکا رکھا تھا۔ بھائی مجھے سناتی

ہے کہ کالج میں پڑھنے والی لڑکیاں آکھہ منکرتی ہیں اور خود اس کی بہن جس نے سکول کی شکل تک نہیں دیکھی شادی شدہ ہونے کے باوجود تین بچے چھوڑ کر دیور کے دوست کے ساتھ بھاگ گئی۔ کیا میں ہی بری ہوں۔ میں ہی آوارہ ہوں۔ کیا کیا ہے میں نے؟ محبت؟ نہیں مجھے تو کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ کیا پیسے کے لیے..... نہیں میں نے تو کبھی کسی لڑکے سے کوئی تحفہ تحائف تک نہیں لیے پھر یہ..... آخر کیوں؟ کیوں میں بری بن گئی؟ لیکن کیا میں بری ہوں بھی یا نہیں۔ نہیں میں بری نہیں ہوں۔ مجھے پیسے کالاج نہیں ہے۔ البتہ کتنی ہے میں فطرتاً آزاد و بے پستی ہوں ہواؤں میں بٹکے کھول کر اڑنا چاہتی ہوں۔ شاید ایسا ہی ہو لیکن کبھی کبھی میرا دل کیوں چاہتا ہے کہ کوئی مجھے قید کر لے۔ بٹکے کٹر کر نہیں بلکہ..... یہ کیسی پیاس بھڑکتی جا رہی ہے دل میں..... آخر کیا چاہتی ہوں میں اور کس لیے ڈال ڈال منڈلا رہی ہوں۔“ وہ خود سے الجھتی ہے ترتیب قدموں کے ساتھ چل رہی تھی۔

اس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے دیکھا۔ روڈ کے عین وسط میں ایک اسمارٹ سی لڑکی سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس نے کئی بارن دے دیے لیکن شاید اس نے سنے ہی نہیں اس نے اپنی آہستہ آہستہ کر لی اور گاڑی اس کے پیچھے پیچھے رینگنے لگی۔ بلکہ ملکی کیولاٹ ٹخنوں سے ذرا اونچے تھے۔ گورے گورے بیروں میں کورٹ شوز کے بلیک لیدر کے اسٹیپ کے ہوئے تھے۔ بلیک نیٹ کی ہی اس نے شرٹ پہن رکھی تھی، بلیک سرخ بھورے بال کلپ میں قید تھے۔ (شکل دیکھنی چاہیے) اس کے سوا چار اور گاڑی ذرا آگے نکال کر اس کے سامنے آگیا۔ ”بیلوس۔“ پہلے تو وہ ایک دم ڈری گئی یہ اچانک بول نکلا۔ پھر وہ ڈرے جھانکتے زندگی سے بھر پور شریر چہرے کو دیکھ کر حواس ٹھکانے آئے۔

”جی فرمائیے۔“ اس نے سینے پہ دونوں بازو باندھ کر بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ آپ اس قدر جان لیوا قسم کا حسن سینے اکیلی اس بڑی روڈ پہ جا رہی ہیں، نقص امن کا اندیشہ ہے مس..... آئیے میں ڈراپ کر دوں۔“ اس نے فریادی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے آفریڈی اور فرنٹ ڈور کھول دیا۔

”گلتا ہے لفٹ دینے کی خاصی پریکٹس ہے مسز کو خیر دیکھتے ہیں موصوف کتنے پانی میں ہیں۔“ فی یادل ہی دل میں نہیں اور سیٹ پر بیٹھ کر کہا۔

”مجھے فورٹریس اسٹیڈیم تک جانا ہے۔“

”جانا تو مجھے بھی وہیں ہے۔ ویسے اگر زندگی جانا ہوتا تو تمہارے پیچھے چلا آتا۔“ اس نے تھیلی کھول کر ہاتھ آگے بڑھایا اور پیوٹم آفر کی۔ فریڈا نے گردن کے ہلکے سے

اشارے سے انکار کیا اور ڈیش بورڈ پر پڑی کیسٹ کا کوراٹھا کر دیکھنے لگی۔ وہ ذرا آگے جھک کر بولا۔

”اچھا یہ بتاؤ دنیا کا سب سے حسین نام کیا ہے۔“ اب وہ ایسی جتنی بھی نہ جھی کہ اس کی لچھے دار باتیں نہ سمجھتی۔

”مجھے فیئر شید کہتے ہیں۔“

”کیوں؟ فیئر یا کیوں کہتے ہیں پری، حور یا اہرا کیوں نہیں کہتے؟“

”اس لیے کہ ابھی کسی کا دماغ اتنا خراب نہیں ہوا۔ بالی دی وے آپ کی تعریف؟“

”تعریف اس خدا کی جس نے تمہیں بنایا۔ ویسے مجھے صوفی کہا جاتا ہے۔“ اس نے گاڑی ریسٹورنٹ کے ساتھ کھڑی کی۔ ”بیجے جناب وہ عالم مادی ہی گیا جہاں مجھے اور تمہیں جدا ہوتا ہے اور اب وہ خوبصورت مقام بھی تادو جہاں مجھے اور تمہیں دوبارہ ملتا ہے۔“

”ابھی وہ مقام معرض وجود میں نہیں آیا۔“ اس نے نیچے اترتے ہوئے جواب دیا۔

”اوکے، چلو اس کا جی نام بتا دو جہاں دوپہر ایک بجے پورا لاہور اکٹھا ہو جاتا ہے سینڈی کرافورڈ کا دیدار کرنے کے لیے۔“ اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر وند میں جھک کر اسے کانچ کا نام بتایا اور بائے بائے کرتی چل پڑی۔ حسب توقع وہ سب اسے ”شیزان“ کے بارے پر زار شکون سیٹ مل گئیں۔

”کہاں رہ گئی تھیں تم؟“ الیشار نے کھونٹے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

”دیکھو یہ پہلے ہی ملے ہو چکا تھا کہ آج کے دن کوئی ٹھپا نہیں کرو گی سمجھ رہی ہوں نا۔“

رومانیلہ نے بھی آڑے ہاتھوں لیا۔

”تمہارا کہا ہر آنکھوں پہ جان من..... مجھے کیوں دیر ہو گی اس کا جواب شفق سے پوچھ لو۔“

”شفق ہے کہاں؟“ الیشار نے پوچھا تو وہ پریشان ہو گئی۔

”کیا مطلب ابھی شفق نہیں پہنچی۔“

”ہمیں کیا پتا تم دونوں کہاں کہاں سے ہو کے آ رہی ہو۔ رومانیلہ کو ابھی تک اس پہ شک تھا۔“

”اوکم آن یار! میں نے کہا ناں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اماں گھر پہ بھری بیٹھی تھیں اور وہ

جسیدہ..... اوما کی گاؤ ضرور اسی جسدیدہ نے ہر بکا ہو گا۔ وہ تو پہلے ہی بہت زیادہ Sensitive (حساس) ہے اس بارے میں۔“ اسے افسوس سا ہونے لگا۔

”لیکن اب وہ ہے کہاں؟“ سہیکا پہلی بار بولی۔

”اوہو آپ بھی شریف رکھتی ہیں۔ بڑی سلی ہوئی ہو کیا بات ہے؟“ اس نے دلچسپی سے اس کے سونے چہرے پہ پھیلی مسرت رنگی بہاریں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”اس نے عینے داسونا لگایا ہے۔“ الیشار نے لڑکھڑاکر کہا تو ان سب نے با آواز بلند لمبی سی ”او“ کی۔

”بھئی چلو بھی اندر۔ بھوک لگی ہے زبردست قسم کی۔ اس الیشار کی جچی کا کبڑا کرانے کے لیے تو میں نے ناشتہ تک نہیں کیا۔“

”ڈرا ٹمبر و تحوڑا دیٹ کر لینے ہیں شفق آجائے۔“

”نہیں وہ نہیں آئے گی۔ میں جاتی ہوں وہ اس وقت اپنے کمرے میں بند وہ تمام میگزین اور اخبار جلا رہی ہو گی جن میں اس کی تصویریں ہیں۔“ فیئر نے اندر بڑھتے ہوئے کہا۔

الیشار نے اپنی مٹکئی کی خوشی میں ٹریٹ دی تھی اور اس وقت ”شیزان“ کے خشک ماحول میں بیٹھی گھٹنے لگائی وہ چاروں لڑکیاں ارد گرد کے تمام لڑکوں کی توجہ اپنی جانب کھینچ رہی تھیں۔ اگلے دن کانچ ٹائم کے بعد گیٹ سے نکلتے ہوئے اسے یہ دیکھ کر ذرا بھی اچنبھا نہیں ہوا کہ صوفی اپنی ہنڈا اکاڑ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ”شفق یہ وہی ہے اس دن والا۔ وہ جو مجھے سینڈی کہہ رہا تھا۔“

”خود کون سا رچہ ڈیکسٹر سے کم ہے۔ کوائٹ پنڈزم۔“ اس نے سینی بجاتے ہوئے ریمارکس دیئے۔ ”چلو ملتے ہیں۔“

”فاریکٹ اٹ یار! یاار! الوٹو اٹم کا بندہ ہے باتونی سا۔ میری بس نکل گئی تو پھر ڈھائی بجے تک بس شاپ پہ کھڑی رہوں گی۔“

”چلو پھر بھی کسی۔ اوکے بائے ڈارلنگ۔“ شفق نے اس کے گال پہ منی سی کس کی اور چلی گئی۔ وہ روڈ کی سائڈ میں چلنے لگی۔

”اے سینڈی کرافورڈ! کیا بات ہے لفٹ ہی نہیں کراری۔ لفٹ لینا ہی جاتی ہو، دینا نہیں۔“ اس نے کار اس کے قریب روک لی۔

”کیا مطلب؟“ اسے یہ جملہ بہت برا لگا تھا۔ برہمی اس کے لہجے اور چہرے سے صاف ظاہر تھی۔

”ارے تم تو مانڈ کر گئی شاید۔ اچھا بیٹھو۔ پہلے ہی اتنی دیر سے آئی ہو آدھے گھنٹے سے

اور پہتے پانی کی طرح پاک۔ پہلی نظر میں تم مجھے یونہی تو کھری کھری ہی نہیں لگیں۔
”کیا کہا تم نے؟ شفاف۔ پاک۔ نہیں صوفی نہیں اگر تم میرے حسن کی تعریف میں
زمین آسمان کے قلعے بھی ملا دو تو میں یقین کر لوں گی۔ اپنے عشق اور دیوانگی کی قسمیں اٹھا لو
تو میں مان جاؤں گی کہ ایسی باتیں بہت سنی ہیں میں نے لیکن یہ الفاظ مجھ سے آج تک کسی
نے نہیں کہے۔“

”ادراپ جو الفاظ میں تمہیں کہنے جا رہا ہوں وہ بھی شاید تم سے بہت سے لوگوں نے
کہے ہوں گے لیکن اتنی سچائی سے نہیں کہے ہوں گے جیسے میں کہہ رہا ہوں۔“

"I Love You"

”تم جانتے ہو تم کیا کہہ رہے ہو۔“ وہ سنانے میں رہ گئی۔ اس کھنڈر سے امیر زادے
سے اسے دوستی کی پہلی پھلکی آخری توقع تو تھی مگر ان الفاظ کی نہیں۔ یہ تو ان لوگوں کی لغت میں
شامل ہی نہیں۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ بھی ان ہی سے فکروں پر جانوں میں سے ایک ہے جو کسی بھی
حسین لڑکی کو ذرا سا آلودہ دیکھ کر جھٹ دوستی کی آفر کر دیتے ہیں۔ چند روزہ دوستی۔ ایک خاص
دوستی۔ ایک الگ قسم کی دوستی۔ پارک، ریسٹورنٹ اور تھیمز ہال میں چند ڈیش پر چھپا دوستی۔
جب تک ایک دوسرے کو برداشت کیا سو کیا پھر بائے بائے۔ اس کے بالوں، اس کی آنکھوں،
اس کے گورے ہاتھوں، مصنوعی ہنسی اور بناوٹی باتوں کی تعریف کس کس نے نہ کی تھی مگر یہ تین
الفاظ تو کسی نے بھی اس کی سماعتوں کی جھولی میں نہیں ڈالے تھے کیا یہی وہ پیاس تھی۔ یہی
وہ ترپ تھی جو مجھے بے چین کیے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔
”تم رورہی ہو فیری؟“

”نہیں تو۔۔۔“ اس نے رخساروں پر پہنے آنسو صاف کیے۔

”تو پھر میری پھلکی تم کیوں رورہی ہے۔ دیکھو اتنی دور تھاپہ کر رونا ٹھیک نہیں۔ کیا
فائدہ جب کوئی اٹک پھنسنے والا ہی نہ ہو۔“

اور وہ تین دن بعد ہی اس کے آگے گھٹنے ٹیکے آنسو بہا رہی تھی۔ اور وہ اس کا بہر آنسو
چلوں کی پاؤں سے نکلنے ہی اپنی پور پھلکیا جیسے ایک آنسو بھی زمین پر گر گیا تو کسی مقدس چیز کی
بے حرمتی ہو جائے گی۔ اس نے اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف اسے بتا دیا۔

”صوفی میں نے تم سے کچھ نہیں چھپایا۔ اب تم بتاؤ کہ کیا میں اتنی ہی شفاف اور پاک
ہوں جیسا تم نے سوچا۔“

”فیری یا انسان اور حورادنیامیں آرتا ہے۔ ہر مرد اور ہر عورت کا ایک دوسرا حصہ ہوتا ہے

سو کھ رہا ہوں۔ جینو بھی۔“
(تو یہ کیسے حوصلے جمارہا ہے) ”سوری مسز مجھے دیر ہو رہی ہے۔“ وہ آگے چلنے لگی۔
اس نے گاڑی تھوڑی اور بڑھا دی۔

”ایز بولاٹک پر پینا ہے بی۔ مجبور کرنا تو ہم نے سیکھا ہی نہیں۔ چلو ایسا کرتے ہیں کل
گیارہ بجے پک کر لوں گا میں تمہیں۔ مگر یہاں نہیں۔ تم بتا دو کہاں ملیں۔“
”تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں آ جاؤں گی۔“ اسے غصہ آنے لگا اسنے ڈوٹق سے
میرے بارے میں کچھ کہنے والا یہ کون ہوتا ہے۔ شاید یہ مجھے ایسی ویسی سمجھ رہا ہے۔ (خبر وہ تو
میں ہوں ہی کبھی سمجھتے ہیں اس نے کون سی ایسی نئی بات کی لیکن نہیں۔ یہ کیوں) نہ جانے
اسے کیوں یہ اچھا نہیں لگا کہ وہ اس کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرے۔

”اس بات کا میں بہت تعجبی جواب دے سکتا ہوں لیکن تم اس وقت واقعی جلدی میں
لگتی ہو۔ یہ میرا فون نمبر ہے۔ فون ضرور کر لینا کل کسی بھی وقت۔“ وہ اس کے ہاتھ میں
ڈیزائننگ کارڈ تھما کر یہ جاہد ہو گیا۔

”تو تمہارا خیال ہے کہ میں تم سے ملنے آ جاؤں گی۔“ اگلے ہی روز وہ رومانیکلے کے ایئر
کنڈیشنڈ روم کے گداڑ صوفے میں دھنسی فون پر اس سے بات کر رہی تھی۔
”نہیں مجھے یقین ہے کہ تم مجھ سے ملنے آؤ گی۔ میرا دل کہتا ہے۔“

”کیا کہتا ہے یہی کہ میں اتنی سستی ہوں۔ اتنی گری پڑی ہوں کہ محض تمہارے ایک
اشارے پر دوڑی چلی آؤں گی۔“ وہ تلخ ہو رہی تھی۔
”یہ کیا تم نے ملل کلاس لڑکیوں جیسی باتیں شروع کر دی ہیں۔“

”ملل کلاس لڑکیوں جیسی؟“ اس کی ٹھٹک دار ہنسی ایئر میں گونجی۔ ایسی ٹھٹک جو
کاٹخ ٹوٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔ ”ملل کلاس لڑکیوں جیسی نہیں مسز صوفی۔۔۔ ملل کلاس
لڑکیوں والی۔ ہاں میں اسی ملل کلاس سے تعلق رکھتی ہوں جس کا ذکر تم اس قدر آتاتے
ہوئے انداز میں کر رہے ہو۔ بلکہ شاید ملل کلاس سے بھی کچھ کم ہی۔ مجلڈ بیگم پورہ کی جینڈے
والی گلی میں پیر عاشقان کے مزار کے ساتھ ساڑھے پانچ مرلے پر بنے اس دو منزل مکان میں
ایسے نیکی ڈرائیور بھائی اور باپ کے ساتھ رہتی ہوں جس کی مزگ میں ”مشنڈے“ غدار کلف
اور فالوڈہ کی دکان ہے۔“ وہ چپا چپا کر کہتی رہی۔ ”کوب کیا کہتا ہے تمہارا دل میرے
بارے میں۔“

”یہی کہتا ہے فیری یا شاید کہ تم ایک صاف، کھری اور سچی لڑکی ہو۔ ششے کی طرح شفاف

جسے ڈھونڈنا پڑتا ہے اور اس تلاش میں وہ کبھی کبھی غلط جگہ بھی پہنچ جاتا ہے۔ جی بات تو یہ کہ میں تمہارے وجود کا دوسرا حصہ ہوں اور تمہیں مکمل بھی کر سکتا ہوں۔ جانی جو سب گزرا اسے بھول جاؤ۔ مجھے دیکھو تمہیں تلخاتنے میں اپنے دوسرے حصے کو کھوجنے میں مجھے بھی بہت سے دلوں کی راہ گزرے گزرتا پڑا ہے۔ سو آئی ذمہ کبیر۔ میں اس فرسودہ باتوں پہ یقین نہیں رکھتا۔ چلو اب سویت سی اسائل دو۔“ وہ مطمئن ہو کر ہنس دی تو صوفی نے ہولے سے اس کے گال چتھپتھپائے۔

”لو۔“ اس نے ایک سگریٹ سلگانے کے بعد پکٹ اس کی طرف بڑھایا۔
”نہیں۔“ وہ کچھ جھجکی گئی۔

”ابھی تم خود ہی تو تیار ہی تھیں کچھ۔“ اس نے شر پر مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”ہاں لیکن وہ تو سب ڈپریشن دور کرنے کے لیے تھا۔ اب تمہارے ہوتے ہوئے مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔“

”واٹ رہی؟ ڈپریشن کے لیے ہی کیوں۔ خوشیاں شیئر کرنے کے لیے بھی اس سے بہتر کچھ نہیں۔“ اس کا موڈ بگڑ گیا۔

”ہاں میں تو بھول گئی تھی کہ تمہارے طبقے میں یہ اتنی معیوب بات نہیں ہے ہمارے ہاں تو۔۔۔۔۔“

”یاد تم اتنی تلخ مت ہو جا یا کر دو۔ Listen مائی گرل، طبقہ وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ لائف کے بارے میں میرا اپنا پوائنٹ آف ویو کچھ الگ سا ہے۔ اسوکلگ محنت کے لیے بری ہو سکتی ہے لیکن میں اسے اخلاقی طور پر جرم نہیں سمجھتا اور Just Imagine اگر کہ یہ معیوب ہے بھی تو جب یہ برا کام ایک مردِ فخر سے کر سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں۔ ایک باپ جی کے ساتھ بیٹھ کر بغیر کسی شرمندگی کے سگریٹ پی سکتا ہے تو بیٹی کو آفر کرتے ہوئے غیرت کا مسئلہ کیوں آگے آتا ہے۔ لڑکیاں لڑکوں کے کش لگانے کے سائل پہ مرنی ہیں تو پھر لڑکوں کو بھی اعتراف نہیں ہونا چاہیے لڑکیوں کی اسوکلگ پر۔ کوئی گناہ نہیں، جرم نہیں بس یوں سمجھ لو ایک عادت ہے جیسے کچھ لوگ پان کھاتے ہیں۔ سپاری کھاتے ہیں۔ کچھ کو چائے، لسی اور کافی کی لت ہوتی ہے کچھ ہم جیسوں کو سگریٹ کی اور اسٹنڈ یو کہ پان، سگریٹ کے مقابلے میں کہیں زیادہ صبر صحت ہے۔“ وہ کافی دیر تک اپنے زریں خیالات سے نوازتا رہا۔

رومانیک کو پتا چلا تو وہ اس پر ہنس پڑی۔ ”پاکل ہو تم جو اسے سب کچھ بتا دیا۔“ حق ٹھیک ہے کہ وہ بڑا براڈ مائنڈ ہو گا لیکن تمہارے اتنا کچھ بتا دینے کے بعد بھی وہ یہی شک

کرے گا کہ ابھی تم بہت کچھ چمڑگی ہو۔“

”اور پھر ویز تم نے ایسا بھی کیا کیا ہے؟ ٹھیک ہے تم سے کچھ غلطیاں ہوئیں تمہیں اس کا احساس ہوا ہے اور ابھی ابھی بات ہے لیکن یہ کوئی ایسی سنگین غلطیاں نہیں تھیں کہ اگر تم اس سے چمڑاتی تو کوئی فرق پڑ جاتا۔“ سبکا کا کبھی افسوس ہو رہا تھا۔

”ان سختیوں کو بچپن میں خنقا اور پولو کے ساتھ ساتھ چٹائی کا ٹیکہ بھی لگا دیا گیا تھا۔“ ایلیشا عجل کر بولی اور وہ بس مسکراتے ہوئے زمین پہ بیٹھی گھاس نوچتی رہی۔

”مجھے تو یہ یقین نہیں آ رہا کہ تم اتنی سیریس کیسے ہو گئی کسی کے لیے۔“ خفق جو کافی دیر سے سکے کے عالم میں بیٹھی تھی، عجیب احمقانہ انداز میں پوچھنے لگی۔ ”تو کیا تم اس سے شادی دادی کے تعلق سوچ رہی ہو۔“

رومانیک اشارات ہو گئی۔ ”ہو سکتا ہے کل وہ یہ کہہ دے کہ میرے دے آف یو لک میں شادی کی کوئی مخالفت نہیں۔ شادی کیا ہے؟ تین لفظوں سے شروع ہو کر تین لفظوں پہ ختم ہو جانے والا کھیل۔ جب ہم بغیر شادی کے مل سکتے ہیں۔ گھوم بھر سکتے ہیں۔ ہنس بول سکتے ہیں تو پھر ساری زندگی ساتھ ہی رہ سکتے ہیں۔ میں تمہارا ہوں اور تم میری ہو۔ ہمارے دل ایک ہیں۔ رو جس ایک ہیں۔ آخر نکاح کے دو پولوں کی ضرورت ہی۔۔۔۔۔“

”فول یو پلےز شٹ آپ۔“ فیروز باوجود ہو کر بولی اور زار نرم پڑ کر کہا۔ ”تم نہیں سمجھو گی۔ میں دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ میری طلب میں کتنا سچا ہے۔ کس کس حال میں چاہ سکتا ہے۔ میری خواہش بھی کچھ کچھ اختیار عارف والی تھی۔

وہ میرے نام کی نسبت سے معتبر ٹھہرے
گلی گلی میری رسوائیوں کا ساتھی ہو
”وہ نہ! کوئی کسی کی بہتیاں کا ساتھی نہیں بنتا۔“

”جب بنے گا ناں تو ساری دنیا دیکھے گی۔“ وہ منہ چڑا کر بولی۔
☆=====☆

”کیا بات ہے رم۔“ یہ وارڈز روب کی شامت کیوں آئی ہے۔“ نام نے بیڈروم میں داخل ہوتے ہی پوچھا۔

”یونہی کم۔۔۔ وہ انکچل کی آج ایلیشا کے گھر پارٹی ہے اس کا بھائی امریکہ سے واپس آیا ہے انجیکشن مکمل کر کے اس لیے وہاں جانے کے لیے ڈریس سلیکٹ کر رہی تھی۔“ رومانیک نے کہا۔

اس کی فریڈ زین الیشاع واحد تھی جس سے دوستی یہ مام نے اعتراض نہیں کیا تھا۔
 ”نائب قنصلش ہے۔ کافی دیر ہے ابھی تو۔ ایسا کرو یہ کچھ مٹی رکھ لو اور کسی اچھی سی بوتیک سے نیا ڈریس لے آؤ۔ بلکہ کوئی گفٹ وغیرہ بھی لے لینا۔“

”بس مام! گفٹ تو لینا پڑے گا لیکن ڈریس کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں۔“
 ”یہ لفظ کہاں سے سیکھ لیا ہے تم نے بی بی..... تمہیں شاید ضرورت پوری کرنے کے لیے نہیں بلکہ خود کو ہر وقت یہ یقین دلانے کے لیے کہی جا رہی ہے کہ تم حبیب اللہ کی بیٹی ہو۔ اور یہ لفظ ”ضرورت“ ہماری دشمنی میں نہیں ہے۔“ مام نے فخر سے گردن اٹھا کر کہا۔ اس نے ایک نظر سامنے دیکھا اور پھر گہرا آکھیں جھپکالیں۔ اسے اپنی مام کے نقوش بگڑتے ہوئے محسوس ہوئے۔

”یہ رکھ لو، دس ہزار سی تو ہیں اور جلدی چلی جاؤ تاکہ آٹھ سو ڈریس دیر ریٹ کر سکو۔ پارٹی میں جانے سے پہلے ایک آدھ گھنٹے کی سلیپ ضرور لینی چاہیے فیس پر فریش نہیں آ جاتی ہے۔“
 (آپ کیا جانیں ماما فریش نہیں کیا ہوتی ہے) اس نے مام کے ہاتھ تھکے چہرے سے پہلے ایک آپ کی تہہ میں جیسے سیاہ حلقوں کو دیکھ کے سوچا۔

اپنے لیے ڈریس تو اس نے ایک ہی نظر میں ”الاشاعل“ پہ پسند کر لیا تھا۔ بلکہ انگریزی رنگ والا کرش کا پشوا سوٹ جس کے گلے، آستینوں اور گہرے پر سرخ گلیٹوں اور گولڈن موتیوں کا ٹیس سا کام تھا اور اب وہ پچھلے ڈیزائن سے گفٹ کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی مگر کچھ پسند نہیں آ رہا تھا۔ ”آف کیا لوں؟ پر فوم یا پھر کوئی آفٹر شیو۔ نہیں بھی آکھو ڈیگٹا ہے۔ میں تو الیشاع کے توسط سے جاری ہوں میرا نوں سا اس کے بھائی سے کوئی ٹک ہے جو ڈائریکٹ اس کے لیے کوئی گفٹ لوں۔ کوئی ڈیکوریشن ہیں یا پینٹنگ ٹھیک رہے گی۔ اس کی گاڑی ”گفٹ لینڈ“ کے آگے رک گئی (چلو کچھ تو کچھ پسند آ جائے گا یہاں) وہ ماربل کی میز جہاں ٹک ٹک کر رہی تھی۔ پینٹنگز، فریم، گامز، درست واپز، وال کلاز، بھلوانے، کانسٹیکس حتیٰ کہ آڈیو سسٹم تک سچی تھیں۔ اس نے ایک خوبصورت ڈیکوریشن ہیں پسند کیا۔ پلاسٹر آف ہیرس پہ مونا لیزا کی عظیمہ ابھری ہوئی بڑا سراسر سا تھرڈ چین کر رہی تھی۔

”ایک سیوڑی!“ اس نے کاؤنٹر پہ کھڑے لڑکے کو مخاطب کیا جو اس کی جانب پشت کیے واک میں لگا ہے سر نہ ہٹا ہوا دروازے میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ اپنی بات کا کوئی رد عمل نہ پا کے اس نے ہولے سے اپنے غریبی ناخنوں کے ساتھ کاؤنٹر بٹا لیکن وہ دھس سے سس نہ ہوا بلکہ خود ہی گنگناٹے لگا۔ ٹو چیز بڑی ہے مست مست۔ (افو! اب میں اس مست مست کو سمجھوٹنے

سے تو رہی) اس نے سوچا اور اس کے متوجہ ہونے کے انتظار میں کاؤنٹر پہ کھینا ٹیک کے کھڑی ہو گئی۔

نہیں تجھ کو کوئی ہوش، نہیں تیرا کوئی دوش
 وہ نوٹ گنتا ہوا پیچھے پلٹا تو اپنے عین مقابل ڈیزھنٹ کے فاصلے پہ ایک گول سے چہرے کو نہٹھے سے سفید ہاتھوں کے پیالے میں اپنی جانب دیکھتا پا کر اسے جیسے بریک لگ گئی۔ وہ منہ کولے پوری آنکھیں پھاڑ کے حیرت زدہ سا اسے دیکھنے لگا۔ رومانیہ کی جوبھی چھوٹی تو ہنستی ہی چلی گئی۔ (تو یہی ہوتی شکل ہے بے چارے کی) اسے یوں بے تحاشہ ہنسنے دیکھ کر وہ بے چارہ مزید پرل ہو گیا۔

”بی بی!“ کافی دیر تک اس کی کھلکھلاہٹ کے رکنے کا انتظار کرنے کے بعد وہ اٹھیاں ہٹاتے ہوئے بولا۔ دو سالہ لڑکے ہاتھ کے اشارے سے اسے ہیڈ فون اتارنے کا کہا۔
 ”اوہ آئی ایم سوری۔“ اس نے جلدی سے کانوں سے ہیڈ فون کھینچ کر اتار پھینکا۔
 ”دیکھیے مجھے یہ بیک کر دیجیے۔“

”بی۔“ وہ تا بعد امدادی سے کہہ کر ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ وہ اس کی نروس ہوتی ہوئی حالت اور کاپٹی ہوئی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے ہنسی روک کے بولی۔
 ”آپ پینٹنگ کر لیں گے؟“

”بی۔“ اس نے آخر کار ایک دروازے سے کڑھوٹ پی نکالا جو گالے ہی لمحے اس کے ہاتھ کی قید سے آزاد ہو کر کاؤنٹر کے شیشے پہ لگتا ہوا نرسن پہ جاگرا۔ رومانیہ کو احساس تھا کہ اس طرح اس کے سر پہ کھڑے رہنے سے وہ سات جنم میں بھی پینٹنگ نہیں کر سکے گا۔ لہذا وہ دوش کا ڈسلیٹ کرنے کے لیے دوسری جانب چل گئی۔

”ویری اسٹریج کیریئر!“ اسے ابھی تک اس کی حالت یہ پتی آرہی تھی۔ ایسا لڑکا تو اس نے پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ ایک تو اس کے اپنے سرکل کے لڑکے تھے وہ درجہ بولڈ، بے تکلف اور دوسرے وہ چھوٹے جو کالج ٹائم کے بعد اس کا سواگت کرنے کے لیے گفٹ کے باہر بینک اور گارڈزوں پہ بیٹھے وال پکائی آنکھوں سے جائزہ لیتے اور سگتے الفاظ سے خراج تحسین پیش کرتے۔ اسے تو ایسے ہی مہذب، محتاط اور ڈراڈرا مجھینے جھیننے لڑکے دلچسپ لگتے تھے۔ وہ دودھ پلٹی۔

”ایک سیوڑی!“ کیا آپ وشن کارڈ سلیٹ کرنے میں میری کچھ مدد کر رہے؟“
 ”بی۔“ اس نے رہن کو آخری بچ دے کر خوبصورت پینٹنگ میں ایک طرف کیا اور

اے” کھنڈ“ سے باہر نکل آیا۔ درمیانی بلکہ قدرے کم قامت کا گوری رنگت والا دبلا پتلا عام سا لڑکا تھا۔

”آپ کس قسم کا کارڈ لینا چاہتی ہیں۔“ وہ مودب ہو کر ہاتھ باندھے ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ اس کے انداز پہ بھر سے رومائل کے لبوں سے فوراً بلند ہوا۔ ”یعنی جی..... جی کے علاوہ بھی کچھ الفاظ یاد رکھ لیں آپ نے۔“

”جی۔“ وہ ہنسنے لگا۔ اس نے ترس کھا کر بات بدلی اور اسے کارڈ کے متعلق بتانے لگی۔

پارٹی ختم ہو رہی۔ یہ ایضاً گھر میں بالکل بدلی جاتی ہے۔ کہاں وہ کالج کی پڑ اعتماد چھٹی ہوئی لڑکی اور کہاں گھر میں کبھی ہوئی پزل سی جیسے سر پہ نکوار لٹک رہی ہو۔ ذرا بھی مزہ نہ آیا۔ اس نے جھک کر شوذا اتارے۔

”تم حد سے بروقت جا رہی ہو فردوس۔ میں نے سمجھی تھی کہ یہ روک ٹوک نہیں کی۔ تمہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی پھر تم کیا جاہل عورتوں کی طرح ہر رات میرے دن بھر کی رپورٹ سننے کو مڑی ہو جاتی ہو۔“ اس کے ڈیڈ چیٹنے لگے تھے۔

”کیوں نہ پوچھوں میں۔ صرف پارٹنر ہی نہیں بزنس پارٹنر بھی ہوں تمہاری۔ تمہاری کمپنی میں 40 فیصد شیئرز میرے ہیں۔“ نام ان سے بھی بلند آواز میں دھاڑیں۔

”اس بات کا بزنس سے کیا تعلق؟“ ڈیڈ ہیٹ کی طرح اس بات پر ذرا نرم پڑ گئے۔

”تعلق ہے۔ تم لاگوں روپیہ ان چپ عورتوں پہ ضائع کر دیتے ہو جیسا کہ ہونہ! شرم آتی ہے مجھے تو یہ سوچ کر ہی۔ اپنے اسٹینڈرڈ سے اتار کر جاؤ گے تم..... میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ہائیڈرو۔“ رجم افغانی کے چوکیدار کی بیوی۔ تمہیں اور کوئی نہیں ملی۔“

تو بام کو شکوہ اس بات کا تھا کہ ڈیڈ نے ان کے ”اسٹینڈرڈ“ سے کمتر عورت کو..... وہ چڑھ گئی اور پھر تک سبیل تان لیا۔

”کمال ہے یہ ایضاً کتنی جتنی لگی۔ ابھی پرسوں تو پارٹی میں اس نے ذکر تک نہیں کیا میں نے پوچھا بھی تو کہنے لگی کہ شاید کزن ہے یا پھر بھائی کا دوست اور آج فون کر کے کہہ رہی ہے کہ اس کی منگنی بھی ہوگی اس سے۔ مجھے نمبر لے لگی یہ لڑکی۔ چلو ہم میں سے کوئی تو پار لگی۔ اس نے سوچا۔ فیربا، سمیرا، شبنم کے ساتھ مل کے اس نے پروگرام بنایا کہ اس ستر و فون فیئر والے دن ہی اس سے ٹریٹ لے لیں گے۔ اس دن وہ تیار ہو کر بارہ بجے سے ڈرا پہلے ہی گھر سے نکل گئی۔ اس کے گھر سے فوراً نہیں اسٹینڈم کا فاصلہ کچھ کم اتنا زیادہ نہ تھا راستے میں

اسے کئی جگہ پھولوں کی دکائیں بھی نظر آئیں لیکن وہاں پہنچ کر اس نے گاڑی پارکنگ لائٹ سے دوبارہ موڑ لی۔ (ابھی تک تو کوئی بھی نہیں آئی تھی تب تک ایضاً ع کے لیے پھول ہی لے آؤں) اور ٹھیک بارہ منٹ بعد وہ ”گفٹ لینڈ“ کے آگے گاڑی پارک کر رہی تھی۔ اندر جانے سے پہلے اس نے ایک نظر اپنا جائزہ لیا۔ وائن کروشینے کی کھلی سی قمیص میں کہیں نہیں سلور بیڈز لگے تھے۔ وائن پوڑی وار جامد اور بڑا ساروق لگا دینا، بیروں میں سلور سٹلے کے کام والی چٹل، اپنے گولڈن کرلی بالوں کی اس نے خوب کھینچ کر پونی کی تھی جس سے گردن کے اوپر گولڈن سارنچی کچھان بھی گیا تھا۔ ایک دم سے تیز دھوپ سے اندر آنے پر اسے کچھ اندھیرا سا محسوس ہوا۔ اس نے گلاسز اتارے وہ آج پہنی اپنی مخصوص ”کھنڈ“ میں واک مین سے دل بہلا رہا تھا۔ رومائل کو دیکھتے ہی اس نے جلدی سے بیڈ فون اتارا اور ارٹ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اسی انداز پہ تو اسے فکس آئی تھی۔ اور وہ اس کی بلا وچ کی ہنسی سے جزبہ سا ہو گیا۔

”جی مس۔“

”آپ کی شاپ میں فون ہے؟“ اس نے مسکراتی آنکھیں اس کے چہرے پہ گاڑ دیں۔

”جی۔“ اس نے ٹیلی فون سیٹ نکال کر سامنے رکھ دیا۔

”مجھے آپ کی بات کا یقین ہے پھر بطور ثبوت اسے پیش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

اس نے شہادت کی انگلی کے ایک انچ لیے ناخن سے ٹیلی فون سیٹ پر بے دھکیلتے ہوئے کہا۔

”جی؟؟؟ آپ نے خود ہی تو..... وہ بے چارہ مشکل میں پھنس گیا۔ (عجب سی لڑکی ہے)

”نمبر کیا ہے؟“ اس نے بیگ میں سے بال پوائنٹ اور پیپر نکالا اور پھر سے اس کے چہرے پر نظریں جمادی لیکن اب کی بار وہ ہنسنے لگا۔ جھکا سکا بلکہ کچھ کھونچنے کے انداز میں اس کے نقوش پر ہنسنے لگا اب ہو کمال کے چلوں کی چٹن گرانے کی باری رومائل کی تھی۔ کچھ کچھوں تک نظروں کی پیش سے سگلتے چہرے پر رنگ پھیلانے کے بعد دوبارہ اسے دیکھا تو وہ مسکرا دیا اور دھیرے سے اس کے ہاتھ سے چین لے کر فون نمبر لکھنے لگا۔

میں جانتی ہوں کوئی خاص بات اس میں نہیں

وہ دیتا ہے نہ وہ دیتاؤں جیسا ہے

نہ جانے قلب و نظر میں سما گیا کیسے

وہ عام شخص ہے اور عام لوگوں جیسا ہے

اور ایک بہت ہی خاص ماحول میں پلنے والی خاص لڑکی ایک عام سے لڑکے کی محبت میں بالکل ایسے ہی گرفتار ہو گئی جیسے سڑی دھاتی میں بننے والی انڈین اور پاکستانی فلموں میں کوئی نواب زادہ گاؤں کی کسی جاہل اور آن پڑھ ایلے تھانے والی، پانی دھونے والی محنت کش لڑکی کی سادگی اور لہڑپن پر عاشق ہو جاتا تھا۔ وہ اس کے محتاط سے رویے اور بے گامگی بھری اچانکیت پر مرعبی تھی۔ وہ فون پہ پہروں اس سے باتیں کرتی نہ تھکتی تھی اور وہ گھنٹوں سنتے ہوئے نہ تھکتا تھا۔

”میں روز تمہارا سر کھپاتی ہوں ایک تم ہو کہ اپنے بارے میں کچھ بول کے ہی نہیں دیتے۔ میں ہی پاگل ہوں۔“ وہ سخت جھنجھلائی ہوئی تھی۔ ”ہنو، ہنو، تمہاری نظر میں میری حیثیت ہی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ جب بھی تمہارے متعلق کچھ پوچھوں تم ٹال دیتے ہو۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ ہنسی روک کر بولا۔

”ایسی ہی بات ہے اسی لیے تو ایک مہینہ ہو گیا مجھے یہ تک نہیں بتا کہ تم رہتے کہاں ہو۔“

”رحمان پورہ میں۔ بس یا مکان نمبر بھی بتاؤں۔“

”مکان نمبر کو چھوڑو فون نمبر بتاؤ۔ سچ کبھی کبھی آدھی رات کو ہی دل اتنا چاہتا ہے کہ

جہیں فون کروں۔“

”خدا کا شکر ہے کہ ہمارے گھر فون نہیں ہے۔“

”کیا کہا.....؟ فون نہیں ہے۔“ اسے مایوسی ہوئی۔ ”اچھا..... چلو..... مگر تم نے خدا

کا شکر کیوں کہا.....؟ وہ دھاڑی۔ جواب میں صرف وہ ہنستا رہا۔ ”ویسے تمہارے گھر میں کون

کون رہتا ہے؟“

”امی ہیں۔ بھائی ہیں۔ ایک بھتیجی اور دو چھوٹی بہنیں۔ بھائی جان دو سال سے باہر

ہیں۔“

”باہر کہاں؟“

”کویت۔“

”وہاں کس لیے۔“ وہ مزے سے سوال پہ سوال کرتی چلی گئی۔

”تیل کا کنواں خریدنے گئے ہیں۔“

”واقعی؟“

”بھئی ایک بے چارہ غریب آدمی کویت کیوں جاتا ہے ظاہر ہے محنت مزدوری کرنے۔“

”لیکن تم غریب تو نہیں ہو۔ اچھا خاصا بڑا ستور ہے تمہارا۔“

”جی ہاں..... لاکھوں کی آمدنی ہوتی ہے ہر ماہ۔“

”ہر وقت بس جلی کٹی باتیں کرتے ہو تمہارا استاد کیا ہے۔ کینئر تو نہیں۔“ وہ ہل کر

بولی۔

”کپیری کورن ہے۔“

”تو کچھ تو تمہارا برتھ ڈے بس آنے ہی والا ہے۔ بے ٹال!“ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں شاید برسوں ہے۔“

”فخر..... سنو میں برسوں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔“

”آجائے گا۔“ اس نے بے پرواہی سے کہا۔

”نہیں یہاں نہیں۔ کہیں باہر۔“ اس نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

پہلی بار اس سے اس طرح ملنے جانا تھا اس لیے وہ خاصے اہتمام سے تیار ہوئی۔ اس

کے لیے The Diamond کا آئنفر شیو پیک کیا جسے وہ ہاتھوں میں لے کر پچھلی سی

مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”تھینک یو سوچ! لیکن شاید تمہارے برتھ ڈے پہ میں اتنا قیمتی گفٹ نہ دے سکوں گا۔“

”ارے واہ! کیوں نہ دو گے پورا گفٹ لینڈ تمہارا ہے۔“ رو مائلہ نے ہنسی میں بات

اُڑانا چاہی۔

”کہاں ہے میرا؟“ وہ چلتے چلتے رک گیا۔

”کیوں؟“ اس نے سچا پہ پچھنے ہوئے پوچھا۔

”تم کیا سمجھ رہی ہو مجھ جیسا شخص اتنے مصروف کاروباری علاقے میں دکان خرید سکتا

ہے؟ کرانے کی بے یار۔ پورے چار ہزار ہر مہینہ نہ کرایہ ہے۔ یوں سمجھو کہ جتنی انکم ہوتی ہے

اس میں سے آدھا تو کرایہ ہی ادا کرتا ہوتا ہے۔ اب تو میں تنجیدگی سے سوچ رہا ہوں۔ کچھ اور

کام کرنے کو۔ باہر جائیں سکتا کہ پیچھے امی اور بہنوں کو کوئی پوچھنے والا بھی نہیں ہوگا۔ باپ کچھ

چھوڑ کر نہیں مرا کہ کوئی کاروبار ہی شروع کر لوں۔ انٹرکٹ امی نے سلائی کر کے اور بھائی نے

کھڑکی کر کے پڑھا دی۔ تم سوچ رہی ہو گی کہ میں یہ سب تم سے کیوں کہہ رہا ہوں صرف اس

لیے کہ تم میرے متعلق کسی غلط فہمی کا شکار مت ہو جانا۔ میں..... میں تو..... کیا ہوں میں؟ کچھ

بھی نہیں۔“ وہ سر جھکا کر مسلسل حیر سے چمکو ادھر سے ادھر لڑھکتا رہا۔ اس کے

چہرے پہ تناؤ کی کیفیت تھی اور لہو ٹانوا ٹانوا سا۔ رو مائلہ محسوس کر سکتی تھی کہ کفر اس کے سامنے

احساس کمزوری کا شکار ہو جاتا تھا۔ شاید اسی لیے وہ ابھی تک اپنے اور اس کے درمیان تعلق کو

رہیو۔ پھر سے اٹھا یا مگر چھوٹ بولی۔ چند ساتھیوں کی ہی گزریں پھر شاید اس کی دینی دینی سکلیاں سن کر فخر نے بولے سے اس کا نام پکارا۔

"کیا ہے اب؟ آج کیسے تھ تو رونی سے مجھے فون کر کے۔"

"رو کیوں رہی ہو؟" وہ بے حد سکون سے بولا تو رد مائیل بھڑک اٹھی۔

"مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو تم جیسے شخص سے۔" اس نے جلدی سے زبان دانتوں تلے دہلی۔

"ہاں ہاں کہو۔ بات مکمل کرو ناں۔" فخر نے اس کی حالت سے مزہ لیتے ہوئے کہا۔
 "آئی ایم ویری سوری رد مائیل۔ میں کچھ نہیں تھا اس لیے کچھ اول فون کبہ نہ کیا ورنہ میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا تھا۔ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ بہت چاہتا ہوں میں۔" اور رد مائیل کے ہاتھوں سے ریسیور چھوٹے پھوٹے پھوٹے پھوٹے۔

"سچ کہہ رہے ہو؟" وہ بے یقینی سے بولی۔

"جیوت کہنا ہوتا تو بہت پہلے یہ بات کہہ چکا ہوتا۔ مجھے اعتراف ہے پہلے میں تمہیں ایک آزاد منشا امیر زادی سمجھ کر کھڑا تھا رہا۔ یہ انکشاف کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں چند دن پہلے ہی ہوا مجھ پر۔"

"تو پھر؟" اس نے ان رشتہ نشی لمحوں سے فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ "ایک بات مانو گے میری۔"

"تم وہ دکان خرید لو۔" اور جواباً فخر نے ایسی لمبی سانس کھینچی جیسے اس کی عقل پہ ماتم کر رہا ہو۔

"دیکھو ناں تم بینک سے لون بھی تو لے سکتے ہو۔"

"بینک سے لون لینا بھی کوئی ایسا آسان نہیں۔ دکان کی طرح دکان بھی کرائے کا ہے کوئی جائیداد تو ہے نہیں جس کے کاغذات جمع کرواؤں۔ ہم جیسوں کو لون کون دیتا ہے۔"

"اور اگر کسی جگہ سے تمہیں بغیر کسی شرائط کے لون مل جائے تو۔"

"کہاں؟" وہ ہونچکا۔

"رد مائیل حبیب سے۔" اس نے آہستہ آواز میں کہا۔ دوسری طرف خلاف توقع خاموشی چھا گئی جب کہ اس کا انداز وہ تھا کہ وہ خوب چلائے گا رتے رتے اس نے پوچھا۔

"کیا ہوا فخر؟"

کوئی نام دینے سے کھڑا تھا۔ رد مائیل لاکھ بولڈ کسی لیکن اظہار میں پہل کے بجائے اس کا اعتماد بجا لہنے کے انتظار میں تھی۔ اب بھی جب وہ اس کے سامنے سر پاپا سوال بنا کھڑا تھا کہ میں کیا ہوں تو اس کا دل محک محک کے کھڑ ہوا تھا۔ لیکن اس کے لب لہجہ ایک نامحسوس سی سرگوشی کر کے رہ گئے۔

"فخر۔"

"ہوں۔" اس نے سر اٹھایا۔

"تم۔۔۔۔۔ تم ہو۔"

اس مبہم اور مختصری ملاقات کے عمر میں بھی وہ کئی دن مدہوش رہی۔ (وہ دن کب آئے گا فخر محمود جب تم میرے وجود کو تسلیم کر لو گے۔ میری سچائی پہ ایمان لے آؤ گے) وہ ہر روز سوتی اور اچانک ہی وہ بھڑک اٹھا۔ اس دن وہ بہت کھویا کھویا اور پریشان سا تھا۔

"کہاں تم ہو۔" ہر بات کا جواب بس ہوں ہاں۔ کیا بہت بڑی ہو؟" اس نے ریسیور کھوڑتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں نہیں۔ بس ایسے ہی۔"

"کچھ تو ہے یہ الگ بات کہ تم تانا تبا چاہو۔"

"یاد تم سے پچھا کر کیا کروں گا۔ دراصل اس دکان کا مالک دکان بیچنا چاہتا ہے۔ ایک مہینے کا نوٹس دیا ہے اس نے۔ سوچ رہا ہوں اتنی جلدی میں کوئی دوسرا بندہ کسے کیسے کروں۔"

"تو یہ دکان تم خرید کیوں نہیں لیتے؟"

"تمہاری اس بات کو سن کر وہ شہزادی یاد آ رہی ہے جس نے بھوکے ننگے لوگوں کو دیکھ کر بڑی حیرت سے پوچھا تھا کہ اگر ان کے پاس روٹی نہیں ہے تو یہ کیسے کیوں نہیں کھاتے۔ جن مسکوں کو تم سمجھتی ہی نہیں ان کی تفصیل میں جانے سے فائدہ۔"

"اچھا ایسا کرتی ہوں میں۔ ابھی یہاں آتی ہوں بھر۔"

"اور بھی غم نہیں زمانے میں مس رد مائیل۔ میری پریشانی ایسی نہیں جو آپ کی صورت کا دیدار کرنے سے دور ہو جائے۔" فخر نے بات کا تار کٹانے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ احساس تو تین سے ملگ اٹھی۔ "فخر تم۔۔۔۔۔ تمہیں اس طرح میری توجہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ سمجھ تم۔ پوری بات سنے بغیر ہی تم۔۔۔۔۔ غصے میں اس سے بات مکمل نہ ہو سکی اور اس نے ریسیور پھینک دیا اور دونوں انھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

"ٹرن۔۔۔۔۔ ٹرن۔۔۔۔۔" ہتھیلیوں سے آسبرو بے چہرے کو رگڑتے ہوئے اس نے

”کچھ نہیں۔“ اس کی رنجی رنجی سی آواز سنائی دی۔

رومانیلہ کا حوصلہ بڑھا۔ ”دیکھو فخر! میں ہرج ہی کیا ہے آخر تم بینک سے بھی لون لے کر واپس کرو گے بس مجھ سے ملے لو اور جب جی چاہے واپس لوٹا دینا۔ پانی پانی وصول کروں گی میں تم سے۔ ایک آنہ بھی نہیں چھوڑوں گی۔“

”چھوڑا تو تم نے اب بھی کچھ نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب مطلب کچھ نہیں۔۔۔۔۔ بس چھوڑو کوئی اور بات کرو۔“

”ایسے ہی کوئی اور بات کروں۔“ وہ گھڑ کر بولی۔ ”تم ایسے قابو میں نہیں آؤ گے اب میں کل خود چھین ٹھیک کرتی ہوں۔“ اس نے فون بند کر دیا اور فخر پیلو کر رہ گیا۔

رومانیلہ نے انگریزیشن میں جانے کا کہہ کر رام سے پچیس ہزار پکڑے۔ بینک سے اپنا اکاؤنٹ نکلوایا۔ بنیائیس ہزار وہاں سے نکلے۔ یہ وہ رقم تھی جو اسے عطا و عمید، نیوایز اور زرنت وغیرہ پر اٹکل آنیئر وغیرہ سے ملتی رہتی تھی۔ ”بھٹ! یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ ٹونوں کی گڈی شولڈر بینک میں خونے ہوئے بڑبڑائی۔

رات کو ڈاننگ ٹیبل پر اتفاق سے ڈینیڈی موجود تھے۔ ایسے مواقع بھی سال میں ایک آدھ بار ہی آتے تھے جب وہ ساری ٹیبل کے ساتھ ڈنکر کرتے۔ رومانیلہ نے دل ہی دل میں سارا بلڈان دھرایا اور بغیر کسی تہدید کے شروع ہو گئی۔

”ڈینیڈی مجھے ایک لاکھ روپیہ چاہیے۔“

نوذ لڑکھاتے ہوئے حبیب اللہ کا ہاتھ رک گیا۔ اس نے پہلی بار اتنی بڑی رقم کا مطالبہ کیا تھا وہ سوائے نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔ رام بھی سوپ کا کچھ واپس رکھ کر اس کی جانب متوجہ ہو گئیں۔ جھوٹ بولتے ہوئے وہ ایک لمبے کے لیے پزل ضرور ہوئی مگر پھر دل میں ”جنگ اور بحث میں سب کچھ جاتو ہے“ کا نعرہ لگا کر کانٹے سے ٹھیکتی ہوئی بے پرواہی سے کہنے لگی۔

”اچھے ٹیبل کل کالج میں بلڈ ٹیپ لگ رہا ہے۔ بلڈ کیسرس کے مریضوں کے لیے فن فیئر بھی ہونے والا ہے۔ میں جاتی ہوں کہ کالج میں سب لڑکیوں سے زیادہ فنڈ میری طرف سے ہو۔“ اس نے بالکل رام کے سے انداز میں گردن اٹھا کر کہا۔

”ویری گڈ! ایسا ہوگا۔“ رام بھی ایکسا نیڈ ہو گئیں۔ ”حبیب ڈارلنگ! تم اسے ڈیڑھ لاکھ کا چیک کاٹ دو۔ اس کے لیے UPCOMING نظر آتا بہت ضروری ہے سوشل

لائف میں بھی اور اسٹوڈنٹ لائف میں بھی۔“ اور انگلی ہی دن گیارہ بجے وہ اس کی شاپ میں موجود تھی۔ ستر ہزار نقد، ڈیڑھ لاکھ کے چیک اور تیس تو لے کے زبورات کے ساتھ۔

”فخر! میں بڑے مان کے ساتھ تمہارے پاس آئی ہوں۔ تم یہ جیولری رکھ کے بینک سے لون لے سکتے ہو اور یہ کچھ رقم بھی ہے۔“

”لیکن رومانیلہ! یہ اتنی بڑی رقم اور یہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں پہلے ہی تمہاری بلند پیوں سے، بہت سہا ہوا ہوں مجھے اور نیچے مت گراؤ۔ اپنے احسان تلے انتہامت دباؤ کہ میں تمہیں چاہنے کی جسارت سے بھی تائب ہو جاؤں۔“ وہ حیرت زدہ سا کھراٹنی میں سر ہلاتا رہا۔

”فخر! جلیز! جلیز! میری خاطر۔۔۔ تمہیں میری قسم۔“ رومانیلہ نے اس کے ہاتھ تھام کر اٹھائی اور وہ اس کے آسودہ بھرے کوروں کو دیکھ کے رہ گیا۔

عشق روگ نے ٹیبل کی کردی جوگن کی بھی ذات

جوگن آکھے یار مانتا، میں تاجوں ساری رات

آج شیریں نے فریاد کے ہاتھوں سے تیشہ لے کر خود نہر کھودی تھی۔ آج سوئی کا گھڑا کچا نہیں نکلا۔ کسی کے تھل میں آج ہوا باغی نہیں ہوئی اور ٹیبل نے ساری دھرتی کے پتھر جن کر آٹھل میں سمیٹ لیے ہیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سب پریم کہانیوں کے انجام بدل ڈالے۔

☆ ===== ☆

شوق نے تنگ گلی میں سے گاڑی تیزی کے ساتھ ریورس کی اور فل اسپید کے ساتھ ریڑھیوں، ٹانگوں، انسانوں کے جھوم میں نکل گئی۔ اس کے کانوں میں فیریا کے بھائی کی آواز نیزے چھونے لگی۔ اس نے گاڑی فرسٹ کیئر سے دوسرے کیئر میں ڈال دی اور خط ناک حد تک تیز ڈرائیونگ کرتی ہوئی وہ سیڈھی ٹی وی انشیشن پیچنی۔ پارکنگ لائٹ میں کارکھنی کر کے وہ تیز تیز قدموں سے بلاک نو کی طرف مڑ گئی۔ ابھی اس نے ڈارک گلاس ڈور کھولا ہی تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

”مس جی۔“

اس نے مڑ کے دیکھا ایک نو عمر سالز کا اس کے سلویٹس ناپ اور چست جینز پہ پھلتی نظر دین کو سنبھالنے کی ناکامی کی کوشش کر رہا تھا۔ ”کیا بات ہے؟“ اس نے کھا جانے والے انداز میں پوچھا۔ ایسے لڑکے ہر پردہ پوسر نے ادھر ادھر کے کاموں کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ ”جی وہ آغا صاحب آپ کو یاد کر رہے تھے۔“ اس کی آنکھیں مسلسل اس کی کمانی گردن

میں کا کردار ادا کر رہا تھا۔ شفق کے زیادہ تر سبز اس کے ساتھ تھے جن میں وہ بے ٹھکن سوٹ اور ٹھکن آلودہ تھے کے ساتھ اس کے پاس کا کردار ادا کرتا۔

”کیسے آتا ہوا؟ آج تو آپ کے سین نہیں تھے؟“ سیف نے پوچھا۔ جواب میں وہ اسی طرح بے بس و حرکت پذیری جیسی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

”خیریت؟“ اس نے ٹائی کی ٹاٹ ڈھکی کی اور تشویش سے اسے دیکھنے لگا۔ شفق کا دل اس وقت کسی سے بات کرنے کو تیار تھا لیکن اس طرح مدتی کر بیٹھنے کا بھی بہر حال کوئی جواز نہ تھا۔ اس نے ایک لمبا سانس کھینچا اور ایک ہاتھ سے ماتھے پر آئے بال چبھتے کرتے ہوئے بادل نواستہ مختصر سا جواب دیا۔

”مجھے کچھ کام تھا۔“

”آغا صاحب کے سیریل کے سلسلے میں؟“ ادھر سے سوال کیا گیا۔

”نو“ اس نے بخفی سے کہہ کر کرسی کے بجھے یہ لگی کیل اکھاڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ سیف کچھ دیر اس کے چہرے کے تناؤ اور کشش کو کھوجتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا پھر ایک اور سوال کرنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔

”ابنی آفیشل پرابلم؟“

”آف“ وہ دھات بھج کر غرائی۔ یہاں اس کے ہمبر کی حد ختم ہو رہی تھی۔

”کیا بات ہے بڑی اواز اڑی لگ رہی ہو۔“ اس کے ہمدرد لہجے میں اس کی بے زاری کے باوجود کوئی فرق نہ آتا تھا۔

”لگ رہی ہوں سے کیا مطلب ہے میں ہوں اواز اڑا۔“ اس نے چبا چبا کر کہتے ہوئے عین کی سائینڈ پائٹ سے سگریٹ کی ڈبیا نکالی۔ ”لائٹر ہے؟“

”ہاں ہے تو ٹیکن میں یلڈ یو کو لائٹر پیش نہیں کرتا۔“

”ہونہا بنیاد پرست؟“ اس نے تراشیدہ ابرو چڑھا کر تسنن بھرے لہجے میں پوچھا۔

”نووے۔۔۔ حسن پرست۔۔۔ ان ٹیٹ مجھے خوبصورت لڑکیاں انجنی بنی دھواں چھوڑتی اچھی نہیں لگتیں۔“ اس نے آہستگی سے اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھین لیا۔ اس کے دھواں چھوڑنے والی بات پر پل بھر کے لیے شفق کے لبوں پر مسکراہٹ آئی مگر سگریٹ چھین لینے والی حرکت پر وہ جڑ بڑھ کر رہ گئی۔ اگلے ہی پل اس نے پیکٹ میں سے ایک اور سگریٹ نکالی اور چند قدم کے فاصلے پر کھڑے لائٹ میں کو اشارے سے ہلا کر ماچس مانگی۔ سیف کے سامنے ہی سگریٹ سلگا کر کش بھرا۔ ”سی یو۔“ کہہ دیا ہی بے نیازی سے واپس چلی گئی

اور کھلے گریبان پہ ہینک رہی تھیں۔

”کیوں؟“ اس نے ابرو چڑھائے۔

”پتا نہیں جی۔ وہ کہہ رہے تھے کل بھی آپ کو بلایا تھا۔“

”اور میں نے کہا تھا کہ میں جب بھی فارغ ہوتی آ جاؤں گی۔ ابھی اس سیریل میں بری طرح پھنسی ہوئی ہوں۔“

”وہ کہہ رہے ہیں جی کہ آپ ایک مرتبہ آئیں تو سبھی۔۔۔ بار بار آئیں گی۔“ اس کے کم عمر چہرے پر مصیبت کے بجائے خفاست منڈا رہی تھی۔

”مائی فٹ۔“ اس نے با آواز بلند دو تین اعلیٰ نسل کی گالیاں اس کے آغا صاحب کی شان میں کہیں اور منتقلی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

ایک غریب گھرانے کے آئین کا سیٹ لگا ہوا تھا۔ میلی دھوتی اور بنیان میں ملیوں اور میز عرض کا میک اپ کیے ایک اداکار کرسی پر بیٹھا سیٹ ڈیزائنر اور لائٹ مین کے ساتھ کارڈز کھیل رہا تھا۔ پچاس سالہ سابقہ فلمی ہیروئن کئے ہوئے سرخ بالوں پر سفید وگ جما کے جھریوں بھرے ہاتھوں سے ٹیل پالش چھڑا رہی تھی۔ وہ اس سارے ماحول پر ایک نظر دوڑاتی ہوئی لائق سے انداز میں دوسرے کونے میں چلی گئی۔ ایک ٹکڑی کی کرسی تھیں کریمیں اور سامنے والی کرسی پر دونوں ٹانگیں دراز کر لیں۔ وہ یوں بھی اسٹوڈیو میں ڈراما یڑ رہی رہتی تھی ڈائریکٹر اور رائٹر سے ضرورت کی چند باتوں کے علاوہ اس نے کبھی کسی سے راہ و رسم نہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تو بے رخی غیر ارادی طور پر ہی تھی کہ اسے خوشامدی اور بناوٹی باتیں کرنے والوں سے چڑھتی مگر بعد میں اس کا کبیر رویہ اس کی ذہال بن گیا۔ وہ پورے یونٹ میں تک چڑی، مفرد اور بد مزاج مشہور ہو گئی۔ جو نیزہ تو ایک طرف، سینئر مین اس سے مخاطب ہونے میں ہچکچاتے۔ دور دور سے اسے دیکھ کر آنکھیں سینکے والوں کو جب انگوٹھے کھٹے گئے تو وہ تھوکتے کرنے لگے۔ اسے لوگوں کی تھوکتی پر ادا پہلے کبھی جو وہ اب کرتی۔ وہ بڑی شان سے اسٹوڈیو آتی۔ اپنا کام مکمل کر کے چلی جاتی۔ عموماً جو ادبھی اس کے ساتھ ہوتا۔ جو اداس کا نایا بوائے فرینڈ تھا۔ (خبیث) اس نے دل ہی دل میں جو اداس کو کوسا۔ اتنی جلدی اپنی اصلیت دکھا دی آلو کے پٹھے نے۔ وہ کرسی کی پشت پر بازو کا ٹکیہ بنا کر سر نکاٹے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ جب اسے اپنے دائیں جانب دوسری کرسی گھسیٹنے کی آواز سنائی دی اس نے گردن گھمائے بغیر ڈراما سی آنکھ کھول کر دیکھا۔ سیف ٹھپو ٹھپو سے پسینہ صاف کر رہا تھا۔ اتنی گرمی میں اس نے ٹھری جیس سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ اس ڈرامے کا ہیرو تھا اور بزنس

جیسے آئی تھی۔

”ایڈیٹ آج تک کسی کی ہمت نہیں ہو سکی تھی میرے ہاتھ سے مگرینٹ جھیننے کی اور یہ ملاں بننے چلا ہے۔“ وہ سارے راستے جھینھلاتی رہی یوں بھی آج کل غصہ اس کی ناک پہ دھرا رہتا تھا اس نے سیف کی بے مقصد باتوں کے جوابات بھی محض اس لیے دینے تھے کہ اس سے پہلے اس نے بھی اس سے فری ہوئے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شفق کی طرح اس کی بھی یہ پہلی بیل تھی لیکن وہ فن اور اکاڑی میں اس سے خاصا سنیڑ تھا۔ تین سال تک فلوں میں ابھی طرح پٹنے کے بعد اب وہ بی وی کی طرف آیا تھا۔ گنڈ لنگ تھا۔ ایک حد تک ایجوکیڈ بھی اور قابلیت بھی خاطر خواہ تھی اس کے باوجود جب فلمی ہیرو کے معیار پہ پورا نہیں اُترتا تو اسے اور بی وی ڈراموں کے ذریعے قسمت آزمایا رہا تھا۔ وہ ڈیڑھ دو ماہ سے اس کے ساتھ کام کر رہی تھی یہ پہلا موقع تھا کہ ان دونوں کے درمیان اتنی لمبی گفتگو ہوئی تھی اسے حیرت تھی کہ آج وہ مجھ سے اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا تھا۔ اہ۔۔۔۔۔ اس نے ایک سرا پکڑ ہی لیا۔ ”تو بات یہ تھی سیف زمان صاحب کہ آج سے پہلے آپ کو جواد کے سائے نے روک رکھا۔“ اس کے چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ چمک اٹھی۔ وہ پہلے دن ہی ریکارڈنگ کے لیے جواد کے ساتھ آئی تھی۔ جواد ایک ویل فون مگر قد سے قدامت پسند گھرانے کا فوجوان تھا۔ رنگ و بو کی یہ طمسائی دنیا اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھی۔ روشنیوں کے اس جہان میں آکر وہ کلتا، یساٹنڈ ہوا تھا پھر وہ کتنے ہی دن لگتا کہ اس کے ساتھ آتا رہا۔ شفق نے اپنے اور اس کے تعلق کی وضاحت کسی سے کرنا ضروری نہ سمجھی۔ کوئی اس شفق کا تزن نہ سمجھتا، کوئی اور کوئی بھائی۔ متضاد رویے، مختلف آراء، وہ مزے سے جواد کا بازو تھا سے سیٹ پہ آتی۔ جب تک کام ہوتا رہتا وہ دور جھپٹا اسے خوبیت سے تکتا رہتا درمیان میں دونوں کئی بار مسکراہٹوں کا تبادلہ کرتے اور پھر وہ اسی طرح اس کے ہاتھوں میں ہاتھ دینے واپس چلی جاتی۔ اب جھپٹے کچھ دنوں سے ان دونوں کے درمیان کچھ اختانات ہو گئے تھے۔ جن کی وجہ سے وہ خاصی ڈسٹ پہ بھی رہی کیونکہ تین مہینوں کے ساتھ کی وجہ سے وہ جواد میں خاصی انوالو ہو گئی تھی اسے محبت تو نہیں ہوئی جواد سے مگر اس کی نرم طبیعت اور شائستگی نے اسے اس کی جانب کافی حد تک مائل کر دیا تھا لیکن اس سیریل کے سامنے کرتے ہی جب وہ بانی کلاس انگلش میگزین کی اصل ماڈلنگ کے بجائے روزناموں کے سرورق پہ چھپنے لگی اور اس کی شہرت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا اس نے محسوس کیا کہ اب وہ اس کی شہرت سے کچھ خائف رہنے لگا جب سے ڈرامے کی پہلی قسط آن ایزرگئی وہ سر عام ہر پبلک پوائنٹ پر شفق سے ملنے سے کتر آئے لگا۔ پہلے وہ اپنے برہوت

سے اس کا تعارف کچھ اور الفاظ میں کرنا تاہن اس دن ”فورینزن“ میں ڈزکرتے ہوئے اس کے کچھ دوست اچانک مل گئے تو وہ پریشان سا ہوا تھا۔ بے تکلف دوستوں کے معنی خیز سوالوں کو صرف نال کے گہر یا شفق نے محسوس کر لیا کہ پہلے صرف ایک خوبصورت، ماڈرن اور بولنڈ گرل فرینڈ کی حیثیت سے اس کا وجود جواد کے لیے قابل فخر تھا مگر اب ایک ایکٹرس کی حیثیت سے وہ شاید اس کے لیے باعث شرم بن گئی تھی۔ وہ اس کی شہرت سے یوں بھی ڈرتا تھا کہ اس کا نام بھی شفق کے حوالے سے کسی اخبار کی رینٹ نہ بن جائے۔ اپنی شائستہ مزاحیہ کی وجہ سے وہ کھل کے اس سے دونوں الفاظ میں اپنا مدعا نہ کہہ سکا مگر اس کے رویے سے یہ بات ظاہر ہوتی تھی۔

”مائی فٹ! مجھے کون سا عشق چڑھ رہا ہے اس کا۔ اوندہ یہ دو غلے شریف زادے۔“ وہ بیٹہ پہ اوندھی پڑی اضطرابی حالت میں ناگیں ہلا ہلا کر سوچ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سائینڈ میل کے پچھلے دروازے سے اپنی لمبی فون انڈکس نکالی اور شغل سے ایک کے بعد ایک نام کاٹنے لگی۔

”احسن زبیری۔“

”یار تمہاری نکلی تو بڑی زبردست چیز ہے کبھی تعارف تو کراؤ۔ ناراض کیوں ہوتی ہو جان میں تمہیں اپنے ایک ایسے دھانسو یار سے ملاؤں گا کہ ساری عمر دعائیں دو گی مجھے۔ کیوں پھر ہو جائے اولہ بدلا۔“ کٹ۔ اس نے لکیر پھیر دی اس نام پہ اور اگلا صفحہ پلٹا۔

”بلال چوہدری۔“

”بڑی گڑبڑ ہو گئی شفق۔ میری چھوٹی بہن نے تمہارے کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔

اب شاید ہی میں تم سے مل پاؤں۔“

”وہ کیوں؟“ اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔

”بھئی اسے کب اینڈ ڈراپ کی ڈیوٹی تو میری ہوگی۔ میں نہیں چاہتا سی روڈ سے اسی گاڑی میں تمہیں بھٹا کر پورا شہر گھوموں پھر گاڑی میں اپنی بہن کو لے کر جاؤں۔ نرائی نو انڈر اسٹینڈنڈ یار! لوگ میری بہن کے بارے میں کیا کیا سوچیں گے ظاہر ہے اسے بھی تمہارے جیسا سمجھیں گے۔“ اس کے تن بدن میں چنگار یاں بجھت پڑیں۔ یہ نام کاٹنے ہوئے بھی اس نے ذرا دیر نہ لگائی۔ دو تین صفحے پلٹنے کے بعد ایک اور نام پہ اس کی نظریں ٹک گئیں۔

”فرخ حسین۔“

”مارے گئے۔ یہ کہاں لے آئیں تم مجھے۔ یہاں تو میرے ماما جی کا گھر ہے۔“

”تو اکثر شام کو یہاں آتی رہتی ہوں۔“
 ”کسٹر؟“ پھر تو ابھی مصیبت ہو گئی اگر انہوں نے مجھے ”تمہارے“ ساتھ لے گیا تو۔۔۔

”تو کیا۔۔۔؟ اتنا ڈرتے ہو؟“ اس نے خرم کے گھبرائے چہرے کو دیکھا۔
 ”ڈرنے کی کیا بات۔ عزت کے پیاری نہیں۔“ اور وہ جیسے اسے اٹھڑکی۔
 ”تو کیا میرے ساتھ ہونے سے تمہاری عزت اتر جاتی ہے؟“

”ہاں ہے تو کڑی سوہنے پر۔۔۔۔۔“ اس نے تو قسمی خیر انداز میں مسکرا کر بات ادھوری چھوڑ دی مگر شفق کے کانوں میں یہ ادھورا جملہ آج بھی زار غلغلہ تھا۔ اس نے اس نام پہ اتنی بار پھسل پھیری کہ کاغذی پھٹ گیا۔ شفق نے بیجا بی انداز میں صفحے پلے۔ اس کی نظریں ایک اور نام پہ پھسلے۔
 ”دیم اصرہ۔“

”اس میں حزن ہی کیا ہے مائی گرل۔ جست خرائی اٹ۔“
 ”چلیز دیم ایوی۔“ وہ تڑپ کر اس کی جنونی گرفت سے خود کو بشکل آزاد کر کے پھولی پھولی سانسوں کے ساتھ بولی۔ ”میں نے پہلے ہی تمہیں وارن کیا تھا کہ میرے تعلقات تمہارے ساتھ ایک دوست یا ساتھی سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ فرسٹ آف آل میں محبت کے بغیر اس قسم کے تعلقات کے بارے میں سوچتے ہوئے بھی کراہت محسوس کرتی ہوں۔“
 ”شفق آئی ٹو یو۔“ اس نے کھوکھلے لہجے میں جان ڈالنے کی ناکام سی کوشش کرتے ہوئے چلا چلا کر کہنا شروع کر دیا۔

”سناپ اٹ دیم! میں اتنی سستی نہیں کرتی تمہارے ان گھسے پٹے تہی لفظوں کے صدقہ تمہاری بھولی مگر پروں کی۔“ اس نے تمہارت سے اسے دیکھتے ہوئے واپس جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

مگر پیچھے سے ایک جھٹکے کے ساتھ دیم نے اسے کھینچ لیا۔ ”پھر اپنی قیمت ہی بتا دو۔“
 ”یون آف جگ۔“ اس نے ایک ہی تھپڑ میں دنیا جہاں کی تقریباً سمیت کراس کے منہ پہ مارے مایں۔ ایک ایک کر کے انگڑیوں میں سے ہر نام کٹا کٹا۔ ”مستفہ پڑے پڑے ہو کر پورے کمرے میں ماتم کرنے لگے اور وہ بے دم ہو کر مسکرت آنکھوں سے سوال کرتے آنسو کرائے لگی۔

تاج اس کے سر پہ پورا نہیں آ رہا تھا بار بار پھسل کے اس کے ماتھے پہ سرک آتا اور تاج کے بجائے ہیلمٹ لگنے لگتا تھا۔ وہ چھانکا مانگا ڈاؤٹ ڈور اور ڈنگ کے سلسلے میں آئی تھی۔ یہ ایک خواب کا منظر تھا۔ وارنک میں نظم مشہور گلوکارہ کی آواز میں پس منظر میں گوٹج رہی تھی۔ اسے مغلیہ شہزادی کے گیت آپ میں زرد چوں کے دھیر پہ ننگے پاؤں خراماں خراماں شاہانہ انداز سے چلتے ہوئے آتا تھا مگر ہر دو تین قدم کے بعد اس کا تاج سرک کے پیشانی سے بھی نیچے آ جاتا۔ پہلے ایک دو ٹیک تو اس نے ہنستے کھیتے کر لیے مگر تیسری بار بھی تاج کی بدتمیزی پہ وہ جھلا اٹھی۔

”واٹ ریش! میرے پیروں میں کبھی شروع ہو گئی ہے۔ یو ایسکو الریجی کی پراہلم ہے مجھے۔ آخر کتنی بار ان گندے چوں پہ سے گزرا ہو گا مجھے۔ چلیز اپنا یہ منھوں تاج۔۔۔ پتا نہیں شاید چنگیز خاں کے سر کے ساز کا ہے۔“ وہ تاج بچ کے بوڑھائی چلی گئی۔ ”اس اسٹوپڈ تاج سے تو بہتر ہے میں سر پہ چکڑی باندھ لوں۔“

”گڈ انڈیا!“ میک آپ مین کے کہنے پر اس نے پلٹ کے گھورا بے چارہ گز بڑا گیا۔ ”جی میرا مطلب ہے سر پہ پٹی باندھ کے فٹ کر دیتے ہیں تاج کو۔ ایک دو منٹ کا تو سین ہے پھر کوئی کلونڈ شٹ بھی نہیں ہے کیوں سر جی؟“ اس نے ڈائریکٹر سے داد طلب انداز میں کہا۔

”اولنٹ سمجھو شٹ۔۔۔۔۔ بارش شروع ہو گئی ہے پیک آپ کرو۔“ ڈائریکٹر نے بے حد مزے ہوئے انداز میں آواز لگائی۔ شفق تیز بارش کے اچانک اور تباہ توڑ حملے سے بچنے کے لیے بھاری کام کاٹھلیں انگر کھا اور تین گز کا مدار دو پنا سنبھالتے ہوئے بھاگی نکرو، پٹے کے کنارے پر لگی ٹیس میں اس کے پاؤں کا انگوٹھا پھسل گیا اور وہ منہ کے بل گر پڑی۔

”بٹ۔“ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے کلابیوں میں دھستے کانچ کی سنہری چوڑیوں کے ٹکڑوں کو دیکھا۔ سرخ فون کی دھاریاں بہہ رہی تھیں۔

”شہزادی صاحبہ نے تو منہ کی کھائی۔“ سیف ہنستا ہوا اس کی طرف بڑھا مگر اس کی زخمی کلاں لگا دیکھ کے پریشان ہو گیا۔ جلدی سے اسے سہارا دے کر کھڑا ہونے میں مدد دی اور مین کی جانب بڑھ گیا۔ ”ہاں جو صاحب!“ اس نے میک آپ مین کو آواز دیں۔ ”تھو ہی دیر بعد کوئی ڈینول کی شیشی کوئی ٹھنڈا پانی اور صاف پٹیاں لے بھاگا چلا آیا۔“

”اوہو۔“ کیا جھگڑا ہے یہ۔۔۔۔۔ جاہل آپ سب لوگ۔۔۔۔۔ کچھ نہیں ہوا مجھے۔“ شفق ایک تو پہلے ہی بھری بھٹی تھی اوپر سے چوٹ سے مزید چڑچڑا کر دیا۔ جھنجھلا کر اس نے فٹو کے

کھر درے اور مقیش کے کام سے بھرے دوپے سے گزرتا گزرتا صاف کرنا شروع کر دیا۔
 ”ارے ارے۔۔۔ کلی گرل یہ کیا کر رہی ہو؟ داغ خراب ہے کیا۔“ سیف نے اس کا ہاتھ روکا۔ ”ٹھیک ہے آپ لوگ جائیں یہ ڈیٹل وغیرہ مجھے دے دیں باجوہ صاحب۔“ اس نے سب کو چلتا کیا اور خندے پانی میں ڈیٹل ملا کر اس کی خون اور مٹی سے بھری کلاںیاں دھوئے لگا۔ وہ چپ چاپ بیٹھی ہونٹ کا قتی رہی۔

”بہت فصد آتا ہے؟“ اس نے شفق کے چہرے پر نظریں گاڑیں۔ بھر پور میک اپ اور بھر پور غصے نے کلاںیاں چہرے کو آتش بنا دیا تھا۔ جیسے چٹون کرارے مزاج کے ساتھ مزید کھب رہے تھے۔ بڑے بڑے کندنی جیسے، موتیوں بھرا نکاسنہری بالوں میں الجھا جمومر، بصری دار گردن میں چٹا گلگونہ، گہرے بزم رنگ کا سنہرے کام والا لباس، بڑا سنہری دو پٹا اور پوڑی دار پار جامہ۔ اس کی مسکراتی نظریں مسلسل اس کا جائزہ لیتی رہیں تو وہ غراٹھی۔

”کیا ہے؟ کیا دیکھ رہے ہو؟“

”لگتا ہے کسی جسم نے فحشی ڈریس شو میں اتار لی کا بھیس بدلا ہو۔“

”مذاق اڑا رہے ہو میرا؟“ شفق نے بالوں سے جمومر اور ٹیکا کو چا۔

”تعریف کر رہا ہوں یار۔“ وہ سنبھل کر بولا۔

”یہ کوئی انداز ہے تعریف کا۔“ وہ بدستور اکھڑی اکھڑی رہی۔

”ایک تو تم اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کا موز بھی خراب کر دیتی ہو۔“ وہ پڑ گیا۔

ایک ہی فن تو ہم نے سکھا ہے

جس سے ملیے اسے خفا کیجیے

ہے تقاضہ میری طبیعت کا

ہر کسی کو چراغ پا کیجیے

شفق نے جون المیاء کے انداز میں جھومتے ہوئے شعر پڑھا۔

”جی ہاں۔۔۔ جیسے آج کل تم نے آغا صاحب کو چراغ پا کیا ہوا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ضرورت سے زیادہ جلیلی نے تمہارا داغ خراب کر دیا ہے جو تم ان کی سیریل کے لیے ہامی نہیں بھری ہو۔ ویسے اصل مسئلہ ہے کیا کہیں فلم وغیرہ سے تو آفر نہیں آگئی۔“

”نہیں بیٹی۔“

”تو پھر ویسے اگر تم کہو تو میں تمہیں فائیں دلا سکتا ہوں اچھے تیزری۔ کانی پڑا پوسرز سے میری جان بچان ہے۔ نئی اور خوبصورت لڑکیوں کے تو وہ لوگ یوں بھی منتظر رہتے ہیں

اور اگر وہ باصلاحیت بھی ہوں تو کیا مشکل ہے۔ تم ماڈل ہو کیمرے کو فیس کرنا جانتی ہو۔ ایکنگ کا تھوڑا بہت تجربہ اس سیریل سے ہو جائے گا۔ فلز زبردست ہے۔ فیس فوٹو جینک۔ ایک دم ٹاپ پے چلی جاؤ گی۔“

”نہ فکرم نہ بی ڈی وغیرہ۔۔۔ مجھے کہیں بھی کام نہیں کرنا۔ میں تو اس ماڈلنگ سے بھی بور ہو گئی ہوں۔“ اگلے سیدھے کپڑے پہن کر کمر دکاتے ہوئے اسٹیج پر آؤ۔ کرخت چہرے کے ساتھ اور بھر گھوم کر واپس چلے جاؤ۔ کٹنا کٹنا لگتا ہے بالکل آن نیچرل۔ تم نے بھی کسی عورت کو روٹین لائف میں ایسے چلتے ہوئے دیکھا ہے جیسے ہمیں فیشن شو میں چلایا جاتا ہے اور کرشل ایڈ۔ ان کا تو کچھ پوچھو یہ مت۔ دواڑا حالی منت کے ایڈ کے لیے مہینہ مہینہ آفس میں بٹھائے رکھتے ہیں۔ بی ڈی نے بھی سخت بور کیا ہے۔ میں ذرا آزاد طریقے سے کام کرنے کی عادی ہوں۔ یہاں روک ٹوک بڑی ہے۔ اس پڑا پوسر سے مت ملو، یہ ڈائریکٹر کا حکم ہوتا ہے۔ فلاں اخبار کو انٹرویو نہیں دینا۔ یہ راتر صاحب کا مشورہ ہے۔ یہ کرو، وہ نہ کرو۔ آئی ایم ٹیم آپ آل آف دیس۔ میرا کوئی ارادہ نہیں میری بی ڈی یہ کام کرنے کا۔“

”تو پھر تم کیا کرو گی؟“ وہ توجہ سے بولا۔

”کیوں۔۔۔ کیا میں کچھ اور نہیں کر سکتی۔ ٹھیک ہے میرے پاس کوئی بڑی ڈگری نہیں پھر جی اور بہت کام ہیں کرنے کو۔ میں فریڈیویشن ہوں پارلر چلا سکتی ہوں یا پھر ہسٹل۔ ایکٹریس یا ماڈل گرل کے نام پڑے تو یہ دونوں کام خوب چلتے ہیں۔ یا پھر میں۔۔۔“ اس نے بات ابھری چھوڑ کر شری نظروں سے اسے دیکھا۔

”یا پھر کیا؟“

”یا پھر میں شادی کر لوں گی۔“ شفق نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے رخ موز کر لیا۔
 ”کیا شادی؟ تم شادی کرو گی۔ یہ سب شہرت، اتنا گلیمر چھوڑ کر ارادہ بھی اتنی جلدی۔
 ”کیا بکا رہ گیا۔“ کیا کوئی چکر دو کر ہے؟“ سیف نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ اس کے مزاج کا کچھ پتا نہیں تھا۔

”میں تمہیں چکر باز نظر آتی ہوں۔“ جواباً وہ حسب توقع غم ہو گئی اور اس دن تو اس نے تن بدن میں آگ ہی لگ گئی اور وہ منتقلی ہوئی اس کے سر پہ جا پہنچی۔

”واٹ از دس؟“ اس نے اخبار سیف کے سامنے بٹھا۔ ایک فلمی ہفت روزہ کا فرنٹ پیج تھا۔ شفق کی تصویر کے نیچے ”بگل میں منگل“ کے گھٹا نکیش کے ساتھ ایک سنسنی خیز فیچر لکھا تھا۔ چنانچہ ناگنا میں آؤٹ ڈور ریڈرنگ کے دوران ایک فوری لائبر جرنلسٹ بھی ہمراہ تھا

جس نے وہاں پیش آئے اوتھہ کدوجہ ہانڈہ کے ساتھ دھواں دیتے اسکینڈل کی شکل دے دی تھی۔ سیف نے ابھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا اور اخبار اٹھا لیا۔

”رواں سہ ماہی کے مقبول ڈراما سیریل ”خوابوں کا جنگل“ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے والی ابھرتی ہوئی نئی اداکارہ اور جانی بچانی ماڈل گرل شفق اورٹی وی کے مشہور اداکار سیف زمان کے تعلقات آج کل نگار خانوں میں موضوع بحث بنے ہوئے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ نو عمر شفق خوبرو سیف کی شہرت، دولت اور وجاہت کے ہاتھوں دل پر محبت کا زخم کھا چکی ہے اور اب اپنی محبت کو پانے کے لیے انا سب کچھ سیف زمان کے قدموں پر چھار کرنے کو تیار ہے۔ یہی شہد کے مطابق بھانگا مانگا میں ریکارڈنگ کے دوران بیچ میں معمولی موج آ جانے کے باعث اداکارہ شفق نے شوٹنگ روک دی۔ اداکارہ سیف انہیں اپنے بازوؤں میں اٹھا کر دین میں لے گئے اور پھر ایک گھنٹے تک بندوین میں ان کی ”مرہم پٹی“ کرتے رہے۔“

سیف نے اطمینان سے اخبار کے کئی کٹورے کیے اور نرم لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔

”بیٹھو شفق۔“

”میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟“ اس نے سنی ان ہی کر کے پوچھا۔

”شہرت کی قیمت۔“ اس کے اطمینان میں ذرا فرق نہ آیا۔

”تمہیں یہ قیمت ادا کرنی ہے تو شوق سے کرو۔ میں مری نہیں جا رہی اس فضول شہرت کے لیے۔ اس اخبار والے سے تو میں نمٹ لوں گی۔“ وہ غصے میں چلی تو سیف اس کے پیچھے لپکا۔

”بات سنو شفق۔ تم بہت لوز نمپر لڑکی ہو۔ اب اخبار کے دفتر جا کر لڑو گی۔ تمہارا خیال ہے تمہاری دل آزاری کی معذرت کی جائے گی۔ نہیں آفس شفق ہرگز نہیں۔ تمہیں اس فیملی میں آئے جہد ہوا آٹھ دن ہوئے ہیں۔ میں نے کسی پراسرار ذکور صرف ان جرنلسٹس کی وجہ سے منہ کی بل کرتے دیکھا ہے۔ تم وہاں جا کے الٹا سیدھا پولو کی اگلے پختے کے اخبار میں اس سے مزید زیادہ نگین خبر لگے گی تمہارے متعلق۔“

”تمہارا مطلب ہے میں یہ بات بات پی جاؤں۔ ہاؤ کین آئی ڈو؟“

”یہ میں کیسے کر سکتی ہوں؟“

”وہی سی جیسے پہلے۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”کیا مطلب؟“ وہ بالکل نہ سمجھی۔

”پچھلے مہینے ایک خبر میں اس لڑکے۔ کیا نام ہے اس کا کچھ ذکر تھا جو تمہارے ساتھ

آتا تھا سیٹ پر۔“ اس نے بہم ہی بات کی۔ شفق نے ایک گہری سانس چھوڑی پھر ہلکی آواز میں بولی۔

”وہ بات کسی حد تک سچی تھی۔ وہ میرا دوست تھا مگر تم تو..... جو کام میں نے کیا ہی نہیں اس کا الزام اپنے سر کیسے لے لوں۔ میں ضرور جاؤں گی اس اخبار کے آفس۔“ وہ پھر سے جوش میں آگئی تو سیف زچ ہو کر بولا۔

”کیا کرو گی وہاں جا کر۔ اس؟ کیا کہو گی۔ تردید کرو گی۔ جاؤ شوق سے کرو۔ تمہاری تردید اسی سٹے پر پیچھے کی مگر جانتی ہو تردید کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ اسکینڈل کو ہوا دینا۔ یہاں تردید کا مطلب اور طرح لایا جاتا ہے۔ یا تو تم اس بات کو انکو رد یا پھر.....“ وہ کہتے کہتے رک گیا۔ ”یا پھر مجھے اجازت دو کہ میں اس بات کو چھ چھٹ کر دوں۔“

پہلے تو وہ ایک غائبہ سمجھ ہی نہ سکی اور جب سمجھی تو حسب عادت آپرے سے باہر ہو گئی۔

”تم..... تم سیلفش انسان..... بات سنو سیف زمان شفق نے ساری عمر دل کی مانی ہے چاہے گھانے میں رہی پھر بھی دماغ کے نفع بخش مشورے کبھی نہیں مانے۔ تم چاہتے ہو میں تصدیق کر کے اس بات کو چھ چھٹ کر دوں کہ میں تمہاری خود ساختہ وجاہت، نام نہاد دولت اور گھسی ہوئی شہرت کے لیے تم پر ڈرے ڈال رہی ہو۔“ اس نے مسخو بھرے لہجے میں پھنکارتے ہوئے فیر میں لکھی باتوں کا حوالہ دیا اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ بے چارہ سیف گھبرا گیا۔

”ہائی کاؤ شفق! میرا مطلب یہ نہیں تھا ایک تو تم پوری بات سن چکی ہو۔ یہ بڑا مسئلہ ہے تم سے بات کرتے وقت۔ ارے کہاں جا رہی ہو شفق سنو تو میں..... میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ اس نے جلدی جلدی کہا جیسے وہ چلی گئی تو پھر کبھی اس سے دل کی بات نہ کہہ سکے گا اور وہ واقعی رک گئی۔ حیرت سے گنگ اسے دیکھنے لگی۔

”شادی؟“ مجھ سے؟“

”ہاں شفق۔“ اس نے آگے بڑھ کے اس کے شانے تھام لیے۔ ”تم اپنی تمام تر خواہری، خود اعتمادی اور حساسیوں کے ساتھ پہلے ہی روز میرے دل میں اتر چکی تھیں۔ میں سیدھا مادہ ساندہ ہوں۔ ان افیئر ز اور اسکینڈلز کے پھندوں سے بچنا چاہتا تھا اس لیے تم سے دور رہا۔ پھر یہ بھی سوچا تھا تم ایک اسٹارگر آڈیٹ ہو۔ اس موقع پر جب تم پہ شہرت کے دروازے کھل رہے ہیں تم کیوں کر اپنے نام کے آگے میرا نام لگا کر گھر بیٹھو گی۔ مگر اس دن تمہارے خیالات سن کر میری ہمت بڑھی بلکہ کرو گی ناں مجھ سے شادی؟“

وہ اسے دیکھنے چلی گئی۔ شادی..... اس کی ساتھوں کے لیے اس کے احساسات کے لیے کتنا نا مانوس سافلت تھا مگر صرف ایک بار سنتے ہی کتنا عجیب سا احساس جاگ اٹھا ہے دل میں۔ اس کے ہند بھرے سینے میں سیف کی محبت مشعل ہاتھ میں لیے راستہ بنانے لگی۔ سرد نیلی رگوں میں عشق آتش بن کر دوڑنے لگا۔ آس پاس کہیں اجنبی، گلاب اور ہندی کی خوشبو چھانے لگی۔ قہقہے سرگوشیاں، شہنائیاں اور پھر تخیلی قلعاریاں۔ ایک ہی ہل میں شوق نے ایک جہاں بھر دیا اور اپنا ہاتھ سیف کی کلائی پر رکھ کے دو نمونے سے آسودہ کر دیے۔

”تھیک یا تھینک؟ تھیک یو سوچ۔“ چلو میرے ساتھ ابھی اسی وقت چلتے ہیں ایڈیٹر کے پاس۔“

کونج و پھرتی ڈاروں ○ 63

کے وضاحت کی۔“ آؤ سہیل! کھڑی کیوں ہو اب تک۔ اس سے ملی تم..... یہ لیسن ہے سیدہ زہرہ شاہ پچھلے جیسے کوئی جعفر سے اس کا نکاح ہوا۔“

”شاہ جی سے۔“ اس نے ایک بار پھر تصدیق جانے کے لیے کبھل الفاظ ادا کیے۔ (ہوسکتا ہے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔ خالد اماں نے کچھ اور کہا ہو۔) مگر اس کی یہ امید ہی دم توڑ گئی۔

”ہاں جینا! اچھے سے اس کی تنہائی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اور پھر جواب اس نے خود مجھ سے کہا کہ اس گھر کو چلانے اور بٹول کی اچھی تربیت کے لیے ایک پڑوسی لکھی ہوئی عورت باکزیو ہے۔ اس نے ہائی بھری تو میں نے بھی موقع گنوا مناسب نہ سمجھا اور ملتان اپنے دایرہ کی جینی پسند کر آئی۔ اصل نسل سیدہ زادی۔“ انہوں نے آخری الفاظ ڈرا زور دے کے کہے مگر اس کے باوجود سہیل کا ذہن تو ان کے اس جیسے میں اٹک گیا۔“ اس نے خود مجھ سے کہا..... اس نے خود مجھ سے کہا..... اس نے خود.....“

”شاہ جی نے خود کہا کہ وہ..... مگر انہوں نے مجھ سے تو کچھ اور کہا تھا۔“ اس کی حسرتیں باقوں میں کنگول لیے سوال بن کے دل کے آگے صدا لگنے لگیں۔

خالد اماں نے گھٹوں پہ ہاتھ رکھ کر اٹھنے کا ارادہ کیا۔ ”میں بچوں کو بلا کے لاتی ہوں۔“

”رہنے دیجیے خالد اماں۔ میں تو دراصل یہ کہنے آئی تھی کہ میں مزید کچھ دن نہیں پڑھا سکوں گی۔“

”کیوں جینا خیریت؟“

”وہ..... میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ پھر ایگزامز بھی شروع ہونے والے ہیں۔“ اس نے بات بنائی۔

”کیا ہوا طبیعت کو؟“ ہاں میں بھی کہوں رنگت زرد پڑی ہے بیٹی کی۔ آواز بھی کپکپا رہی ہے۔“ انہوں نے اب غور سے سہیل کو دیکھا تو وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا جی خدا حافظ! میں جلتی ہوں۔“ وہ جلدی سے باہر نکل پڑی۔ اس کا رخ مال روڈ کی جانب تھا۔

”سید جعفر علی شاہ“ کی نیم پلیٹ کے آگے وہ کھڑی۔ دروازے کے پینڈل پہ ہاتھ رکھے وہ کچھ دیر اندازہ لگاتی رہی کہ اندر شاہ جی کے علاوہ کوئی اور بھی ہے یا نہیں۔ پھر عمل خاموشی کا احساس پا کر وہ اندر داخل ہو گئی۔ شاہ جی جانے نماز پہ بیٹھے سلام پھیر رہے تھے۔ (نہیں نہیں جو شخص نماز قضا نہ کر سکے وہ کسی کادل کی تھکا کر سکتا ہے۔ فار جوزف کہتے ہیں

☆=====☆

وصال و بجر کے اس بے یقین صحرا میں
سہیل کو کوئی موسم برا نہیں ہوتا
سہیل کا منہ کھولے بیٹھی رہ گئی۔ کیسے، کیوں؟ مگر کیوں؟ اس کے ذہن میں اس ایک لفظ کی تکرار ہونے لگی۔

”سہیل! میں شادی نہیں کر سکتا۔“

”میری جوان بیٹی..... میرے باشعور ہوتے بچے..... میری بڑھتی عمر۔“

سید جعفر علی شاہ کے الفاظ، ان کے دلائل اس کے ذہن میں دستک دینے لگتے اور وہ بے یقینی سے سامنے بیٹھی حسین باوقار مگر کم عمر لڑکی کو دیکھنے لگی جو خود کو مسز جعفر شاہ کہتے ہوئے اس کی آمد کا مقصد پوچھ رہی تھی۔

”جینا یہ حسن اور حسن کی بیوہ ہے۔ جھپٹی پہ سیا لکھت گئی ہوئی تھی۔“ خالد اماں نے آ

وہ ناگواری سے ناک چڑھا کے بولی۔ ”مجھے فخر ہے..... میرا مطلب ہے فخر کہاں ہے؟“ اس کے سوال پہ انسپٹر کے ساتھ ساتھ وہ ادھیڑ عمر آدمی بھی چونک گیا۔

”کیا کام ہے آپ کو فخر؟ رشتہ دار ہو اس کی؟ کیسے جانتی ہو؟“ دو تین اور آدمی اس کی جانب بڑھے دو ہڑبڑکے دو قدم پیچھے ہٹی۔

”جی وہ دم..... میں نے آ..... آرزو دیا تھا ایک پینٹنگ کے لیے..... فریم کروانے دی تھی۔“ اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بات بنائی۔

”اوہو! بی بی کوئی ایڈوائس وغیرہ تو نہیں دے دیا تھا اسے۔“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے جلدی سے ہاں میں سر ہلاتے تھے۔

”چلو جی کل ای ملک گئی۔ اور کوئی بندہ باقی ہے اس شہر میں جس کو اس نے بخشا ہو۔“ انسپٹر نے پیچھے مڑ کے باقی لوگوں سے کہا۔ رونا میل کی ناگوں میں پکیا پٹ سی ہونے لگی۔

اس نے دیوار کا سہارا لیا۔ اس کے ذہن میں جس قسم کے دوسرے آ رہے تھے وہ انہیں جھٹانا چاہتی تھی۔ (کاش، کاش وقت ختم جائے اس آگے کچھ نہ سن سکوں۔ میں کچھ نہیں جانتا چاہتی۔ کچھ نہیں سنا چاہتی۔ اے کاش! یہ سب خواب ہو اور..... اور ابھی میری آنکھ کھل جائے۔) اس نے سردیوار سے لگے آنکھیں موند لیں مگر اگلے ہی لمحے سمنائے کانوں میں اسی ادھیڑ عمر آدمی کی آواز نکلنے سے دوبارہ کھول لیں۔

”کوئی رسید وغیرہ ہے آپ کے پاس یا یونہی رقم تھما دی تھی۔“ اس نے سوال کیا مگر رونا میل کے چپ چاپ کرکڑکھینچے رہنے پہ دوبارہ بولا۔

”بٹا! میں مالک ہوں اس دکان کا۔ چار پانچ مہینے ہوئے اس لڑکے کو سٹور مین رکھے ہوئے مشکل سے تو بڑا اسکین اور پیرا لگتا تھا پھر حد ہے غیرتی اور بددیانتی کی۔ ڈیک، بی بی، نیلی فون سیٹ، چار فنیٹی وال کلاک، 12 راڈو کی رسٹ واچز، ولاپتے پر فیوز، دکان میں پڑے گیارہ بارہ ہزار روپے سب سیٹ کے لے گیا۔ ارگرد کی دکان والوں پہ پھر ورسہ جتا کے یمنی بھی ڈال لی تھئے..... اور 50 ہزار ان کے بھی اڑا کے لے گیا۔ اس کے علاوہ بھی پتا نہیں کون کون آ رہا ہے کل سے۔ کسی کا دو ہزار، کسی کا تین ہزار دینا ہے اس نے..... آپ کا کتنا نقصان ہوا ہے بی بی۔“

”میرا نقصان۔“ اس نے نقصان کا دل ہی دل میں حساب لگایا۔ دھڑکتا ہوا دل، نو عمر خواب، اہل بھروسہ، اہمول وفا، بے پناہ محبت اور لاتعداد آرزوئیں۔ وہ تو بالکل ہی خالی ہاتھ رہ گئی تھی۔ رونا میل اپنے سر کھونکے وجود کے ساتھ ڈھسے گئی۔

حسب نسب کا۔ جسے ٹھیک طرح سے یہ بھی نہیں معلوم کہ میری ماں نے میرے باپ سے واقعی شادی کی بھی تھی یا نہیں۔ ہاں میں تو یہ بھی یاد نہیں رکھ پائی کہ میری ماں آج کل جس شخص کے ساتھ رہ رہی ہے وہ اس کا نچوڑا شوہر ہے یا سہاواں۔ ہے بھی یا نہیں، لیکن میری ماں میرا باپ میری پچکان نہیں ہے۔ صرف میری ماں کی بدکرداری میرے ماتھے کا داغ کیوں بنے میری اپنی پاکیزگی کا نور میری پیشانی پہ آپ کو کیوں نظر نہیں آتا۔ میری ذات میرا کردار ہی حوالہ ہے میرا اور میری پچکان اینڈ مائٹڈ یونیٹڈ جعفر علی شاہ کہ میرا وجود اور میری روح اتنی ہی پاک ہے جتنی آپ کی سات پردوں میں پلنے والی سید زادی بتول کی۔“

”شٹ آپ سیکھا کہ یہ میرا آفس ہے تم یہاں اتنی بلند آواز میں میری جی کا نام نہیں لے سکتیں اور تم..... تم..... تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم اپنا مواز نہ میری جی سے کرو۔“ جعفر شاہ غصے سے کھڑے ہو گئے اور اسے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

”آپ سمجھتے ہیں کہ شرافت، پاکیزگی اور عزت پہ آپ کی بہنوں اور بیٹیوں کی اتھارٹی ہے۔ غنٹ صرف آپ کے گھرانے کی میراث ہے۔ نہیں شائیں۔ میں پاک پیدا ہوئی تھی اور پاک ہی مروں گی۔ میں بٹول فاطمہ نہیں ہوں میں زہرہ شاہ بھی نہ بن سکی۔ مگر میں مریم ہوں اور مریم ہی ہوں گی۔“ وہ آفس کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی سے بھی ہمیشہ ہمیش کے لیے نکل گئی۔

☆=====☆

رونا میل نے گاڑی پارک لٹ میں کھڑی کی اور تیر تیر قدموں سے ”گفت لینڈ“ کی جانب بڑھنے لگی۔ پچھلے دس بارہ روز سے شائلی کی شادی کے سلسلے میں وہ اتنی مصروف رہی کہ فخر کو بھی فون نہ کر سکی۔ اب کچھ فراغت ہوئی تو اس کا دل اسے دیکھنے کو چھلنے لگا اور وہ فون کیے بغیر سیدھی اس کے پاس پہنچ گئی۔ مگر گفت لینڈ کے آگے اس کے قدم ایک دم سے رک گئے۔ اندر غیر معمولی چہل پہل تھی۔ گہرے شیشوں میں سے اسے صاف اندازہ نہ ہو سکا تو کچھ سوچ کے وہ اندر داخل ہوئی۔ مگر اندر کا منظر دیکھ کے گھبرا اٹھی۔

”پولیس؟“ وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہیں کھڑی کی کھڑی رہی۔

”جی بی بی! آپ کو کیا کام ہے؟“ ایک ادھیڑ عمر فربہ آدمی اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ وہ بے حد حیران تھی۔

”کارروائی ہو رہی ہے بی بی۔ آپ اپنی آمد کا مقصد بتائیں۔“ انسپٹر نے آگے بڑھ کر اس کے گڑیا سے وجود کو اوپر سے نیچے تک بغور دیکھتے ہوئے کمرے کے لچھے میں کہا۔

”اوئے سنبھالو ایمر! لگتا ہے بی بی کا زیادہ ہی نقصان ہوا ہے۔“ کئی ہاتھ اسے سہارا دینے آگے بڑھے۔

”حوصلہ بی بی حوصلہ۔ ملزم آج نہیں تو کل پکڑا جائے گا۔ سارا نقصان اس سے پورا کروالیں گے۔“

(جو میں نے کھو یا ہے وہ واپس نہیں ملے والا) رومائیل نے لب کاٹتے ہوئے سوچا اور کمال ضبط کے ساتھ اپنے قدموں پہ دوبارہ کھڑی ہو گئی۔

مجھ کو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی
وہ اس طرح کہ تجھ پہ بھروسہ بلا کا تھا

☆=====☆

”تم پاگل ہو گئی ہو بغیر کسی محنت اور تنگ دود کے ملنے والی شہرت کو بلا وجہ ٹھکرا کے ناشکری کا ثبوت دے رہی ہو۔ جبکہ کوڈیکو، چھلے تین سالوں سے لیے لیے پھیر رہی ہوں۔ اب کہیں جا کے اتنی شناخت ملی ہے اسے کہ کوئی پروڈیوسر بیڈنگ رول میں کاسٹ کرنے کا رسک لے سکتا ہے اور ایک تم ہو شخص۔“ بی بی سیریل میں اتنا اچھا رول، اتنی شہرت۔ چلو فلموں میں تم نہیں جانا جاتی نہ کسی میں نہ کب اصرار کیا لیکن یوں بنانا کیا کیڑے تو خراب نہ کرو۔ کوئٹہ سے آئی آخر تم نے ری جیکٹ کر دی۔“ انا صاحب نے خوار خواہ جھگڑا مول لیا اور اب اس فلفلے کیڑے کے جھانسون میں آکر۔۔۔

”فلیمنگو کچ پیلیز! آپ سیف کے لیے اتنے روز Words استعمال نہیں کر سکتی۔“ وہ جو اب تک خاصہ صبر و تحمل کے ساتھ ماں کا لیکچر سن رہی تھی خت لے بی بی۔

”تو اور کیا ہوں بڑ ہانی نہیں پیرا اشارہ کو۔ خود تو کچھ نہ نہ کا تمہیں نہ جانے کیا کیا سبز باغ دکھا رکھے ہیں۔“

”مجھے سبز باغوں کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ فطرت پر ایک جھٹ کی خواہش ہے کہ اب دھوپ کی تیش سے میرے جسم کے ساتھ ساتھ میری روح تک جھلنے لگی ہے۔“

”فضول کا فلفلہ۔۔۔ سیٹ تک رکھ کے آیا کرو اپنے یہ ڈائلاگ۔۔۔“ ماں کو اس کا یاسیت بھرا الجھڑا نہ بھایا۔ ”پوسے کی بو بو جٹا چاتی ہو۔ نو بہرہ، نو سوچو ہے کھا ہے۔۔۔“

”جسٹ شاپ اٹ۔ آئی کائنات انڈر سٹینڈنگ ہاؤس کی قسم قسم سے تعلق ہے تمہارا۔“ وہ غصے میں سارے ادب کو غلط بھول گئی۔ ”اپنی اصلیت کھل کے کیوں نہیں دکھاتی تم۔ اتار دو یہ آرت اور بلرل ازم کا ٹیکل خود سے اور خرید لو کوئی کوشا۔ ختم کر دو یہ ماں جینی کا جھوٹا ڈراما۔ آؤ میں

کے دھندہ کرتے ہیں۔ بولو پھر شٹر پاپ کا م روگی۔“ وہ شدید غصے میں ہڈیاں پکینے لگی۔
”ٹھٹ اپ، کیا تم اپنے حواسوں میں ہو؟“ شفق کے منہ پر ایک چمپڑ پڑا مگر وہ چپ نہ ہوئی۔

”میں تمہاری خریدی ہوئی لونڈی نہیں ہوں جو ساری عمر اپنا خون جلا کے تمہاری زندگی کے دینے روشن کرتی رہوں۔ عزت کی روٹی کھاتی اتنی ہی مشکل لگتی ہے تو خود نکلو باہر۔ عمر کے اتنے سکے تو باقی ہیں ابھی کہ کچھ سال اور کیش ہو سکیں۔ میں جاری ہوں یہاں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“ وہ پیچھے مڑ کے دیکھے بغیر گھر سے نکل آئی۔

”مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ کوئی طلب نہیں سیف کے سوا۔ وہ جو کہے گا میں مان لوں گی۔ اس نے تمہا کہا کہ اس کے گھر والے رواجی فکر کے لوگ ہیں۔ میں خود کو بدل لوں گی۔ سرتاپا بدل لوں گی۔ میں سب کچھ کروں گی سیف کے لیے۔ اگر یہ جو ہے تو جوابی سہی۔ مگر میرے پاس کھیلنے کوئی کابو نہیں تم میرا آخری سہارا ہو سیف۔ مجھے سیٹ لو صرف اتنی زمین دے دو جس چ میں اپنے پیر مضبوطی سے جمالوں۔ بس اتنی ہی جھٹ دے دو کہ میرے سر پہ چھاؤں رہے بے ٹنگ قطرہ قطرہ محبت دیتے رہنا۔ میں تمہارے پیر کی جوتی بن کے بھی رہ لوں گی سیف زمان۔“ اس نے آخری حد تک جاتے ہوئے سوچا۔

”میں غلط ثابت کر دوں گی کہ روشنیوں کی چکا چوند میں رہنے والی لڑکیاں چار دیواری کی پُرسکون چاندنی میں رہ نہیں پا سکتیں۔ شمع محفل چراغ خانہ نہیں بن سکتی۔ میں کروں گی یہ۔۔۔۔۔ سب کو دکھا دوں گی۔“ دل ہی دل میں عہد کرتی ہوئی وہ ٹی۔ وی انکیشن پہنچی۔

”اب وہ بلا میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے کہ شادی کر لو۔“ یہ سیف کا استہزاء یہ انداز تھا۔ وہ ٹھٹک کے درد اڑے پی پی لگ گئی۔

”بڑا برا پھنسا یا آپ نے ڈائریکٹر صاحب۔“ وہ پھر بلا۔
”بھئی تو تم نے لا رارا دیا تھا شادی کا سے بھی تو پیچھے پڑی ہے۔ یہ تو میرا مشورہ نہیں تھا۔“ ڈائریکٹر کی آواز آئی۔

”لیکن بغیر شادی کا لالچ دینے وہ قابو میں آنے والی بھی تو نہیں تھی اور اسے قابو میں کرنے کا مشورہ تو آپ کا ہی تھا۔“ سیف نے جواب دیا۔ ”مجھے کوئی لڑکیوں کی کمی پڑی ہوئی تھی۔ آپ کا بی آئیڈیا تھا کہ سیریل نرم جاری ہے ہاٹ کرنے کے لیے کوئی مارگرما اسکینڈل ہونا چاہیے سیریل کے حوالے سے تم شفق کو لائیں بے آؤ ذرا کھلے دھم کے فوٹو شیشن کرواؤ۔ شہرے گھومو پھر دو۔ خوب خبریں وغیرہ لگیں گی اخباروں میں رسالوں میں۔ اسے تو

میں لائن پہ لے آیا شادی کا دانہ ڈال کے۔ خیریں بھی لگ گئیں ایکسٹرنل بھی پورے ملک میں پھیل گیا مگر اب جو میری منگنی خطرے میں ہے اس کا کیا ہوگا۔“
 ”تو بھائی مجھے تو تمہارے اس سارے کھیمڑے کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ڈراما تو پھر بھی بڑی بری طرح فلاپ ہوا ہے۔ اب تو ٹرانسفر آرڈر آئے ہی آئے۔ لے کے پھینک دیں گے کوئی یا اسلام آباد کہ جاؤ وہاں کے قدرتی مناظر پہ ڈاکومنٹری بنانا۔ اور جو مزہ لاہور اور کراچی سینئرز میں مددروں اور نازنیوں کے پیچھے چنے کے ”ڈورائے“ کرنے کا ہے وہ دکھاؤ پھاڑوں اور ندی نالوں کی تصویریں بنانے میں کہاں۔“ ڈاکٹر کینئر نے اپنا دروازہ دیا۔

”سر آپ کو اپنی بڑی ہوئی ہے۔ مجھے بتائیں کیا کروں وہ تو جان کھا رہی ہے کھل شادی کرلو۔ آج کرلو۔ ویسے تو جان چھڑا نا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ایسے ہزاروں کیس نمنہ چکا ہوں لیکن معاملہ پریس میں آچکا ہے آپ کی کرم نوازی سے اب جو جس نے ذرا بھی چوں چاں کی تو وہ ہنگامہ مکڑا کر دے گی۔ آپ جانتے ہیں کیسی فتنہ ہے۔ اخبار والوں کو یوں بھی موضوع چاہیے فوراً مجھے صدمہ برپا کرنا اور اسے سنی ساوتری بنائے پیش کر دیں گے۔ نام تو میرا ہی خراب ہوگا۔ ابھی تک ہر قسم سے بچ نکلا ہوں بس یہاں آ کے ساری ری پویشن خطرے میں جاتی نظر آتی ہے۔ سیریلز! کچھ کریں کوئی تل تا میں میری منگنی نوٹ جانے گی۔“
 ”تو نوٹے دو صبا۔ ابھی تو تم نے کہا تھا کہ تمہیں لڑکیوں کی کمی نہیں۔“

”وہ تو پیش مستی کے لیے کہا تھا۔۔۔ مگر بساے والی لڑکیوں کی تو ابھی خاصی کمی ہے آج کل۔“ اس کے زوردار قہقہے میں ڈاکٹر کینئر نے بھی ساتھ دیا۔

”پھر ایک اور بات بھی ہے۔“ سیف نے راز داری سے بتایا۔ ”اکھوتی ہے۔ چلو مربے پلازہ نہ کسی گمراہ عاتنی کمال کی ٹوٹی۔ چو: کاٹوں کا بھی اپنا ہی چارم ہے۔“
 ”تو اس کے لیے شوق کون سا رہی ہے۔ اسی دو نکوئیں تو وہ تمہیں ایک سال میں بنا دے گی۔ کرلو شادی یا۔۔۔ فائدے میں رہو گے۔ سونے کے انڈے دینے والی مرثی ہے۔ عمر ابھی بھی کم ہے۔ کوئی دس سال تک تو آرام سے چل جائے گی فلموں، ڈراموں میں۔“

”چلو یہ بھی ہوتا تو کچھ سوچا جا سکتا تھا لیکن سرتی وہ تو میرے سر پہ چڑھ کے بیٹھنا چاہتی ہے۔ مفت کی کھانا چاہتی ہے۔ میرا دماغ خراب ہے کہ میں۔۔۔ اس کی بات اندھوری رہ گئی کیونکہ شوق اچا تک ہی اندر داخل ہو گئی۔

”تنت۔۔۔ تم۔۔۔ شوق۔۔۔“ وہ گھبراہٹ میں خواہ مخواہ ہتھی نکالے کھڑا ہو گیا۔ شوق کے جسم پہ لڑوہ طاری تھا بہت مشکل سے اس نے چند کھانے کا فاصلہ طے کیا۔ سیف

مقابل کھڑی ہو گئی۔ ڈاکٹر کینئر بھی گھبرا کے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ شوق کی طبیعت سے وہ بھی واقف تھا اس لیے ”نقص امن کے اندیشے“ کے پیش نظر اس نے جلدی سے گھنٹی بجا دی۔
 ”میں صرف یہ دیکھنے کی تھی کہ“ وہ کمزور لہجے میں بولی۔ ”کہ یہ تم ہی ہو۔“ اس نے ایک بھر پور زہریلی نظر اس پہ ڈالی اور پلٹ گئی۔ دروازے کے بند ہونے کی زوردار آواز کے ساتھ ہی سیف کے حواس ٹھکانے آئے۔ وہ جس طوفان سے سہا کھڑا تھا وہ چپ چاپ اپنے دکھا اپنی ہی لہروں میں بہا تا ہوا نکل گیا تھا۔ ”تھینکس مائی لارڈ، بلاٹل گئی۔“ اس نے طمانیت بھرا سانس خارج کیا۔

☆=====☆

”کوٹوے کے ڈھیر سے دو شیڑے کی نقش برآمد۔“

14 دسمبر کے اخبارات کے فرہنگ پیج پہ فیروزا رشیدی کا ادھ کھلی حیران آنکھوں والی تصویر کے ساتھ شائع ہونے والی یہ خبر سارا دن لوگوں کی بحث کا موضوع بنی رہی۔

”واقعہ نگار خصوصی کے مطابق آج صبح پانچ بجے شہر کے باروق علاقے میں کوٹوے کے ڈھیر سے ایک خوبصورت جوان سالہ دو شیڑے کی نیم برہنہ لاش برآمد ہوئی۔ دو شیڑے سفید یونیفارم میں ملبوس تھی اور اس کے بیگ سے چند کتابوں کے علاوہ ایک نکاح نامہ بھی برآمد ہوا ہے جس کے مطابق 11 دسمبر کو کسی فیروزا رشید کا نکاح کسی صوبی سلطان نانی شخص سے قرار پایا۔ بتایا جاتا ہے کہ فیروزا رشید اسی دو شیڑے کا نام تھا۔ وہ مقامی کالج میں بی۔ اے کی طالبہ تھی اور اس کی شہرت ٹھیک نہیں جاتی جاتی۔ نکاح نامے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں فریقین نے یہ نکاح اپنے گھر والوں کی غیر موجودگی میں کیا ہے۔ ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق فیروزا رشید اجتماعی زیادتی کا شکار ہوئی ہے البتہ یہ بتائیں لگایا جا سکا کہ اس کی موت اجتماعی زیادتی کے نتیجے میں واقع ہوئی ہے یا اسے قتل کیا گیا ہے۔ پولیس اس بات کا بھی امکان ظاہر کر رہی ہے کہ اس نے اس حادثے سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی ہے۔“

اور یوں وہ گلاب کی بند کھڑکی جو جینے کی آرزو میں کانٹوں سے لپٹی تار تار دامن کے ساتھ بے نقاب ہو گئی۔

☆=====☆

”اور کہیں کہیں کسی کسی کو کچھ نہ پھل ہی جاتا ہے۔“

روشن، خشک اور قدرے ہنرمند کمرے میں اسے پھیلے ہوئے ہاتھوں پہ گیلی ملبندی کے شریکس کو محسوس کرتے ہوئے میں نے سوچا۔ جھجک جھجک کرتے کمرے میں ممان

خواتین کی ملی جلی پروٹیوس، جگہ جگہ کھلی ہوئی کاسٹیکس، ویکس اور ہینر اسپرے کی خوشبو یا ت کمرے میں جس کا سماں پیدا کر دیا تھا جب کہ برکس اس کے میرے دل میں آج ٹھنڈی ٹھنڈی معطر ہوائیں چل رہی تھیں۔ وجود کیسا سبک سا ہو رہا تھا۔ پلٹیں بوجھل، سن شانت، وجود سرد و غرض عجیب سی کیفیت تھی۔

”ایلیشار ڈراسی گردن کو اوپر کرو۔ ہاں ایسے ریلیکس فیل کرو۔“ شفق کی آواز پہ میں نے چونک کے اسے دیکھا۔ وہ میرے چہرے پہ مسان کر رہی تھی۔ اس کی لالہ آنسوئی زرد انگلیاں ایک تواتر کے ساتھ میرے دل کش نقوش پہ طبع آزمائی کر رہی تھیں۔ اس نے مجھے دیکھ کے سکرانے کی کوشش کی۔ ایک بڑی ہی پی ٹی ملی کاروباری سی سکرانہٹ۔

ہاں وہ دوستانہ نہ مگر انہیں تو اب خواب و خیال ہو گئیں۔

کچھ فاصلے پہ رکھے صوفے پہ بے نیاز انداز میں بیٹھی رومائید اپنے ہاتھوں میں پڑے جڑاؤنگٹن سے کھیل رہی تھی۔ مجھے اپنی جانب متوجہ پا کے اس نے نظر اٹھائی اور میکا کی انداز میں ایک سکرانہٹ اس کے لبوں پہ بھی آئی۔

رہی می سکرانہٹ۔

خالص دنیا دار قسم کی سکرانہٹ۔

سیکا!

میں نے رخ موڑ کے اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ سفید گاڈن میں میوں میری تین سالہ بھانجی فردا کو گود میں لیے بار کر رہی تھی۔ اس کے سلونے چہرے پہ تقدس، ماتا اور سکون کی پرچھائیاں نمایاں تھیں۔ میں ایک تک اسے دیکھنے لگی۔ چلتی ہوئی فردا کو گود سے اتار تے ہوئے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ مسکرا دی۔

ایک اور مسکراہٹ۔

دعا یہ مسکراہٹ۔

میں نے کمرے میں فیروز کو ڈھونڈنا چاہا مگر آہ۔ فیروز کا کاش تم ہوتیں۔ میں جانتی ہوں کہ دوستانہ مسکراہٹ تمہارا سکرانہٹ بھی نہ آتی میرے لیے لیکن ہمارے تمہارے ہرے پہ کوئی کاروباری باری سکرانہٹ بھی نہ ہوتی۔ تم متناقی نہ تھیں۔ تم نے بڑے آرام سے مجھے ”ٹٹے منڈ“ کہہ کر دھکار دینا تھا۔ تم نے ہی تو جیگر باری کہہ کر اٹھایا تھا کہ ہم پانچوں ”بھانٹ بھانٹ“ کی لڑکیوں کا ایک گھاٹ پہاڑھے ہونے کا سبب کیا ہے اور پھر تم نے خود ہی اسے سمجھایا بھی تھا کہ ہمارے مزاج اگ سکی، طبیعت جداسکی، حالات مختلف سہی مگر جذبے

ساتجے ہیں۔ ہم سب تم سے متعلق ہو گئیں۔ پھر وقت نے یہ ثابت بھی کر دیا۔

ہماری بختیں ساٹھی تھیں خواب ساتجے تھے کہ ہماری آنکھیں ایک ہی رات میں تو خوابوں کے ڈانکے سے آٹھابوئیں تھیں اور ہماری..... نہیں ہماری نہیں..... صرف تمہاری بختیں اجڑی بھی تو آکھنے ہی۔ تمہارے درو بھی تو ساتجے ہیں۔ یہاں میں الگ ہو گئی تم سے میری سکھو۔ مگر اس میں میری کوئی خطا نہیں پھر تمہیں نے مجھے خود سے الگ کیوں سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ میں نے شاک نظرہوں سے انجان میں بیٹھی رومائید اور سیریکو کو دیکھا۔

”پلیز اھر اوھر مت دیکھو پھل ہوم ہو رہی ہے۔“ شفق نے میرا سر پکڑ کے سیدھا کیا لیکن اس کے اس انداز میں بھی تکلف تھا۔

پہلے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی تھا مگر جب سے میری شادی کی تاریخ ٹھہری تھی وہ تینوں مجھ سے یوں کٹنے لگی تھیں۔ اب بھی شادی شفق مجھ سے مخاطب تک نہ ہونا چاہ رہی تھی مگر یہ اس کی جانب تھی کہ وہ بار بار تکلفاً نہ انداز میں بھی میرے بالوں میں رولز لگا رہی تھی تو کبھی بازوؤں کو ویکسنگ کے بعد سہلا رہی تھی اور کبھی چہرے پہ فیشن کر رہی تھی اور میں..... میں اس کے ابھنی لمس میں وہ محبت بھری ٹھنڈک ڈھونڈتی رہ گئی جو اس کی شعل صغیرہ شخصیت کا خاصہ تھی۔ شعل اور ٹھنڈک..... کچھ عجیب سا ملا ہے دونوں میں اور اس نے بھی عجیب بات یہ کہ ان دونوں کو ہی شفق سے نسبت تھی۔ وہ میرے چہرے پہ بھی میری آئی بروز کو شیب دیتے ہیں

مصرف تھی اس لیے میں بڑی آزادی کے ساتھ اس کے چہرے کو پڑھ سکتی تھی، کھون سکتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں پہ آج بھی مصنوعی پلکیں سایہ کیے بہت کچھ چھپائے ہوئے ہیں۔ ڈارک بروز آئی سفید اور کسٹلیا آئی لائزر آج بھی پہلے کی طرح سچا تھا مگر وہ جبک غائب تھی جو اس کی عامی آنکھوں کو خاص بنا دیا کرتی تھی۔ کمان دار بیٹھوئیں بھی جھک گئی تھیں۔ باریک

ہونٹ ہمیشہ کی طرح ہاٹ ریڈ اپ اسٹک کی موٹی تھوں کے پیچھے چھپے تھے بلکہ آج تو ان کی سرفی پہلے سے دگنی تھی مگر اس کے اپنے وجود سے سرفی تو کیا سفیدی تک غائب تھی۔ دہلی پتلی تو وہ پہلے ہی تھی اب تو یوں لگتا تھا جیسے کبھی بھر ہڈیوں کے ڈھانچے پہ زرد کھال منڈھ کے اسے مصنوعی چمکیلے رنگوں سے سجا دیا گیا ہو۔ وہ میری نظروں سے کچھ بے چینی سی محسوس کرنے لگی۔

اپنی ہیلز لڑکی کو اس نے نیوزر پکڑ لیا اور خود میرے پیچھے کھڑی ہو کر گیلی روٹی سے میرا چہرہ چھپوٹیا نہ لگی۔ میں نے سر کر کے کی پشٹ سے لگایا اور اس کے بارے میں سوچنے لگی۔ یہ میں ہی ہوں شفق ناز، جس کے کانڈھے پہ سر کدھرے تم بلک بلک کے روئی تھیں اور اپنی ہلکت کا اعتراف کیا تھا۔ مجھے آج بھی تمہاری وہ کراہٹ یاد ہے۔

”الیشاع میں باگدنی۔ میں نے اپنا نام بچا شہرت کے لیے۔ اپنی صورت نیچی پیسوں کے لیے گرد دیکھ دوست آج میں محبت کے نام پر پوری کی پوری بک گئی۔ بے مول بک گئی۔ نیلام ہو گئی اور..... اور میں کچھ کر بھی نہ سکی۔ مجھے نیلام کرنے والا میرے سامنے کھڑا بارود میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ میں اسے کچھ بھی نہ سکی۔ ترپٹین کر دی الیشاع میں اسے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔“ اور میں اس کی آنسو بھری آنکھیں چوتے ہوئے سوچتی تھی کہ کیا شوق نے اس ذلیل شخص کو واقعی کچھ نہیں کیا۔ وہ شیرینی لڑی جوانی جانب اٹخنے والی انگلیاں توڑ دیا کرتی تھی۔ اپنے وجود کو تار تار کر دینے والے ہاتھ کو جھٹک تک نہ سکی اور پھر سدا کی بہادر شوق اس دن سے اور خصوصاً فی ریا کی موت کے بعد سے مستقل ڈری ڈری اور سبھی سبھی لگنے لگی۔ اس نے شو برنس مکمل طور پر چھوڑ دیا تھا۔ اب شہر کے مشہور بیونی پارلر میں کام کر رہی تھی اور ورلنگ وومن ہاسٹل میں رہتی تھی۔ شوق ہاتھ میں فاؤنڈیشن لیے پھرے میرے سامنے آ موجود ہوئی اسی نیچی لمبی کاروباری سی سکرابٹ کے ساتھ۔

میں نے چڑ کے نظریں پھیر لیں۔ سیکرٹ ہاتھ میں کوئی مذہبی کتاب لیے ساکت بیٹھی تھی صرف اس کے سپید بل حرکت کر رہے تھے۔ اس نے سر میں بنے گا جو عہد کیا تھا اسے بھاری تھی۔ اب اس کی رہائش کی تحریک چرچ میں ہے جہاں وہ نہ بننے کی تربیت حاصل کر رہی ہے شاید اس طرح وہ خود پہ لگے ان دھوں کو دھوا چا پتی ہے جو اس کی ماں نے اپنی بے راہ روی سے اس کی معصوم ذات کو دینے چاہتے تھے۔ دنیا اور اس کے جمیلوں سے الگ تھلگ تو وہ پہلے ہی رہتی تھی اب تو جیسے کٹ کے رہ گئی۔ میرے کتے اصرار پر وہ ہنسنے لگی شادی والے دن ایک گھنٹے کے لیے آنے پر راضی ہوئی تھی اور اب پچھلے 35 منٹ سے اسی کمرے میں لاٹھلی سی بیٹھی تھی۔ اس نے آنے کے بعد میرا ادھال پونچنے کے بعد دوبارہ مخاطب نہ کیا تھا لیکن وہ آگئی تھی یہی بہت تھا میرے لیے۔ بے شک میرا دل رکھنے کو، میرا مان بڑھانے کو یا پھر شاید میرے بے حد اصرار سے تنگ آ کر مگر وہ آتی تو تھی جب کہ شوق اور دوما نیکہ دونوں نے میری شادی میں شرکت تو کی ہے مگر میرے لیے نہیں..... میں نے ماسے بطور خاص اسی بیونی پارلر کے لیے کہا تھا جس میں شوق کام کرتی تھی۔ دو دن تک وہ ڈانکیاں ماسک، فیض اور مینی کیور وغیرہ کے لیے آتی رہیں مگر آج صبح میں نے بیونی پارلر فورن کے کمرے سبز خان کو کہا کہ میں ان لڑکیوں کے کام سے مطمئن نہیں ہوں وہ کوئی دوسری بیوٹیشن بھیجیں اور آج انہی دو لڑکیوں کے ساتھ شوق بھی موجود تھی۔ میں نے ایک سوچی سمجھی سیکم کے تحت اسے بلوایا تو اس نے کہا کہ میں اس..... اننا حضور ہو چکیں۔ اس کے لئے انتہائی اکتاہٹ کا سبب ہو چکی ہیں۔ کچھ گلے

ٹھکے ہوں کچھ وضاحتیں۔ یہ دھند تو پچھنے ہے اعتباری کی مگر..... مگر اس کے روئے میں ایسی کچھ دینے والی انجینئر تھی کہ میں اس سے کچھ پوچھنے کی جرأت ہی نہ کر سکی۔ صرف رومائل تھی جو پچھلے تین دنوں سے مایوس، مہندی کی ریشیں اٹینڈ کر رہی تھی اور اب پورے اہتمام کے ساتھ برات کے استقبال کو موجود تھی۔ مگر میری دوستی کے ناتے نہیں بلکہ نیکی نرمل کے حوالے سے۔ رومائل کا خیال آنے پر میں نے دوبارہ اسے دیکھا وہ قاطعہ باہمی کی لندن پلٹ ہند سے باہر کر رہی تھی۔

آنکھیں کھم کھم کر مضمی مضمی ہتھیلیاں بار بار کھولتے اور بند کرتے ہوئے تیز تیز بے ساختہ لہجے میں بیاری بیاری باتیں کرنے والی میری معصومی دوست کہیں دور بہت دور بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اب تو ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بڑے اشاکل سے بیٹھی ایک عجیب سنوئی ”لیڈی“ میرے سامنے موجود تھی۔ گلابیوں کو ناز سے حرکت دیتے ہوئے کان میں پڑے ڈائمنڈ ٹاپس کو نمایاں کرنے کے لیے بلا ضرورت والی انگلیوں سے سلاتے ہوئے بار بار لباس پہ پڑتی نامعلوم سی گرد بھجارتے ہوئے وہ اس بات پہ اظہار خیال کر رہی تھی کہ اسکن کے میسٹ رزلٹ کے لیے فرانس کے اخروٹ سے بنی اسکرپ بہتر رہتی ہے۔ مجھے ہنسی آگئی۔ کیا انسان اتنی جلدی سب کچھ بدل لیتا ہے۔ اپنے خیالات، عادات، نظریات..... نہیں کبھی نہیں..... وقت بہت کچھ تبدیل کر دیتا ہے مگر اتنی جلدی بھی نہیں۔ دو تین ماہ کے مختصر عرصے میں تو بالکل بھی نہیں۔

رومائل جلدی اتنی جلدی نہیں بدل سکتی۔ ہاں وہ بہت اچھی طرح یہ پڑھ کر رہی ہے کہ وہ بدل گئی ہے۔ وہ اتنی اچھی اداکارہ بھی ہے مجھے آج سے پہلے اعزاز مل نہ تھا اور اس بہترین اداکارہ کی لیے اسے کچھ نہیں کرنا پڑا تھا۔ ابھی میں اس پر ہنس رہی تھی اور اب مجھے اس پر ہنس آنے لگا۔

وہ بھلا کہ اس قسم کی فضول گفتگو میں دلچسپی سے حصہ لے سکتی ہے۔ اپنے آئینوں سے الریکر رہنے والی رومائل پچھلے تین دنوں سے اپنی مام سے بھی بڑھ چڑھ کے ابڑی ہوئی کا زور لگاتے ہوئے یہ بات ثابت کر رہی تھی کہ وہ برنس ٹائیگن حبیب اللہ کی صاحب زادی ہے۔ میری اتنی بھولی دوست نے کیسے کرخت سے تاثرات سجالے چرے پہ۔ بونے سے قد کی رومائل جس کے گول معصوم چہرے اور پچکا نہ لہجے کی وجہ سے ہم اے بی نے فیس کہتے تھے، اپنی عمر سے دس برس بڑی معلوم ہو رہی تھی۔ گہرے میک اپ، مہینڈ بوند وگ،

گیا اپنی سگئی ساتھیوں کی بے درغی پہ..... کیوں؟ آخر یہ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟
”کیا اس لیے کہ.....؟“

”کہ میرے سارم کی محبت ان کے فخر، سیف اور صوری کی طرح بودی نہیں نکلی اور کیا اس لیے کہ میری چہری کا رنگ سہاگ ہو رہا ہے اور ان کے آنچلوں کے رنگ ان کے آنسوؤں میں جھپک کر پھیلے پڑ گئے ہیں۔“

ٹھیک ہے۔ یونہی ہے تو پھر یونہی سہی۔ میں نے اپنے اندر سارے آنسو اتارتے ہوئے بے دردی سے سوچا۔ مجھے کس بات کا ملال ہے مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ میرے ہاتھوں پہ اسی نام کی مہندی ج رہی ہے جو نام میں نے اپنے دل کے پہلے پہلے درق پہ لکھا تھا۔ میں نے خود اذیتی کی انتہا کرتے ہوئے خوشی کا رونا چھینا مجھے ہوئے خوش ہونے کی کوشش کی لیکن اس روشنی بھری رات میں بھی خوشی میرے دل سے کبوں دور ہے ایسا کیوں ہے؟ دل وہ جان پہ ایک بوجھ سا کیوں محسوس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ مجھ میں نہیں آتی تھی۔ بے پناہ محسوس، تاریکی اور جس دل کے موسم پہ ایسے کہہ کی صورت چھایا تھا کہ میں اپنی بے نام اداسی کا کوئی نشان بھی نہیں ڈھونڈ سکتی تھی۔ میں نے ایک بار پھر کھوئی کھوئی نظروں سے ردوانیلہ کے نفوس سے بکڑے نفوس والے چہرے، سیمکے کے سہے ہوئے اور شفق کے سبے ہوئے خوف زدہ چہرے کی جانب دیکھا مجھے اپنے سوال کا جواب نہ مل سکا تو میں نے تھک کے آنکھیں موند لیں اور اپنے اندر کے اندھیرے میں بھٹکنے لگی۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اچانک فیروزیا کی بلی جیسی مسکرائی آنکھیں چمکیں۔ اس کے دودھیا چہرے کا عکس جھلایا اور یہاں سے وہاں تک سفید موتیوں جیسے دانوں کی قطار سے اس کی قل قل کرتی غمی منگٹانے لگی۔ میں نے پٹ سے آنکھیں کھولیں۔

”اوہو..... ساری لائن خراب کر دی۔“ شفق نے تاسف سے سر ہلایا اور ٹشو پیپر سے میری آنکھوں پہ پھیلا آئی لائن صاف کرنے لگی۔

مجھے اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا۔ اب میں اپنے دل کی خلش کو کوئی نام دے سکتی تھی اور وہ نام تھا فیروزیا شید کا۔ زندگی کا سب سے بھرپور سہل، میری پیاری سگھی فیروزیا، میں تیری مقروض ہوں نا ای لیے ٹو ناراض ہے۔ اپنی نکلی سے میرا جی جاتی ہے۔ مجھے بے چین کیے رکھتی ہے تمہاری صورت روز میرے خوابوں میں خیالوں میں کبھی ہنستی اور کبھی روتی ہے۔

فیروزیا سب سے زیادہ شفق کے قریب تھی مگر اس کی موت نے مجھے اس کے اتنا قریب کیوں کر دیا تھا یہ میں بھی نہ جانتی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں شفق کی طرح اس کی لاش پہ

ٹوچ وچھڑگی ڈاروں 77

دھاڑیں مار کے یٹن نہیں کر سکتی تھی میں..... میں تو اس حرام نصیب کی قبر پہ اب تک دو پھول بھی نہ چڑھا سکی تھی۔ میں اس کی مکلی ہوئی حیران آنکھوں کے بے بس سوال تک نہ پڑھ سکی تھی۔ ردوانیلہ کی طرح صل محل کے اس کی جدائی کا سوگ بھی نہ سنا سکی جو فخر کے حوالے سے ایک جان لیوا بے اعتداری کے دکھ سینے گھر گھر پہنچی آتی تھی کہ شفق کے کونے فون نے اس کے رہے ہے حواس بھی گم کر دئے اور پھر فیروزیا کے بے حرمت وجود کو دیکھ کر وہ زبردست نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو گئی۔ اور شفق جس نے میرے سامنے بار بار فیروزیا کی قسم کھاتے ہوئے عزم کیا تھا کہ جس دن بھی صوری اسے نظر آ گیا وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔

جبکہ میں.....

مما کو پتا چلا کہ اخبار کے صفحات پہ چپٹ پیٹی خبروں کا عنوان بننے والی فیروزیا شید میری دوست تھی تو اس کے جنازے پہ شرکت کرنا تو دور کی بات مجھے اس کی یاد میں دوا آنسو بہانے کی اجازت تک نہ مل سکی۔ مجھے سختی سے منع کر دیا گیا کہ اس بات کی جھجک بھی کسی اور کو خصوصاً سارم کے گھر والوں کو نہیں ملنا چاہیے کہ اس فیروزیا سے میرا کوئی تعلق تھا جسے چند امیر زاداؤں نے اپنے ان ذکور و ذوق بخشنے کے لیے پچھ کی طرح استعمال کیا۔

اور میں ڈر گئی۔

بندھ گئی۔

دو قحی کا حق تک نہ ادا کر سکی۔

جانے کب تک میں اپنے تصور میں بار بار آنے والی فیروزیا کے مسکراتے چہرے کے سامنے اپنا مقدمہ لڑتی رہتی کہ شفق کی آواز نے مجھے پھر سے واپس بلا لیا۔

”اب آنکھیں کھول لو ایلیاش۔“ میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ بڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ سہیلا، ردوانیلہ، بائی فاطمہ اور ان کی نند اور میری دو تین کزنز اپنی اپنی جگہوں سے اٹھ کر میری جانب آگئیں۔ فاطمہ باجی نے میرا رن سوز کے آئینے کی جانب کر دیا۔ میرون ویلٹ کے کاہدار بھاری ہنسنے اور شفق کے مشاق ہاتھوں نے مجھے اٹوٹھا ہی روپ دے دیا تھا۔

”سو کیوٹ۔“ باجی نے میرے بالوں پہ بوسا دیا۔

”ہائے، کتنی چارمگ بلکہ آفت لگ رہی ہے یہ ایلیاش۔“ میری ایک کزن سیبہ نے ہنسی ”ہائے“ کہتے ہوئے مجھے دیکھا اور میں نے آئینے میں دیکھا میرے پیچھے خاموشی سے کھڑی اور اعلق نظر آنے کی کوشش کرتی ہوئی شفق اور ردوانیلہ کے لبوں سے اچانک باکل

غیر ارادی طور پر "ماشاء اللہ" کے الفاظ ادا ہوئے جیسے انہوں نے سید کی "ہائے" کا ازالہ کیا ہو۔ میرادل ایک تاجیے کو اچھل کر رہ گیا۔

تو کیا..... ابھی دلوں میں اتنی گنجائش موجود ہے؟ میں نے ذرا خوش فہم ہو کے پیچھے مڑ کے انہیں دیکھا۔ شفق فوراً ہی اپنا سامان سینے لگ گئی اور رومانیلہ فاطمہ باقی سے پوچھنے لگی۔

"جیلوری آپ اپنے یہاں کی پہنائیں گے دلاہا والوں کی؟" اس سے زیادہ نامعلوم سوال مجھ سے کترانے کے لیے اسی جلدی میں نہ ملا تھا۔ اسی وقت مریم باجی میری اکلوتی نند سویرا اور میری جھانجی نورین کے ہمراہ ڈھیر دن ٹھنیں ڈھے اٹھائے اندر آئیں۔ میں سویرا اور نورین بھائی سے احوال دریافت کر رہی تھی جب مریم باجی نے شفق کو آواز دی۔

"کہاں جا رہی ہو جھگی؟" میں نے دیکھا وہ ٹولڈر بیگ لٹکائے رومانیلہ سے الوداعی مصافحہ کر رہی تھی۔

"کانی رات ہو گئی ہے۔ مجھے ہاسل کی طرف سے بہت پر اہم ہوتی ہے بارہ بجے کے بعد پہنچنے پر۔"

"مگر ابھی تو رخصتی بھی نہیں ہوئی۔ حد تو یہ کہ نہ زیبک نہیں ہوا ایسے کیسے جاسکتی ہو۔ چلو یہاں آؤ۔ جیلوری سیٹ کرنے میں مدد کرو میری۔" مریم باجی نے اس کی طرف دیکھنے کی زحمت کیے بغیر ڈھے کھولتے ہوئے حکم دی۔ اس نے استہنامیہ انداز میں اپنی دونوں ساتھیوں کو دیکھا وہ بھی شاید ذرے پہلے جانے میں انٹرمیڈیٹس میں سوئم رضامندی سے شانے اچکا دیئے۔ رومانیلہ بیگ سائڈ صوفے پر پھینک کے سیدھی میرے پاس آئی اور میکاگی انداز میں پنوں کی مدد سے جمو مراد بیک "ٹھوکنے" لگی۔

اچانک ہی ہنر بھوم کرے مریم باجی کی باریک سی آواز سنائی دی۔
"پاپا لوگ نکاح کے لیے اندر آ رہے ہیں پلیز ذرا رشتہ کم کرو۔" پاپا کے ساتھ نکاح خواں، اکل منیر، احمد بھائی جان اور میرے بہنوئی ارشاد بھائی جان اندر داخل ہوئے تو رومانیلہ شفق سمیت کئی لڑکیاں باہر نکل گئیں۔

میرے جھکے ہوئے سر پہ پاپا کا ہاتھ تھا اور میں دھڑکتے دل کے ساتھ ایجاب و قبول کے مراحل طے کر رہی تھی۔ میرے کانوں میں شہنائیاں سر بکھیر رہی تھیں اور پلکوں پہ نہ جانے کتنے جادو کا بوجھ تھا جو جھگی چلی جا رہی تھیں۔

"ارے، ارے دیکھو اسے..... بھائی..... بھائی..... یہ دیکھیں کیا ہو رہا ہے۔" فاطمہ باجی کی نند جو لالہ کی طرف کھلے کلائی کھڑکی میں سے باہر مہمانوں کا جائزہ لے رہی تھی عجیب حواس باختہ انداز میں چلائی۔

"کیا ہوا؟ علیحدہ..... کون ہے؟" فاطمہ باجی، ارشاد بھائی جان اس کی جانب دوڑے، مجھ سمیت کمرے میں موجود تمام نفوس ساکت سوائے نشان کی طرح بیٹھے رہ گئے۔

"وہ..... وہ لڑکی ہے ناں..... وہ بیوٹیشن..... یہ دیکھیں جو نیچے کھڑی چلا رہی ہے..... ابھی میں نے خود دیکھا اس نے اسٹیج چڑھ کے دلہا پہ جھینگی کی کوشش کی۔ مائی گا کتنا ہو رہا سیل سین تھا۔ بلیوی..... میں نے خود دیکھا اپنی آنکھوں سے وہ کس قدر ہنسیل ہو رہی تھی۔ آپ ان لوگوں سے پوچھ لیں۔" اس نے چپٹی چپٹی آنکھوں کے ساتھ نیچے اشارہ کرتے ہوئے بتایا تو باقی تمام لوگوں کی آنکھیں بھی پھٹی رہ گئیں۔ نکاح نامے پر سائن کرتا ہوا میرا ہاتھ رک گیا۔ پاپا ایک جھکے اٹھے اور باہر کی جانب لپکے۔ دروازے پہ پہنچنے کے انہوں نے پیچھے مڑ کے نکاح خواں کو دیکھا۔

"مولانا آپ اپنا کام جاری رکھیں۔" مگر اس سے پہلے کہ میرا قلم دوبارہ چٹا شفق چیتنی چلاتی کمرے میں آ پہنچی۔

"نہیں الیشا نہیں۔ تم فریبا سے بے وفائی نہیں کر سکتی۔ یہ شادی تم نہیں کرو گی الیشا۔" وہ بیجان انداز میں جھپٹتے ہوئے میری جانب بڑھی۔

کیا ادھر سے ہونے کا مگر انسان کو اتنا پگھلا کر دیتا ہے کہ وہ کسی اور کی جھیل بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے تاسف سے اس تر پتے پھٹنے وجود کو دیکھا جسے ارشاد بھائی، اکل منیر بازوؤں سے کھینچ کر باہر لے جا رہے تھے۔

"چھوڑ دو مجھے، میں الیشا کو چاہتا ہوں ہونے دوں گی۔" اس اتواں سی لڑکی نے اپنے لائے لائے نافوں سے ارشاد بھائی جان کے فولادی گرفت والے ہاتھوں کو ہتھپڑنا شروع کر دیا۔ اس کی بڑبائی کیفیت دیکھ کے مجھے اس کے پاگل ہونے کا شبہ ہوا۔ اس نے بمشکل خود کو ان کی گرفت سے آزاد کر لیا اور دوڑے مجھ سے لپٹ گئی۔ میرے بازوؤں نے خود بخود اسے پناہ دے دی۔

"ناں الیشا ناں، یہ مت کرنا۔ تجھے نہیں پتا....." اس کی پھولی پھولی سانسوں سے سرگوشیاں نکلیں۔ میری پور پور اسے سننے لگی۔ کمرے میں موجود لوگ کیا کہہ رہے ہیں، کیا شور مچا رہے ہیں مجھے کچھ شائی نہیں دیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھام لیا اور التجائیے

انداز میں کہنے لگی۔

”تجھے فتح کرنے والا وہی ہے میری جان جس نے فیروز کو شکار کیا تھا۔ یہ سارم نہیں۔ صوی ہے۔۔۔۔۔ یہ وہی صوی۔۔۔۔۔ میں قسم کھاتی ہوں الیشاع۔۔۔۔۔ فیروز کی قسم یہ وہی ہے۔“

میرے ہاتھوں سے قلم گر گیا۔

وقت کرتا ہے پرورش برسوں

حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

☆=====☆

”میں ڈرتی تھی تمہاری خوشیاں دیکھ کے۔“ فیروز کے الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونجنے لگے کہ ہمارے جذبے، ہماری محنتیں، ہماری خوشیاں ہمارے غم سانچے ہیں۔ ہم بچوں ڈار سے چھڑی کو نہیں ہیں اور یہی درد مشترک ہماری سانچہ ہے اور میں رومانیلہ، سیریکا، ہم تیوں تم سے دور ہو جاتیں کہ تم اس درد میں ہماری سانچہ ساتھی تھیں۔

☆=====☆

اس بگیا کے بھید نہ کھولو

انسان پر بہت سی مشکلیں محض اس وجہ سے آتی ہیں کہ وہ اس فکر میں گھلتا رہتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے، دنیا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔۔۔۔۔ ایسے ہی ایک شخص کی بچھتاوے کی کہانی جو چند کزور محلوں میں ایک مکار عورت کے ہاتھوں شکست کھا کے اپنے بھرم اور اتنا کو بچانے کے لئے اپنی محبت ہار گیا تھا۔

ہوا۔ ریان کا سر بے اختیار نفی میں ہل گیا۔

”نہیں..... کبھی نہیں.....“

حالانکہ اس کے ہاتھوں ہر بار یہی بری طرح زج ہو جانے کے بعد وہ اسے اور چراتا تھا۔

”تمہاری اور میری جنگ پاکستان اور بھارت کی لڑائی ہے۔ نہ میں دیک کے ڈر کے بیٹھوں گا اور نہ ہی تم نے چھیڑنے سے باز آتا ہے۔“

”چھیڑ چھاڑ کی عادت تمہاری ہے کیونکہ تم بھارت ہو۔“

”ابھی یہ فیصلہ ہوتا باقی ہے کہ بھارت کون ہے اور ارے عامہ کے مطابق تمہیں ہی اس کا اہل سمجھا جائے گا کیونکہ بھارتی فلمیں ”تم“ دیکھتی ہو، بھارتی کانوں پر ”تم“ سر دھنتی ہو، بھارتی ہیروز ”تمہارا“ آئیڈل ہیں اور بھارتی سیرنگز کے سارے اوٹ پانگ ٹیشن جس حد تک تم سے اپنائے جاتے ہیں وہ ”تم“ ہی شوق فرماتی ہو۔ بھارت نواز.....“

اس کے طعنے پر وہ ہمیشہ چلتی چلی اور کئی کئی روز تک انٹرنیٹ میگزین، انڈین موویز کا بایکٹارہتا۔ کمرے سے فورٹ انڈین ایکٹرز کے پوسٹرز بھی اتر جاتے لیکن یہ بس چند ہی دن کی بات ہوتی۔

ریان یاد کر کے مسکرایا۔ وقتی طور پر کتنا غصہ آتا اسے میری بات کا، قسمیں کھایا کرتی کہ آئندہ مجھے کبھی ڈھونڈنے سے بھی موقع نہ ملے گا اس کی کسی کمروری پکڑنے کا اور پھر چند ہی دنوں میں میرے طعنے، تفتے، اشتعال انگیز جملے سب فراموش کر کے وہی کرتی جو اس کا دل چاہتا۔ ”کاش..... کاش..... میں بھی ایسا ہوتا۔“ ذہن سے سب جھٹک دیئے والا..... دل میں کچھ نہ رکھنے والا..... لیکن.....“ وہ بے بسی سے سر جھٹک کر رہ گیا۔

ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی ویسا ہی بن جائے جیسا وہ چاہتا ہے۔

اور کوئی بھی وی ہے جو اللہ کو پسند ہو..... چاہے کوئی چاہے یا نہ چاہے۔

آج سے ڈھائی سال پہلے جب اروا اس کمرے سے رخصت ہوئی تھی تو کیا کسی کو امید تھی کہ وہ واپس آئے گی..... اس طرح واپس آئے گی؟

کیا اس نے کبھی یہ چاہا تھا..... اس نے تو ہمیشہ اس کے لیے اچھا ہی سوچا، بھلے کبھی جنایا نہ ہو۔ جتانے یا کچھ بتانے کی تو اسے عادت تھی بھی نہیں۔ ویسے چاہے ٹھنوں زبان چلتی رہتی اور اس کے سامنے تو خیر قیمتی کی طرح چلتی تھی، چپ تو وہ بھی نہ کرتی۔ دونوں روز ہی کئی کئی مہرے لڑا کرتے۔

”ارو ما آ رہی ہے۔“

اسی کے مختصر سے فقرے پر وہ چونک کے انہیں دیکھنے لگا۔ جب سے وہ آفس سے آیا تھا، اسی کو عجیب سی کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔ وہ معمول کے مطابق سب کام انجام دے رہی تھیں مگر ایک اضطراب ان کے ہر عمل سے ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ کئی روز سے جانتا تھا کہ یہ تو ہوتا ہی ہے پھر بھی چونک کر رہ گیا۔

”فیصل خدا سے چھوڑنے آ رہا ہے۔“ انہوں نے اضافہ کیا اور اسے دیکھنے لگیں کہ شاید وہ کچھ پوچھنے کا لیکن اس نے جلدی سے دو تین بڑے بڑے گھونٹ بھرے اور مگ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”بہت نیند آ رہی ہے۔“

”ہاں، وہ تو میں جانتی ہوں۔ نیندیں تو بہت..... بہت زیادہ ہی آتی ہیں تمہیں۔“ وہ اسے اپنے کمرے کی طرف لیے لیے ڈگ بھرتے دیکھ کر پیچھے سے بڑبڑائیں۔ ان سے زیادہ اور کون واقف تھا کہ رات کتنی کتنی دیر تک اس کے کمرے کی جتنی چٹنی رہتی، اس کی ساری بے خوابیوں کی ہمارا زمین وہ..... اور شاید خوابوں کی بھی۔

اپنے کمرے میں آنے کے بعد ریان کے اندر چھپی دھشت پوری طرح اس پر حاوی ہو گئی۔ ان درد و پر اسے کچھ چھپا ہوا تو نہیں تھا۔

اس نے سر گھما گھما کے چاروں اور دیکھا۔ کہیں اس کی تصویر نہیں تھی مگر گوشے گوشے پر وہی مسکرائی نظر آ رہی تھی۔

”اب لوگے مجھ سے پچھا.....؟“

وہی اس کا پسندیدہ فقرہ، اس کے مخصوص اکڑ انداز میں ہر طرف اسے لکارتا ہوا محسوس

”ارے ”ربڑی دیوی“ یہ کیا بتی ہوئی ہو؟“

اسے سلک کی جاسٹی ساڑھی لپیٹے، اونچا سا جوڑا بنائے دیکھ کر ریان نے فٹ اسے ”ربڑی دیوی“ کا خطاب دے دیا۔ وہ اپنی عزیز از جان دوست شبنم کی مٹکی میں جانے کے لیے اتنے شوق سے تیار ہوئی تھی۔ کچل بار خالہ سے صدمہ کر کے ساڑھی بھی نکھائی تھی اور بعد میں جب اپنی قدر کے کامت کا احساس ہوا تو ہائی بیل کے سینڈل پہننے کے ساتھ ساتھ اونچا سا جوڑا بنانے کے معاملہ میں پلٹس کرنا چاہا لیکن ہوا یہ کہ وہ خود ان پلٹس ہو گئی۔ ایک تو ساڑھی پہلی بار پہنی تھی، دوسرے اس کا سلیکسٹو سٹیناٹا ایک الگ غلاب تھا۔ اوپر سے ہائی بیل نے حقیقتاً پھونک پھونک کے قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا ریان، امی کے کہنے پر اسے شبنم کے گھر ڈراپ کرنے کے ارادے سے طوعاً کرہاً تھوڑا گھبراہٹ ہو گیا مگر اس کی بیٹہ کڈانی دیکھ کے اپنی زبان کی کھجی پر کنٹرول نہ کر سکا۔

”ربڑی دیوی..... یہ ربڑی دیوی کون ہے؟ ربڑی کا تو سنا ہے بلکہ کھائی بھی ہے، خوب ٹھنڈی ٹھار کر کے لیکن یہ دیوی کون ہے؟“ اس کی معلومات اپنی دلچسپی کے علاوہ دیگر معاملات میں بس یونہی سی تھیں۔

”کوڑھ مغز لڑی! میری سمجھ سے باہر ہے تم کا کالج میں پڑھتی کیا ہو اور حیرت کی بات مضمون بھی کیا شاندار رکھے ہوئے ہیں۔ سیاسیات اور صحافت..... واہ سیاسیات کی طالبہ اور حالات حاضرہ سے لاطینی کا عالم ہے، حالانکہ ربڑی دیوی تو تمہارے اپنے بھارت کی ہی ایک وزیر ہے۔ کتاب کیڑا ہونم بھی، غلاموں سے رٹ رٹ کے ٹوش پر چوں میں لکھ آتی ہو۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، اس کی فکری نہیں۔ ہاں اسٹوڈیوز میں کس سرگرمیاں ہیں، سینما ہاؤس میں کتنا رش لگا ہے، یہ جاننے کا شوق ہے۔ اخبار میں بھی بس ”فلمی خبریں“ پڑھتی ہو۔ انڈیا کے گھنٹیا سے گھنٹیا اداکار کی باؤگرانی سے واقف ہو اور مشہور معروف سیاسی ہستی ربڑی دیوی سے اتنی ناواقفیت..... حیرت ہے۔“ اس نے حسب عادت اسے چڑایا۔

”ایسی کوئی مشہور و معروف ہستی بھی نہیں ہوگی، ورنہ میری جزل نالچ اتنی کمزور بھی نہیں۔ اس وقت اسلام آباد کی پارلیمنٹ میں جتنے ارکان بیٹھے ہیں، بے شک سب کے نام سن لو۔ اب بھارت کے صوبہ بہار کے گورنر، چاندھر کے امبیکر، ولی کے وزیر اعلیٰ، چندری گڑھ کے شیر اعلیٰ..... ان سب سے واقفیت بڑھا کر مجھے کیا کرنا ہے۔ میں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تم بھارت ہو..... اور میں پاکستان۔“ جب سے ریان نے اس کے اور اپنے معرکوں کو

”پاک بھارت جھڑپ“ کا نام دیا تھا، دونوں ہی ہمہ وقت دوسرے کو بھارت اور خود کو پاکستان قرار دینے کی سر تو دوکوش کرتے رہتے تھے۔

”لیکن بھارتی لباس میں اس وقت تم لمبوس ہو۔“ اس نے فاتحانہ انداز میں نکتہ اٹھایا۔

”اور ربڑی دیوی بھی تم ہی لگ رہی ہو۔“

”آف..... فو.....“ آخر یہ ربڑی دیوی ہے کیا بلا؟“ ریان کا دیا طعنہ اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ الماری کے پٹ کھول کے اس کو کوئی ڈریس منتخب کرنے لگی۔

”کمال ہے، تم نے اب تک اس کا دیدار نہیں کیا۔ کبھی صودی جینز کے علاوہ نیوز جینز بھی دیکھ لیا کرو، جہاں کئی بار وہ اپنے جلوے نکھیرے نظر آتی ہے۔ بالکل ایسا ہی اونچا سا جوڑا..... یعنی مگرے رنگ کی چم چم کرتی لپ اسٹک اور لیشی رنگ پرگی ساڑھیاں اور پتا ہے وہ ساڑھیاں ربڑی دیوی کے اتنی کلوڈوز اور اونپونے پانچ فٹ کے وجود پر کیسی لگتی ہیں، جیسے کدو پر غلاف چڑھا دیا ہو۔“ اس نے ہتھپڑ لگایا تو اروما بھی ہاتھ پر ہاتھ مار کے ہنس پڑی۔

”اللہ..... جی.....“ وہ بے تحاشہ ہنسنے لگی۔ ”کدو..... کدو پے غلاف.....“ اچھی طرح ہنس لینے کے بعد اچانک اسے بریک لگ گئی۔ شاید اسے یاد آ گیا کہ اس غلاف چڑھے کدو سے وہ کچھ دیر پہلے اسے تشبیہ دے رہا تھا۔

”تم..... ریان..... تم مجھے کدو..... میرا مطلب ہے ربڑی دیوی..... تمہاری اتنی ہمت..... کیا میں تمہیں ایسی نظر آ رہی ہوں.....“ غم و غصے سے بے حال ہوتے ہوئے اس نے بڑی ہمت سے سچے سنوارے اپنے سر پر پانچ فٹ دوڑائی۔

”ارے نہیں یار..... کمال ہے، میں کیا اتنا کم فہم ہوں جو کدو اور میٹھن میں تمیز نہ کر سکوں۔“

”زی..... ی..... آن.....“ وہ گھبراہٹ کے چلائی اور اس سے زیادہ کچھ کہ بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ اپنی بات کہہ دینے کے بعد وہ کمرے سے غائب ہو چکا تھا۔ وہ ساڑھی کے پلو کو نوجبی کسوٹی دھم سے بیڑ پر بیٹھ گئی۔ چند منٹ تک کھولے رہنے کے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی دوبارہ تیار ہونے کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اگر اس کی عزیز دوست کی مٹکی نہ ہوتی تو کبھی وہ اس کے ساتھ جانے پر تیار نہ ہوتی۔

آدھ پون گھنٹے بعد وہ پھر کمرے سے نکلی اور ریان جو صونے چٹسل سے نیم دراز ہو کے پاکستان اور انڈیا کا بیچ کچھ رہا تھا، منہ بانٹا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بے بیچ نہیں کرنا چاہتا تھا، اسی لیے اس نے جانے کو تیار کھڑی اروما کا بساط بھر موڈ خراب کیا۔ اس کا خیال تھا، اتنی بد مزگی

کے بعد وہ جانے کا ارادہ ترک کر دے گی یا کم از کم اس کے ساتھ جو جانا پسند نہیں کرے گی لیکن ذرا ہی دیر بعد وہ پھر سے منہ پھلائے سامنے تھی۔ ریاں نے دھیلے وجود کے ساتھ خود کو تاجدار یو ڈیوٹی بھگتے پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دیکھا۔

سفید چوڑی دار پا جامہ، سفید ہی نیٹ کی مختصر قمیص میں لمبے سے ست رنگے پٹے ہوئے دوپٹے کے ساتھ وہ پہلے سے کسر مختلف لگ رہی تھی۔ کس کے ہُڑ میں سے لیپنے بال ایک ڈھیلی سی چوٹی میں قید تھے۔ ہائی ہیل گولڈن سینڈل کے بجائے مناسب لمبائی کی ہیل والی سفید سینڈل تھی جس پر دو تین رنگ کے تھینے بکھا رہے تھے۔ ایک آپ بھی لباس کے رنگ کی مناسبت سے تبدیل ہو چکا تھا۔ گولڈن آئی شیڈ اور جاسمی لپ اسٹک اور بلش آن کے بجائے کھلتے ہوئے گلابی رنگ کے شیڈ اس کے خاموش لبوں اور رخساروں پر سجے تھے۔

اسے پیچھے بٹھا کے جب ریاں نے بائیک اسٹارٹ کی تو دل ہی دل میں شکر کیا کہ اس کے چند پلے کئے جملوں سے گھبراہٹ ہی نہ ہو، کم از کم ارمانے وہ فضول سی ریشمی ساڑھی تو تبدیل کی۔ اگرچہ ریاں نے کسی اور مقصد سے اسے کسایا تھا، اب اسے یہ دھیان ہی نہیں رہا تھا کہ بائیک جیسی سواری پر ساڑھی میں بلبوں، چنگھاڑتے ہوئے میک اپ کے ساتھ وہ اسے اپنے پیچھے بٹھا کے لے جاتا کیا محسوس کرے گا اور یہی وہ خود..... تو وہ اسکی ہی لاپرواہ تھی۔ ان نزاکتوں کی طرف اس کا دھیان کم ہی جاتا۔

اس کی مستقل خاموشی سے بور ہو کر ریاں نے بائیک کی رفتار آہستہ کی۔

”فالودہ کھاؤ گی؟“ کوئی جواب نہ ملنے پر اس نے اپنا سوال دہرایا۔ دوسری بار بھی خاموشی پر وہ جھلا اٹھا۔

”سوئی ہو یا سرگئی ہو؟“

”مریں میرے دشمن جو بنے کئے دندانے پھرتے ہیں اور نیند سوئی پر آ جانے کا محاورہ تجربات سے درست قرار دیا جاسکتا ہے مگر تمہاری اس چھٹی پر نیند..... ناممکن۔“

”توبہ..... شعلے برسا رہی ہو۔ کیا خیال ہے ایرانی سرکس میں ایک شو تمہارا بھی نہ دکھوا دیں۔ منہ سے شعلے برسانے والی حسینہ، غلط ثابت کرنے والے کو ایک ہزار روپیہ نقد انعام، یاد رہے کہ صرف منہ سے بولنے والے دھوے کو غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا، جبینہ لفظ استعمال کرنے پر جو چاہے اعتراض کر سکتا ہے۔“

”میں چلتی بائیک سے چھلانگ لگا سکتی ہوں۔“ اس نے دھمکی دی۔

”اچھا اچھا..... تو یہ کرب بھی دکھانا آتا ہے۔ چلو ایک مظاہرہ اس کا بھی رکھوا لیں

گے۔ رسی پر چڑھ جاتی ہو؟ پلیز بتانا اور کون کون سے کمالات آتے ہیں۔“ وہ خاموشی سے دانت چبیتی رہی تو ریاں نے مصالحتاً انداز اختیار کرتے ہوئے بات بدل دی۔

”اچھا تو بتا دو، فالودہ کھاؤ گی یا نہیں؟“

”دوبار بتا دو یا ہے کہ نہیں۔“

”مجھے آواز نہیں آئی۔“

”میں نے سر ہلا یا تھا۔“ اس کی معصومیت پر ریاں نے سرے سے کھول اٹھا۔

”سبحان اللہ..... بی بی! میرے پیچھے آنکھیں نہیں جو میں تمہارے منٹکے کو ہٹا دیکھتا۔

ڈھانکی سیر کا سر ہلانے کے بجائے یہ چھٹانک بھری زبان نہیں ہلائی جانی۔“

”اچھا تو اب سن لو۔ نہیں کھاؤ گے کوئی فالودہ شالودہ۔“

”یہ آج سر نہیں اٹھی ویران کیوں ہیں۔“

”صحیح جو ہے اڑ یا اور پاکستان کا۔ ایک تمہاری دوست ہی بد ذوق ہے جو آج کے اہم دن اپنا پیچ ڈال کے بیٹھی ہے۔ مجھ سے کھواوا حرام ہے جو کوئی دی کی آگے سے اٹھ کے اس فنکشن تک آگے آگے آکر لے، بلکہ مجھ سے خود شہ ہے کہ کہ متوقع دلہنا صاحب بھی کہیں انگوٹھی اماں کے ہاتھ نہ بھجوادیں۔“

سارے راستے ہی وہ جی بھر کے اسے بے زار کرتا رہا اور واپسی پر تو وہ خود حد سے زیادہ تیز را اور اسکا یا ہو لگ رہا تھا۔

”آئی دیر سے آئے ہو، ڈنر کب ختم ہو چکا۔“

”مجھے مت چھیرو، اس وقت تم سے بلکہ تمہاری ساری قوم سے چڑا بیٹھا ہوں۔“ وہ کانٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔

”میری قوم؟؟ کیا مطلب؟“ اس نے حیران ہو کر پوچھا لیکن ریاں نے وضاحت ضروری نہ سمجھی۔ البتہ کچھ دیر بعد ”نرالا سوش“ کے آگے بائیک روکی۔

”اس وقت تو جنہیں فالودہ کھانا زار رنگ رہا تھا، اب رس ملائی نہ کھانے پر اعتراض ہوگا نہ کھانے پر نہ چلو باباش، پیسے دھیلے کرادو مجھے رس ملائی کھلاؤ، میرا غم غلط کرو۔“

”کیا؟ میں جنہیں رس ملائی کھلاؤں؟ مگر کس خوشی میں۔“

”پیچ جینے کی خوشی میں۔ مبارک ہو، تمہاری مٹیں پوری ہوں۔“

”جج..... کیا پاکستان جیت گیا؟“ وہ خوش ہو گئی۔

”نہیں..... ہار گیا۔ تم جیت گئیں۔“ اس کے فکڑے پر وہ تھملا کر رہ گئی۔

اس مسئلے پر سوچا۔

اپنی والدہ اور بہنوں کی حاسدانہ فطرت سے آگاہ تھے، اس لیے نزدیکی شہر میں ہی رہائش اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا ارادہ اکیٹھ روپے کا برنس شروع کرنے کا تھا، جبکہ ان کے چچاؤں، والدہ اور بھائیوں کا سب کا ٹیکسٹائل کاربنس تھا اور فیصل آباد میں ان کی بیوی تھی۔ لاہور آنے کے بعد بیوی کی فرمائش پر انہوں نے اکلوتی سالی کے گھر کے قریب ہی ایک بنگلہ خریدا۔ ابھی انہوں نے کاروبار شروع کرنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ دل کا پہلا دورہ ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی جواں سال بیوہ شاہدہ بروس کے فیصل اور چار سالہ اروما کے ساتھ تنہا رہ گئیں۔ ان کی بہن نامید اور بہنوں نے انہیں خاصا سہارا دیا۔ سارا سرمایہ انہوں نے فیصل اور اروما کی امانت سمجھتے ہوئے بینک میں فیکس کر دیا۔ اظہار صاحب کا اتنے ارمانوں سے سجایا ہوا سا بنگلہ ان کی ضرورت سے بہت زیادہ تھا۔ ان کے بہنوئی شفیق بھائی جان نے ان سے مشورہ کرنے کے بعد بنگلے کا اوپر والا پورشن کرانے پر اٹھایا۔ غیبی حصے پر گیت لگوا کے اور الگ سے سیزمیاں رکھوا کے اس کا مکمل ڈھل نچلے پورشن سے ختم کر دیا اور اپنے اور ان کے لانا کے درمیان والی دیوار گرا دی تاکہ شاہدہ خود کو غیر محفوظ اور تنہا تصور نہ کر سکے۔

ان کے سسرال والوں کا رویہ بیٹے کی وفات کے بعد اور جارحانہ ہو گیا، اس لیے ان سے تو کسی قسم کے تعاون اور مدد کی امید نہیں تھی۔ یوں وقت گزرتا چلا گیا اور شاہدہ، نامید اور شفیق بھائی جان کی بھتیجیوں کے ساتھ سنبھلنے کی کوشش کرنے لگیں۔

شفیق بھائی جان نے مقدور بھر بیوہ، سالی اور اس کی اولاد کا خیال رکھا۔ فیصل اور اروما کو باپ کی کمی محسوس نہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ اور وہ خود ان کا ایک ہی پتہ رہا تھا جو فیصل سے دو سال چھوٹا اور اروما سے تین سال بڑا تھا۔ شاہدہ کا گزر کرانے کی رقم میں بخوبی ہورہا تھا۔ بینک میں موجود رقم جو ان کی توں تھی۔

کچھ وجہ یہ تھی کہ ان کی بہت سی ضروریات بغیر کے شفیق بھائی جان پوری کر دیا کرتے۔ تینوں بیٹے ایک ہی سکول میں پڑھتے اور خود ہی ہر ماہ تینوں کی فیس ادا کر دیا کرتے۔ نامید تینوں بچوں کے لیے خود ہی شاپنگ کیا کرتیں۔ شاہدہ ان معمولات سے بے نیاز تھیں۔ زندگی میں ان کی دلچسپی برائے نام تھی۔ دلہنا کے دنوں میں ہی وہ سن چاہا محبوب جو زمانے سے نکلے کر ان کا شوہر بننا تھا، سات سمندر پار چلا گیا۔ دس طویل برسوں میں صرف چار بار بہنوں کے لیے آیا کرتا اور صحیح معنوں میں تو وہ دونوں اب اپنی ادا دہائی زندگی کا آغاز کرتے جا رہے تھے۔

”دیکھو ریاں! بہت ہو گیا۔ میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ تمہارا جو جی چاہتا ہے بک دیتے ہو، یہ خیال کیے بغیر کچھ کیسے لگے گا۔ تم خود ہو گے میرے جعفر، چارج ہٹ۔ بلکہ اٹل بھاری واچائی۔ خبردار جو آئندہ میری خوب الوطنی کے بارے میں مشکوک انداز سے لگائے تو۔۔۔“

ایک تو پاکستان کے کچھ ہارنے کا چاہنا مکمل صدمہ، اوپر سے ریاں کا اسے بھارتی فیم کی جیت کی خوشی میں مبارکباد دینا، اسے سچ بھی کر گیا۔
”پیسے خرچ نہیں کرنا تو موت کر لیکن کم از کم مجھے واچائی تو مت کہو۔“ اس نے دوبارہ سے بائیک آگے بڑھائی۔

”تم شکلا عادتاً فطرتاً۔ پورے کے پورے واچائی ہو۔“ اس نے خود کو بڑی دیوی کہلائے جانے والے سامنے کا فوری بدلہ لیا۔ ”بالکل اس کی طرح گھنے، میسے، چپ پیچھے، لڑاکے۔۔۔ اسی کی طرح ناک چڑھا رکھی ہوتی ہے تو ہر اسی عروج پر ہوتی ہیں۔“
”وہ ٹھکنا ہے، میں دراز نہ ہوں۔ وہ موٹا ہے میں اساتھ ہوں۔ وہ کالا ہے، میں گورا چٹا ہوں۔ وہ سڑیل ہے اور میں خوش مزاج ہوں۔“

”تو پھر تم اٹل بھاری واچائی نہیں بلکہ بال ٹھا کرے ہو۔ چھٹنے، بڑی بڑی خوشخوار آنکھوں، گھنے بے ترتیب کالے سیاہ بالوں اور مرکا روٹھا مسکراہٹ والے۔“
اسی طرح دونوں ایک دوسرے سے حساب برابر کرتے رہتے۔

اور ماریاں کی اکلوتی خالہ کی بیٹی تھی۔ دونوں کی اماں میں دو ہی بیٹیاں تھیں، اسی لیے ایک دوسرے کو اپنا سینے کا واحد سہارا تصور کرتے ہوئے بے حد قریب بھی تھیں۔ جب اروما کے والد شاہدہ سے مستقل پاکستان سیٹل ہوئے تو انہوں نے اپنے آبائی شہر فیصل آباد کے بجائے لاہور میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ حالانکہ وہاں ان کا بھراؤ کزنہ تھا۔ ماں، باپ، تین بھائی اور دو بیٹیاں لیکن ان کے گھر والوں کا رویہ نہ تو ان کی تینم کے ساتھ مناسب تھا اور نہ ہی وہ اپنے اس بیٹے کی برادری سے باہر پسند کی شادی کی خطا کو معاف کر پائے تھے۔ روزگار کے سلسلے میں انہیں چند ماہ کی بیجا پتا ڈھن کو اپنے سخت خراج گھر والوں کے سپرد کرنا پڑا۔ بعد میں ان دس سالوں میں انہوں نے گاہے بگاہے پھر لگائے۔ پہلے فیصل اور پھر اروما نے ان کی فیملی میں اضافہ کر دیا لیکن ان کی بیوی کے ساتھ سسرال والوں کا رویہ اول روز جیسا ہی تھا، وہ ہر بار پاکستان آنے کے بعد دل برداشتہ ہو کے واپس جاتے اور پھر جب بڑھتے ہوئے بچوں کے مستقبل کی خاطر انہوں نے پاکستان شفٹ ہونے کا ارادہ کیا تو سنجیدگی سے

”اور جب بھائی زندہ تھا تو خود تو وہ بیچارہ کبھی انہیں نظر نہیں آیا۔“

”اچھا تو یہ آئیڈیا ان کا تھا۔“ رہبان نے سر ہلایا۔ ”میں اسے دیکھ کر اکثر سوچتا تھا، اسے بنانے کے لیے فرشتے اتنی دور کی کوڑی کیسے لائے ہوں گے۔ اب سمجھ میں آیا کہ یہ انسانی رِیشن

اس وقت تو فیصل نے خامی یا بگواہی سے وہاں جانے کی ہامی بھری تھی لیکن بعد میں نہ جانے اے دھیمان والوں نے کیا گھول کے پلا دیا کہ وہ دل کی طرف سے ملنے والے مکان کے بھانے ہیں چچا کے گھر رہے گا۔ فیصل آباد جانے کے ڈیڑھ ماہ بعد ہی جب وہ پہلی بار ”ہورا“ آیا تو اسے چچاؤں، چھو بھیسوں کی محبت اور ان کی اولادوں کی اچانکتی کے قصے فر فر سنا رہا تھا۔ خالہ بڑے اچھے سے اسے دیکھا تو وہ سنبھل گیا۔

”میرا یہ مطلب نہیں خال جان! وہ شہنا گیا۔ شفیق صاحب نے بات کو سنبھالا۔

”ناہید! بحث کیوں کر رہی ہو اور وہ بھی بلا وجہ۔ فیصل ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ اگر اس نے ماریہ کا نام لیا ہے تو ظاہر ہے کہ کچھ سوچ سمجھ کے، دیکھ بھال کے ہی یہ فیصلہ کیا ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں ہمیں اس بار فیصل کے ساتھ جا کر ماریہ کو دیکھ آنا چاہیے بلکہ بات چکی کر آنا چاہیے، کیوں فیصل بیٹا!“

فیصل جو خال جان کا سخت دروغل دیکھ کے گھبرا اٹھا تھا، خالو کی مفاہمانہ امداد پر آہستہ آہستہ پُرسکون ہوتا ہوا آخری فقرے پر ایک دم پھر سے مضطرب ہوا اٹھا۔ ناہید نے بھی شوہر کو اس مداخلت پر فحش بھری نظروں سے گھورا۔

”بھیا! آپ ماریہ آئی، میرا مطلب ہے، بھابی کی کوئی تصویر نہیں لائے؟“ اروا نے اشتیاق سے پوچھا۔

”وہ تو ان کی آنکھوں میں نظر آ رہی ہے۔“ ریان نے لقمہ دیا تو فیصل جھینپ گیا۔ اس نے ایک نظر سر جھکا ہے مگر مہم بھی خال کو دیکھا اور اروا اور ریان کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

”ناہید! بات کو سمجھا کرو، وقت بدل رہا ہے، زمانہ بدل رہا ہے۔ آج کی نسل اپنے فیصلے خود کرنے کی عیاض ہے۔“

”چلیں ٹھیک ہے شفیق! میں نے مانا وہ اپنے فیصلے خود کر سکتا ہے، بقول آپ کے زمانہ جو بدل رہا ہے لیکن کیا مجھے ناراض ہونے کا بھی حق نہیں؟“

”کیسی ناراضی؟ اس نے اپنے لیے ایک اچھی لڑکی کا انتخاب ہی تو کیا ہے جو ہمارے نہ کسی مگر اس کے خاندان کی ہے، بڑی کھسی ہے، شریف ہے اور یہ تو اس کی سعادت مندی ہے جو ہمارے پاس رضا مندی لینے آیا ہے ورنہ اگر خودی سب معاملات طے کر لیتا تو بھلا ہم تم کیا اعتراض کر لیتے۔“

”میں سمجھیے، میرا حق امتیاز ہے۔ وہ لوگ تب کہاں تھے جب یہ ننھی جانیں ماں باپ کے سامنے سے محروم کی شفقت بھرے ہاتھ کے لیے ترس رہی تھیں۔ شاہدہ میری بہن تھی اور میں اچھی طرح جانتی ہوں، وہ آج زندہ ہوتی تو کبھی اپنے بیٹے کے لیے اپنی اس فساد مندی کو جی کو پسند نہ کرتی۔ گھر بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں اس کی بیٹیوں لڑکیاں۔ نہ جانے کون سی والی فیصل کے سر منڈھ دی ہے۔ یہ تو آپ میرے دل سے پوچھیے کہ اس پر کیا کر رہی ہوگی۔ یہ سوچ کر کہ نہ جانے شاہدہ کی روح فیصل کے اس اقدام پر کتنی بے چین ہوگی۔“

انہیں آپ کی پھر بھی محترمہ نے سبیا کی تھی۔ ”یہ فیصل بھائی! کیا ان کی بھی ”بہن“ آنکھیں مانتے پر چڑھی رہتی ہیں اور ”بہن“ ناک پھوٹی بیگنی رہتی ہے؟“

”کبواس مت کر دروہان! بڑوں کے بارے میں بات کرنے کی بالکل بھی تیز نہیں رہی تھیں۔ کیا میں نے تمہیں تو تربیت دی ہے۔“ ناہید نے در پردہ فیصل کو سنانے کے لیے بیٹے کو ڈھنسا شروع کر دیا، وہ دھنسنے لگ رہا گیا۔

”امی! میں تو.... میں تو اروا....“ لیکن وہ دل کی بھڑاس نکالتی رہیں۔

”اب تم اتنے بڑے ہو گئے ہو کہ اپنے بڑوں میں نقص نکالنے جیسے گئے ہو، شرم نہیں آئی تھیں ایسا کہتے ہوئے۔“

”سوری امی! میرا مطلب یہ نہیں تھا لیکن پھر بھی.... پھر بھی سوری۔“ اس نے غصے سے کھولتی امی کے گھٹنے پر لاڈ سے سر کرنا نہیں ٹھہرا کرنا چاہا جو دیدہ نگاہوں سے فیصل کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ اس بات سے قطعی انجان تھا کہ اس کی بات نے انہیں کتنا دکھ پہنچایا ہے۔

تمیں دن تک وہ اپنے دھیمی رشتہ داروں کی محبت کے گیت الاپتا رہا۔ چچا جان کا یہ بیان سب سے زیادہ دہرایا جاتا۔

”فیصل! اگر تمہاری طرح اظہار رحمان بھی اس طرف ہوتا تو آج ہم لوگ ٹیکسٹائل انڈسٹری میں کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے ہوتے۔ جب ہمارے پاس سرمایہ تھا مگر اسے استعمال کرنے والا ذہن نہیں تھا۔ اب تمہارے جیسا اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹا ہے مگر طیس بند پڑی ہیں۔“

اس کے علاوہ بڑی پھر بھی کے جذباتی ڈائلاگز بھی وہ دن میں کئی کئی بار نشر کرتا۔

”اظہار سب، بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ مجھ سے قریب تھا، بڑی عزت کرتا تھا میری۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ میرے سارے ڈھکدوہ پریشانیوں بانٹ لے۔ اللہ نے بڑی جلدی اسے اپنے پاس بلا لیا ورنہ آج اس کے سہارے میری کئی پریشانیاں ٹل چکی ہوتیں۔“

اور ناہید جانتی تھیں کہ شاہدہ کی اس زندگی پریشانیاں کھیں، تین بڑھتی عمر کی بیٹیاں۔ ان کا خدشہ درست نکلا۔ فیصل نے زیادہ دیر نہ لٹائی، اگلے ہی چکر میں وہ نئے

انگشتاں تہرا لہا تھا۔

”خال جان! وہ.... وہ ماریہ اچھی لڑکی ہے۔ میں نے سوچا.... شادی تو اب کرتا ہی ہے تو کیوں نہ خاندان میں....“

”باب! تم“ نے سوچا۔ انہوں نے استہزاء سے ہنسا کر بھرا۔ ”ظاہر ہے کہ تم نے خود ہی سوچنا تھا تمہارے بارے میں سوچنے والا کوئی اور ہے جو نہیں۔“

بت بنی بھٹی ناہید کی گود میں دھر کے باہر نکل گئے۔ اب ان کے پاس کوئی ثبوت دلیل بھی نہ تھی جس سے وہ ناہید کا دل بھلائے۔ ناہید چپ کی چپ رہ گئیں۔ ایک لفظ گلے کا بھی نہ کہہ سکیں اس سے..... لیکن شاید ان کی شکستہ نظریں شکوے برسا رہی تھیں جو اگلے دور و زبک فیصل طرح طرح کی صفائیاں ہی پیش کرتا رہا۔

”خالہ جان! یقین کیجیے، جیسا آپ سمجھ رہی ہیں وہ بات نہیں۔ یہ منگنی کا فنکشن نہیں ہے۔ بھلا آپ کے بغیر میں اتنا اہم فنکشن کر سکتا ہوں؟ یہ تو بس..... دراصل تایا جان نے ہی کہا تھا کہ اگر مجھے اعتراض نہ ہو تو وہ چھو بھی جی سے میرے لیے ماریہ کی بات کریں۔ میں نے سوچا تو مجھے بھی اس میں کوئی برائی نظر نہ آئی۔ میرے ہاں بھرتے ہی تایا جان خود میرا رشتہ مانگنے ان کے گھر گئے۔ میں تو جانتا بھی نہ تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ مجھے آفس میں نوں آیا کہ میں فوراً چھو بھی جی کے گھر پہنچوں، وہاں گیا تو دیکھا، چھو بھی جی کے ہاں کرتے ہی سارا خاندان مارے خوشی کے وہاں جمع تھا۔ تایا جان اتنے بڑے خوش تھے کہ اپنے ساتھ انگوٹھی بھی لے گئے تھے۔ بس رکی طور پر یہ کارروائی ہوئی..... میں نے صرف ان کی خوشی کی خاطر اعتراض نہ کیا۔ دیکھیں خالہ جان..... آپ کو کوئی اہتمام نظر آ رہا ہے؟..... ہاں بس وہ لوگ ہی، ماشاء اللہ اس قدر زیادہ ہیں کہ جہاں جمع ہو جائیں، وہاں تقریب کا گماں ہوتا ہے، باہر کا کوئی بھی فرد نہیں تھا۔“

ناہید نے تڑپ کے اس کی طرف دیکھا لیکن اسے کوئی احساس نہیں ہوا۔ وہ بدستور تسلیاں دینے میں مصروف تھا۔

”جب باقاعدہ فنکشن کروں گا تو آپ کو ضرور بلاؤں گا۔“

اس سے زیادہ سننے کی اس میں تاب نہیں تھی۔ وہ فیصل کو پرے بٹاتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔ وہ حیرت سے دیکھا رہ گیا۔ اروما کی جانب دیکھا تو وہ بھی سسک رہی تھی۔ ریان نے دے لفظوں میں شکوہ کیا۔

”فیصل بھائی! توخ دینا جانتے ہیں تو مرہم لگانے کا سلیقہ بھی سیکھ لیجیے۔“

”آخر میں نے ایسا کیا کہہ دیا؟“ وہ جھنجھلا اٹھا۔

”پتا نہیں، بھیا بھولے بننے ہیں یا واقعی اتنے بھولے ہیں کہ اپنے عمل کی بیگینی اور لفظوں کی بدصورتی تک سے انجان ہیں۔“ اروما نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

جتنا صدمہ ناہید کو فیصل کے اتنے بڑے فیصلے کے تنہا کر لینے سے پہنچا تھا، اتنا ہی صدمہ اس کے ان قہروں نے دیا تھا جسے اپنے تئیں اس نے بڑی دل سوزی سے تسلی دینے

”خدا کی بندی! روحوں کو انتقامی جذبول اور امانوں سے کیا واسطہ۔ یہ ہندوانہ فلسفے سے نکل آؤ کہ روح بے جین ہو رہی ہوگی یا تڑپ رہی ہوگی۔ روح کو صرف دعائے مغفرت کی حاجت ہوتی ہے اور اگر فیصل کی وجہ سے کسی ایسی ماں کے سینے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے جو جوان بیٹیوں کی شادی نہ ہو سکے سے پریشان ہے تو تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اس کا ثواب بالواسطہ طور پر تمہاری ساری ہوئی بہن کو پہنچے گا۔ کبھی کبھی اولاد کے نیک اعمال والدین کی بخشش کا باعث بنتے ہیں۔“

”آپ بھی کمال چیز ہیں شفق!“ ناہید مسکرائیں۔

”ہر بات میں ثبوت پہلو تلاش کرنا کوئی آپ سے سیکھے۔ آپ کچھ بھی کہہ لیجیے ہے تو یہ فیصل کی زیادتی کا پانی زندگی کا اتار بڑا فیصلہ میری فکر ہم دونوں کی رضامندی کے بغیر کر لیا۔ اپنی سگی اولاد کی طرح ہم نے ان دونوں کو پالا ہے۔ آپ نے اس کا انداز دیکھا؟ وہ ہم سے اجازت طلب کر رہا تھا، نہ ہم سے مشورہ لینا چاہ رہا تھا، بلکہ ہمیں مطلع کر رہا تھا۔“

”فیصل نے ایسا کچھ نہیں کہا، جنہیں غلط سمجھی ہو رہی ہے۔ میں ابھی تمہارے سامنے اس سے بات کر کے طے کر لیتا ہوں کہ ہمیں کب اس کی چھو بھی کے گھر یا قاعدہ رشتہ مانگنے کے لیے جانا چاہیے۔ اس نے صرف لڑکی کو پسند ہی کیا ہے، ابھی بہت مواقع آئیں گے تم شوق سے اپنے ارمان پورے کرتی رہنا۔“

ابھی وہ آواز دے کر فیصل کو بلانے ہی والے تھے کہ اروما اور ریان چہرے پر عجیب سے تاثرات سجائے سست قدموں سے اس طرف آتے دکھائی دیے۔ اروما کے ہاتھوں میں چند تصاویر دہائی ہوئی تھیں، اس نے لاکر چیکے سے خالہ کے سامنے دھرو دیں۔ انہوں نے تصاویر کو الٹ کر دیکھا اور جیسے کرنٹ کھا کے اچھلیں۔ بلاشبہ وہ تصویر فیصل کی منگنی کی تھی۔ وہ برخوردار سامنے کے بیٹھا تھا اور شاید یہ کفرانِ خدا کے ہاتھوں میں انگوٹھی ڈال رہی تھی۔

بچھی بچھی آنکھوں سے انہوں نے پھر سے اروما اور ریان کا چہرہ دیکھا، وہ دونوں سر جھکا کے رہ گئے۔ انہوں نے بے تابی سے اگلی تصاویر پلٹیں۔ ایک تصویر میں فیصل اپنے چچاؤں کے زرنے میں بیٹھا تھا تو دوسری میں اپنے ذہیر سارے کزنز کے ساتھ گرد پھوٹو، بنوار ہاتھ۔ اگلی تصویر میں بنی سنوری ماریہ زرتار آؤچل سر پر لیے دایاں ہاتھ آگے بڑھائے بیٹھی تھی جس میں فیصل کے بڑے تایا انگوٹھی پہنا رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں سے ایک ایک کے ساری تصاویر سرتی گئیں۔

شفیق نے ایک نظر کارپٹ پر پڑی تصاویر کو دیکھا، ہاتھ بڑھا کے انہیں سمیٹا اور پھر سے

رہنے دیتا ہوں۔“ نہ جانے کیسے وہ مان گیا اور ناہید نے شکر ادا کیا کہ کوئی بات تو اس کی عقل میں سائی۔

البتہ اپنے دوھیال والوں کے معاملے میں اس کی عقل کا کم کرنا چھوڑ دینی تھی۔ ان کی تمام چال بازیوں اس کے سر سے گزر جاتیں۔ فیکٹری کے قائم ہوتے ہی شادی کا مسئلہ اٹھا۔ ناہید اور شفیق دونوں کی خواہش تھی کہ فیصل کی بارات ان کے گھر سے جائے لیکن اس کے تایا نے خواہش ظاہر کی کہ چونکہ فیصل کے سر پرست کی حیثیت سے وہی اس کا رشتہ ماریے کے لیے لے کر گئے تھے، اس لیے بارات بھی ان ہی کے گھر سے جائے گی اور ماریہ رخصت ہو کر بھی ان ہی کے گھر آئے گی۔ البتہ کمال مہربانی سے انہوں نے ولیمہ کا انتظام شفیق صاحب کے سر ڈال دیا کہ آخر خالو نے بھی باپ بن کر پالا ہے، کچھ ارمان ان کے بھی ہوں گے۔

ارو ما کے بھی بیٹیوں والے سارے شوق بچہ کر گئے۔ دولہا کی بہن کی بھی تائیا کے گھر میں ان کی بیٹیوں کے مقابلے میں اسے ذرا اہمیت نہ دی گئی۔ دلہن کی شاپنگ، شادی پر پہننے والے لمبوسات، مہندی کے پروگرامز، دودھ پلائی وغیرہ، ہر رسم میں وہی آگے آگے رہیں۔ پرانے گھر میں شادی منعقد ہونے کی وجہ سے کچھ وہیلے ہی بچھ رہی تھی، اس لیے ہر بات میں چیچھے چھیچھے رہی، حالانکہ اس نے بھیا کی شادی کے بارے میں کیا کیا سوچ رکھا تھا۔ اس کی کوئی دوست بھی شادی میں شرکت نہ کر سکی، وہ تو خیر نہیں تھی۔ جبکہ خالہ، خالو اور یان..... ان تینوں کو تو ذرا بھی لفٹ نہ کرانی گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی سرسری سی پہچان والے کے ہاں تکلفاً مدعو ہیں۔

اس کے باوجود شفیق نے فیصل کا ولیمہ شاندار طریقے سے کرنے میں کوئی سر نہ انداز رکھی تھی۔ ناہید نے اپنی طرف سے ماریہ کو ایک خوبصورت جزا اٹلائی سیٹ تھے میں دیا، ساتھ میں دو بھاری کا دراز مزیں اور تین سوٹ بھی دیئے۔ شادی کے فوراً بعد فیصل ماریہ کو لے کر تایا کے گھر رہنے لگا مگر چند ماہ بعد ہی اس نے فیکٹری کے قریب اپنا بنگلہ بنوانا شروع کر دیا۔ شفیق صاحب نے کہا بھی کہ ابھی فیکٹری کی شروعات ہے، کچھ عرصہ یہ کام نہ رہے، جب کام چل نکلے تو بنگلہ بھی تعمیر کروالیں لیکن فیصل نے شرمساری سے اصل بات بتائی۔

”خالو جان! میں تو واقعی ابھی اس خرچے کا تحمل نہیں ہو سکتا لیکن کیا کروں، ماریہ کی تائیا کی بیٹیوں سے ذرا بھی نہیں بنتی۔ روز ہی نوک جھونک، ٹوٹو نہیں میں، میں ان تینوں کا عادی نہیں، مجھے تو سخت شرم محسوس ہوتی ہے۔ تایا جان کو ابھی بھی کوئی اعتراض نہیں میرے وہاں رہنے پر لیکن ماریہ کو وہ بھی بلا وجہ ڈانٹتے ڈھپتے ہیں۔ اپنی لڑکیوں کو کچھٹ دے رکھی ہے کہ وہ

کے انداز میں کہا تھا۔

”جب باقاعدہ فکشن کروں گا، آپ کو ضرور بلاؤں گا۔“

”اس تقریب میں باہر کا کوئی فرد نہیں تھا۔“

یعنی کہ اس نے کمال ہوشیاری سے ان پر یہ حقیقت جھنڈا بھی تھی کہ وہ ”باہر“ کے تھے اور یہ بھی کہ انہیں ”باقاعدہ دعوت نامہ“ دے کر تقریب میں بلایا جائے گا۔

وہ ساری رات ناہید نے درود کے گزاری اور شفیق صاحب جانے کے باوجود انہیں تسلی تک نہ دے سکے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ایک ہی بار درود جو کہ یہ حقیقت تسلیم کر لیں کہ فیصل نے خود پر سے ان کا اختیار ختم کر دیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

فیصل نے جاب چھوڑ کے ٹیکسٹائل مل لگانے کا فیصلہ کیا۔ شفیق صاحب جانتے تھے، اس کے اس فیصلے کے پیچھے اس کے چچاؤں کے مشورے رہے ہوں گے، اس کے باوجود انہوں نے کوئی تعرض نہ کیا۔ چپ چاپ اسے اظہار صاحب کا ارمانوں سے بتایا بنگلہ فروخت کرتے دیکھتے رہے۔ وہ سارا سرمایہ جوان کی وفات کے بعد انہوں نے فحش ڈپازٹ کر دیا تھا، اب تین گنا ہو چکا تھا۔ اس نے وہ بھی نکال لیا تو ناہید چپ نہ رہ سکیں۔

”فیصل! اپنا سب کچھ اس کا رو پار میں مت بچھو، جس کا تمہیں کوئی تجربہ نہیں۔ ویسے بھی یہ سب تمہارا کیلئے کا تو نہیں، ارو ما کا بھی اس میں حصہ ہے۔ میں اس یتیم بچی کا حق واؤ پر نہیں لگانے دوں گی۔“

”ہتا نہیں آپ کہ قسم کی باتیں کرتی ہیں خالہ جان!“ رفتہ رفتہ اس کے لہجے سے لحاظ اٹھتا جا رہا تھا۔

”میری باتیں جس قسم کی بھی ہیں، سچی ہیں اور تمہیں اس کے بارے میں سوچنا ہوگا۔ شاید اور اظہار بھائی صاحب کی امانت ہو تو دونوں..... اور تم دونوں کی جائیداد بھی۔ تم اب بڑے ہو گئے ہو اور خود مختار ہو، اپنے فیصلے خود کرنے کے مجاز ہو۔ اپنا حصہ تم جہاں چاہو خرچ کرو لیکن تم خود بڑے بھائی بن کے سوچو کہ کیا لیکن کے حصے کی جائیداد کو بیچ کر اتنا رسی کاروبار شروع کرنا درست ہوگا۔“ ان کی بات پر وہ لہجہ بھر کو سوچ میں پڑ گیا۔

”سچی کا رو پار کیا خالہ جان! یہ ہمارا فیملی بزنس ہے۔ تایا جان اور چاچا جی کو اس کا برسوں کا تجربہ ہے۔“ اس نے از خود تصدیق کر دی کہ یہ بزنس وہ کسی کی ایماء پر شروع کر رہا ہے۔ لیکن پھر بھی..... بات آپ کی درست ہے۔ ارو ما کے حصے کی رقم میں بینک میں محفوظ

چاہتی تھی، جبکہ اپنے ماموں کے ارادے سے اسے کچھ نیک نہیں لگ رہے تھے جو فیصل کو تجربہ کار نامہ مشورے دیتے دیتے خود جیٹر میں کی سیٹ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ اپنے بڑے دونوں بیٹوں اور اکلوتے دادا کو وہ پہلے ہی فیکٹری میں مختلف عہدوں پر سیٹ کر چکے تھے۔ چھوٹے چچا بھی ایک اونچا رتبہ سنبالے بیٹھے تھے۔ فیصل خوش تھا کہ اس کی نئی نئی قائم ٹیکسٹائل مل کو اچھے تجربہ کار اور پُر خلوص و کمر لگے ہیں جو اپنے ہیں اور مل کو اپنی ہی جان کر پوری لگن کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر لے آئیں گے لیکن ماریہ ان ”اپنوں“ کو اس کی نسبت زیادہ بہتر جانتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ یہ ”اپنے“ اس کے شوہر کی مل کو کیسے مکمل طور پر ”اپنا“ نہ بنائیں، اس لیے اپنی حکمت عملی کے مطابق اس نے پہلے تو فیصل کو وہاں سے نکالا اور الگ گھر میں لے آئی۔

نئے گھر میں سیٹل ہوتے ہی فیصل نے اردو کو بھی وہاں لے جانے کا عندیہ ظاہر کیا، وہ تو سننے ہی ہراساں ہو گئی۔ ایک تو وہ خالہ کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی، دوسرے وہ اس گھر سے بے حد مانوس ہو چکی تھی اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ ماریہ سے خائف تھی۔ اگرچہ اس ایک سال کے عرصے میں وہ کئی بار کتنے ہی دنوں کے لیے یہاں آ کر رہی تھی مگر اس کی بھائی سے ذرا بھی بے تکلفی قائم نہ ہو سکی۔ شروع شروع میں اس نے اپنی فطری سادگی اور جوش میں اس سے دوستی کرنا جانتی تھی لیکن اس کا دلایا انداز اور سرد مہری بھانپ کر پیچھے ہٹ گئی، اوپر سے اس کا کرید کے اگلے سیدھے سوالات پوچھنا اور کٹ دار جملے اچھالنا اسے مزید متفرق کر گیا۔

بھائی کی شادی پر تیار اور پچھا کی اولادوں نے اس سے جو سرد مہری اور اعتبار برتا تھا، اسے یاد کر کے وہ اب بھی سلگ جایا کرتی۔ ایسے میں فیصل کا اسے ساتھ لے جانے پر اصرار اسے کراڑا لڑ گیا۔

”خالہ جان! اپلیز سمیا کو منع کر دیجیے، وہ یہاں مت آئیں۔“
 ”باؤلی ہوئی تو، میں کیوں منع کر لگی۔ خیر سے اس کا اپنا گھر ہے، جم جم آئے۔“
 ”آئیں گے تو جو ہم ہی لیکن یہاں تو قیامت کی گرمی پر ہی ہے۔ لگتا ہے واپس تو ”پچھل پچھل“ ہی جائیں گے۔“ ریان نے کی بوڑھا پر انگلیاں چلاتے ہوئے دھم اندازی کی۔
 ”میرا مطلب ہے خالہ جان! وہ جس مقصد کے لیے آ رہے ہیں، آپ اس بات کے لیے منع کر دیں۔“

”اسے آئے دو، میں سمجھا دوں گی۔ ایسے اچھا نہیں لگتا کہ اسے فون پر ہی صاف جواب سنا دیا جائے۔ آئے سنا سنے بات سلیقے سے ہو تو جلد سمجھ میں آ جاتی ہے۔“

اپنے سے عمر اور رشتے میں کہیں بڑی ماریہ کو جو مرضی کتنی پھر رہی۔ پہلے میں نے کرائے کے گھر میں شفت ہونے کا ارادہ کیا لیکن اس میں پھونچھی جی کو اعتراض ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ماریہ کے لیے ان کی سرال میں دو تین رشتے تھے لیکن انہوں نے مرحوم بھائی کی محبت میں بھانجے کو بچی دی۔ ایسے میں اگر میں اسے کرائے کے مکان میں رکھوں گا تو انہیں اپنے شوہر اور سرالیوں سے طعنے سننے پڑیں گے کہ خاندان کے اچھے بھلے رشتے چھوڑ کر ایسے لڑکے کو رشتہ دے دیا جس کے پاس ذاتی مکان تک نہیں۔“

”غضب خدا کا... لوگوں کو باتیں گھڑنے میں ذرا خوف نہیں آتا۔“ تاہم فیصل کی ساس کی لن ترانیاں سن کر بچھرنیں۔ ”آجی دنیا کرائے کے مکانوں میں رہتی ہے، اس میں عزت، بے عزتی والی کیا بات ہے اور میں پوچھتی ہوں، ماریہ کے لیے ایسے ہی رشتوں سے بھرے تھال ان کے آگن میں اُلٹے پڑے تھے تو اسے بٹھا بٹھا کے کتنیں سال کا کیوں کر دیا اور اب بھی اگر سرال میں موجود رشتے اچھے رہے ہیں تو باقی دونوں بیٹیوں کے لیے کیوں نہیں سوچ لیتیں جو بیاہ دی، سویاہ دی۔ اب اس کے میاں کی مرضی محل میں رکھے، چاہے کیا میں۔“

”تم خاموش رہو تاہم! شفیق صاحب نے ٹوکا۔“ میری صلاح سے فیصل بیٹا! ابھی سال دو سال بچکے خیر نے یا بغیر کرنے کا ارادہ رہے۔ وہ تمہاری فیکٹری اللہ کرے دن دگنی رات چوٹی ترقی کرے پھر شوق سے.....“

”جبوری سے خالہ جان!“ اس نے اکتا کر بات کاٹی۔ انہیں سخت برا لگا مگر خاموش رہے، بعد میں ریان نے بھی کہا۔

”آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آپ نے انہیں ”دواغ“ کر دیا ہے، اب وہ پرانے دہس بیاہے گئے ہیں اور پرانا دھن ہو گئے ہیں، آپ نے سنا نہیں۔“ پتر تے دھن پرایا دے بابا.....“ اور مشرقی والدین بیٹے رخصت کرنے کے بعد ان کی زندگی میں دخل نہیں دیتے وہ جاں اور ان کی سرتاجی۔“

ماریہ جج کی ”سرتاجی“ تھی عمر میں وہ فیصل سے ڈھائی برس بڑی تھی اور عقل و فراست میں شاید صدیوں بڑی تھی۔ ماں کے کہنے پر پہلے تو اس نے فیصل کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ بڑے ماموں کو بھی متھی میں کیا، یہاں تک کہ خود انہوں نے فیصل کے لیے اس کی راہ ہموار کی اور جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو اس نے بڑی ہی ہوشیاری کے ساتھ فیصل کو لے کر یہاں سے نکلنے کا پروگرام بنایا کیونکہ فیصل اور اس کی جائیداد پر وہ مکمل طور پر حاوی ہونا

کو آلو بنانے میں مصروف ہیں۔ ایک سے تو ملاقات کا وقت بھی ملے۔“
 اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی ریان نے بھنا کر نزدیک پڑی ڈسٹری اے
 اٹھا کے دے ماری۔ وہ ایک طرف ہو کے بچ نکل لیکن وہ خود کو ماں کے شاندار باؤنسر سے نہ
 بچا پایا۔ ان کے سامنے دھری ساگ بنانے کی نوکری اس وقت اس کے سر پر اوندھی پڑی تھی۔
 ”بد تیز، کیسے اٹھا کے یہ پہلوان سی کتاب اسے دے ماری۔ اگر جج جج ٹنگ جاتی
 تو.....“

”تو کیا..... غکرت کریں، مرنے والی نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یادداشت چلی جاتی
 یا پھر کوئے میں چلی جاتی اور میں کون نے گا تا پھر تا۔“
 ”شانتی اوم..... شانتی شانتی.....“

”کوئے میں جاسیں میرے دشمن بلکہ فل اسٹاپ میں جاسیں۔ میں تو فیصل آباد جاری
 ہوں۔“ اس نے یوں اتر اتر کے کہا جسے فیصل آباد نہیں سوسٹر لینڈ جاری ہو۔
 ”اس کا مطلب ہے، میں ابھی بھی یہی گاسکتا ہوں..... شانتی..... شانتی..... شانتی.....“

☆=====☆=====☆

اور تب وہ پہلی بار اس گھر کو چند روز کے لیے چھوڑ کر کہیں اور رہنے گئی۔ اس گھر میں جو
 اس کے بھائی کا گھر تھا اور اصولاً اسے اس گھر کو اپنا ہی کہنا چاہیے بلکہ اپنا گھر بھی چاہیے تھا
 اور اس نے کوشش تو یہی کی تھی۔ بے شک وہاں ہمیشہ کے لیے رہنے کا خیال سو ابان روح تھا
 اور ماری بھی بھائی کا شب و روز کا ساتھ تھی ایک اذیت تاک تصور۔ اس کے باوجود بھائی
 کے گھر جانے کی ایک اپنی ایک سائنٹ تھی جو اب جاتے ہی جھاگ کی طرح جھٹ گئی۔ اچھا
 خاصا کشادہ ڈبل اسٹوری گھر تھا مگر بھیما کے سرالیوں سے اہل اہل رہا تھا۔ ڈھیر سارے
 اجنبی لوگوں کے درمیان وہ بری طرح گھبرا گئی۔ جب فیصل اسے لینے آیا تھا تو ریان نے بھی
 چند روز کے لیے ساتھ چلنے کا پروگرام بنالیا تھا۔ اسے سمجھ کیلچ سے بھڑپائی ہی تھیں مگر فیصل
 نے منع کر دیا۔

”یار! تم پھر کبھی آ جانا، خالہ جان! پلینز آپ برا مت محسوس کیجیے گا..... گھر میں بہت
 جگہ ہے اور ریان کے آنے سے مجھے خوشی ہوگی لیکن دراصل آج کل ماری کی بہنیں رہنے آئی
 ہوئی ہیں، اچھا نہیں لگے گا گھر میں لڑکیوں کے ہوتے ہوئے ریان بھی رہنے آ جائے۔
 آپ سمجھ رہی ہیں نا میری بات۔ میرا تو وہ بھائی ہے مگر ماری کی بہنوں کے لیے تو غیر ہے۔“
 ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، بچیاں واقعی بہن کے گھر کھل کے رہیں پائیں گی۔۔۔ یان! تم

”وہیے تمہیں اعتراض کیا ہے، ہو آؤ چند دن فیصل آباد۔ سنا ہے، دوسرا ناچسٹر ہے۔
 تمہاری بھی تبدیلی آ رہی ہو جو جانے کی اور ہماری بھی۔“
 ”تمہاری کیسے؟“ اس نے ریان سے پوچھا۔
 ”تمہارے جانے کے بعد محسوس ہوگا، نو کے تمہارے باؤنسر کے جیسے لگیں گے اور
 ہوائیں مکی مکی سی محسوس ہوں گی۔“

”دیکھ رہی ہیں آپ خالہ جان!“ ”لوگ“ ابھی سے ہمارے میدان چھوڑ جانے کی
 خوشیاں منا رہے ہیں اور آپ جانتی ہیں کہ میں ایسا ہونے دوں، نا ممکن۔“
 ”جی ہاں ”لوگوں“ کی خوشیاں ملایا میٹ کرنا تو آپ کی پرانی عادت ہے۔“
 ”بس ابھی کرو، وہ منٹ سکون سے نہیں بیٹھ سکتے تم دونوں۔ اروما۔۔۔ جینا۔۔۔ جانو۔۔۔“
 خالہ جان نے پچکارا۔

”دیکھو اروما! بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، میں اب فیصل پر زور نہیں دے سکتی۔ ویسے بھی
 ماری کو پسند نہیں میرا اس پر حق جتانے، وہ افسردہ ہو گئیں۔“ ”اگر میں نے سختی سے تمہیں یہاں
 روکنے کی کوشش کی تو وہ اٹلے، دماغ کی عورت ضد باندھ لے گی اور صرف مجھے نچا دکھانے کے
 لیے فیصل کو مجبور کرے گی کہ وہ تمہیں ہمیشہ کے لیے وہاں لے آئے، سو حالات کا تقاضا یہی
 ہے کہ تم مصطفیٰ ہی سہی کچھ روز کے لیے چلی جاؤ۔ اس کا شوق پورا ہو جائے گا۔ اپنی کمائی سے
 گھر بنایا ہے۔ دل چاہتا ہے ناں کہ بہن آ کر رہے۔ تم اس کا دل رکھنے کی غرض سے چلی
 جاؤ پھر بڑھائی کا حرج ہونے کا کبہر کر لوٹ آنا۔“

”اور ان چند دنوں میں ان کا چاؤ بھی پورا ہو جائے گا تمہیں گھر رکھنے کا۔“ ریان نے
 پھر دہرایا۔ ”شرط لگاؤ، چند دن بعد ہی وہ تمہیں یہاں شکرے کے ساتھ واپس کرنے آئیں
 گے اور ساتھ ہی امی، ابو اور میرے بیروں کو ساتھ لگا لگا کر خراج تحسین پیش کریں گے کہ یہ
 آپ کا ہی حوصلہ ہے، ہماری اتنی تاب کہاں۔“

”خالہ جان! آپ کو پتا ہے، ریان کیپیوٹر پر کیا کر رہا ہے۔“ اروما نے جوانی کا رروائی
 کے طور پر آپک کر اسکرین پر چھانکنا۔

”لگا ہو کسی لڑکی سے چیٹنگ چیٹنگ کرنے..... اور ان لڑکوں کو کام کیا ہے کیپیوٹر سے،
 ہر کارآمد چیز سے غلط کام لینا کوئی ان پاکستانی نوجوانوں سے سکھے۔“ خالہ جان نے اکتاہٹ
 بھرے انداز میں سر ہلا کے کہا۔

”نہیں خالہ جان! یہ موصوف خود ”جلیبی حسینہ“ کے فرضی نام سے بیک وقت دو دو لڑکوں

پھر کمری ویک اینڈ پر بھائی کے گھر چلے جاتا۔
 ”دیکھن پھر کمری ویک اینڈ پر اردو تو وہاں نہیں ہوگی۔“ اس نے آہستہ سے کہا تو وہ چونک کے اسے دیکھنے لگی تھی لیکن اس کے چہرے پر شرات کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ سمجھ گئی کہ ریان صرف اسے تنگ کرنے کی نیت سے ساتھ جانا چاہ رہا تھا اور تب اس نے سچ سچ شکر ادا کیا تھا کہ بھیا نے خود ہی اسے منع کر دیا اور اب گھر میں اوپر نیچے دندناتے بھانیت بھانیت کے لوگوں کو کچھ کہہ کر حیران تھی۔

”بھیا نے تو کہا تھا ان کی سالیان یہاں رہنے آئی ہیں۔ یہ تو بتایا نہیں کہ ان کا سالا بھی نہیں ڈیرے ڈالے ہوئے ہے اور ماریہ بھائی کی بچپن کی کھلی ٹھیکہ اپنے تین جنات کی نسل کے بچوں اور ہشہ جئات قسم کے شوہر کے ساتھ بوروالہ سے فیصل آباد رہنے آئی ہوئی ہے۔ بھیا کی سالیان کیا زیادہ پردہ دار ہیں یا ریان ہی کچھ ایسا ناقابل اعتبار تھا ان کے نزدیک جو وہ اسے یہاں نہیں لائے اور کیا وہ اپنے سالے کو منع نہیں کر سکتے تھے یہ کہہ کر میری بہن یہاں آ رہی ہے، تم چلے جاؤ اور یہ ٹھیکہ بائنی کا نظر باز شوہر..... یہ کس رشتے سے آتی ہے نکلتی ہے ڈیرے ڈالے بیٹھا ہے۔ عجیب دوغلی سوچ ہے بھیا کی۔“ وہ گڑھ کرہ گئی۔

اگلے پانچ روز اس نے بڑی مشکل سے گزارے۔ پہلے دو روز تو زبردستی خود کو واپس جانے کی ضد سے روکا کہ بھیا کیا سوچیں گے اور تیسرے دن جب واپسی کا تذکرہ کیا، اس کی توقع کے برعکس بھیا نے حذر کرنے پر اصرار کر کے بھیاے کہہ دیا کہ اتوار کو چھوڑ آؤں گا۔ اتوار کے آنے میں دو روز باقی تھے، وہ دل سوس کر رہ گئی۔ یہاں دن بھی تو پہاڑ سے لمبے تھے۔ حالانکہ گھر میں ہر وقت کی قربت کا گمان ہوتا تھا۔

صبح نو بجے سے لے کر دوپہر بارہ بجے تک ناشتہ چلا کرتا پھر ٹھیکہ بائنی اور ماریہ بھائی اپنی پرانی دوستوں سے ملنے ملانے چلی جاتیں۔ ٹھیکہ بائنی کے بچے پورے گھر میں فساد برپا رکھتے اور ان کے ابا جان فیصل بھیا کی تینوں سالیوں کے درمیان راجہ اندر بن کے بیٹھے رہتے۔ وہ پٹاخہ لڑکیاں نہیں انوکھائی جاتیں اور وہ مزے سے بنتے جاتے۔ بے چارے سمجھ رہے تھے کہ وہ ان پر بری طرح فریفتہ ہیں اور ماریہ بھائی کا اکلوتا بھائی اپنی بڑی بہنوں کی حرکتوں سے انجان بنا مسلسل اردو مائے گرد چکر لگاتے میں مصروف رہتا۔ وہ دکھلا کے کمرے میں پناہ لیتی تو چھت چھاڑ دینے والے والیم میں بے ہنگم گانے لگا کر اڑاتا۔ کبھی ”اساں تیری گل کرنی“ گل کرنی اسے ڈیڈی نال.....“ لگا ہوتا تو کبھی ”اچیاں چاچاں والی“ کانوں کے پردے چھاڑ رہا ہوتا۔

شام کو فیصل کے آنے سے پہلے پہلے ماریہ گھر پہنچ چکی ہوتی اور ساتھ ہی اس کے کانوں تک اردو کی دن بھر کی مصروفیت کی رپورٹ بھی پہنچ چکی ہوتی اور فیصل کے آنے پر وہ بڑے گلے کے ساتھ سب دہرا دیتی۔

”اردو ما تو ہمیں اپنا بھتیجی ہی نہیں، ذرا نہیں گھلتی جلتی، سارا سارا دن کمرہ بند کیے بیٹھی رہتی ہے۔ میرا تو خیال تھا، وہ آ رہی ہے، خوب روٹی لگے گی، کھونٹے پھرنے کے پروگرام بنائیں مگر وہ تو دو گھنٹی ساتھ بیٹھنے کی روادار نہیں۔ شاید ہم لوگ اسے پسند نہیں۔ ناشتے کے وقت کمرے سے نکلتی ہے اور دوسری بار دوپہر کے کھانے پر اور آج تو دوپہر کو بھی کھانا ٹرے میں رکھ کے اپنے کمرے میں لے گئی چلیں، مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، ٹھیک ہے اس کی عادت ایسی ہی ہوگی۔ آپ کی خالہ نے ابھی تربیت نہیں کی تو اس بے چاری کا کیا قصور۔ اب اسے کسی نے اپنی کپڑیں سبز نہ سکھائے ہی نہیں کہ..... دیکھیں ناں، ٹھیکہ کتنا برا محسوس کرتی ہوگی۔ میری بہنوں کی تو بات چھوڑیں وہ کوئی غیر نہیں، اگر برا لگے گا بھی تو آپ کی وجہ سے نظر انداز کر دیں لیکن مہمانوں کے سامنے اپنا کھانا نکال کر الگ لے جانا کتنا بے عزت کرنے والا کام ہے۔“

اور فیصل فوراً اٹھ کے اس کے پاس چلا آتا۔

”انتہی بڑی ہو گئی ہو مگر تمہیں لوگوں کے ساتھ رہنے کا طریقہ، سلیقہ نہیں آیا۔ ماریہ میری بیوی ہے، تم اس سے محبت نہیں کر سکتیں نہ کر دو، عزت نہیں دے سکتیں مت دو مگر کم از کم لجا ڈا تو کر لو۔ تمہارے طور طریقوں پر وہ کتنی شرم محسوس کرتی ہے۔ کیا تکلیف ہوگی تمہیں جو تم کچھ وقت گھر آئے مہمانوں کے ساتھ گزار لو۔ اس طرح منہ بٹاکے کمرے میں بند رہ کر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔“

اس کے توراٹتے خطرناک اور الفاظ اتنے سخت ہوتے کہ وہ دل ہی دل میں معظم کی شکایت لگانے کا ارادہ کرنے کے باوجود چپ کی چپ رہ جاتی۔ اسے خود اپنی اس خود ساختہ نظر بندی سے، انھیں محسوس ہو رہی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ معظم اور ٹھیکہ بائنی کے شوہر نڈر بھائی جان کی نظریں اور فقرے زیادہ انھیں کا باعث بنتے تھے۔

خدا خدا کر کے یہ چند دن گزرے اور فیصل اسے واپس لاہور چھوڑنے آیا۔ اس نے خالہ سے بہن کے گریز پر پھر سے رویے کی شکایت بھی کی۔ ان کے باز پرس کرنے پر بھی وہ خاموش ہی رہی۔ دل تو چاہ رہا تھا ان کی شفقت بھری آغوش میں خود کو چھپا کر معظم کی ایک ایک ذلیل حرکت اور ماریہ بھائی کی چشم پوشی سے لے کر بھیا کی جانب داری تک سارے

شکوے سنا ڈالے مگر اس کی خاموشی میں بھی ایک مصلحت تھی، وہ ان سے ذکر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ وہ بھیا جو ریان کو صرف اس لیے نہیں ساتھ لے جا سکے کہ ان کے خیال میں ماریہ کی بہنوں کی موجودگی میں ایک جوان جہان لڑے گا وہاں جانا مایوس تھا۔ وہی بھیا اپنی بہن کو وہ دو مسنڈوں کے ساتھ چھوڑ کر سارا سارا دن غائب رہتے تھے۔

وہ جانتی تھی کہ خالہ کو یہ حقیقت جان کر دکھ ہوگا، و انہیں دکھ نہ پہنچانے کی غرض سے اس نے اپنا دکھ اندر ہی اندر پیکی لیا لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ تہیہ بھی کر لیا کہ اب وہ کبھی وہاں نہیں جائے گی۔ بھائی کی عیاریوں اور سب سے بڑھ کر بھیا کی دغلی پالیسی اور بے حسئی نے اس کا دل تو زودیا تھا۔

لیکن جب وہ سینڈ ایئر کے انگریز دے رہی تھی ماریہ بھائی کی دوسرے بچے کی پیدائش نزدیک تھی اور فیصل کا اصرار تھا کہ اروا پیچہ دیتے ہی فیصل آباد آجائے کیونکہ ماریہ اس حالت میں گھراور بیٹے دونوں کو سنبھالنے سے قاصر ہے۔ اس بار ناہید بھی اروا کا ساتھ نہ دے سکیں۔

”بننا! وہ تمہارا بھائی ہے، اس کا تم پر حق بنتا ہے بلکہ یہ تمہارا بھی فرض ہے۔ پیچہ ز کے بعد تم یوں بھی دو ڈھائی ماہ تک فارغ ہو۔ کیا حرج ہے جو بھائی کا گھر سنبھال لو گی۔ وہاں ماشاء اللہ نوکر چاکر ہیں، کون سا تمہیں ہل جوتا ہیں۔ بس ذرا گھریا اور بیٹے کا دھیان ہی تو رکھنا ہے۔“

”لیکن وہ میں کیسے رکھوں گی۔ خالہ جان! آپ خود ہی تو کہتی ہیں کہ میں لا پر وادہ ہوں، غیر ذمہ دار ہوں اور یہ کہ مجھے کچھ نہیں آتا، میں کوئی کام بھی نہ ڈھک سے نہیں کر سکتی۔“ اس نے خوشی خوشی اپنی خصوصیات گونا گویں کہ شاید وہ متاثر ہو جائیں لیکن انہوں نے رد کر دیا۔

”اس طرح تو تمہیں کبھی کچھ نہیں آئے گا۔ سر پر پڑے کی تہیہ ہی کچھ نہ کیگی۔“

”آخر پچھلے سال بھی تو... میرا مطلب ہے کہ مری کی دغلی بھی تواریہ بھائی کی بہن آگئی تھی، وہ سارہ... چلو اس کی چھٹی ہوئی۔ یعنی وہ شادی کے بعد لاہور آگئی لیکن ابھی وہ مازہ بھی تو ہے، بھیا اسے لے آئیں۔“

”اس کی شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

”تو وہ پچھو بھی جان کس مرض کی دوا ہیں۔ وہ آجائیں اپنی لاڈلی بیٹی کے پاس۔“

”اور تم کس دبا کی دیکھیں ہو تم کیوں نہیں چلی جاتیں، اپنے لاڈلے بھیا کے پاس۔“

ریان کی بات پر اس نے تڑپ کے دبا ہائی دی۔

”کیا تھا جو تم کچھ دیر باہر چل خوار ہوتے رہے۔“

”بجٹ ختم کرو، بس میں نے کھد دیا کہ تم فیصل کے ساتھ جاؤ گی۔“

”تو پھر آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔“

”میں... بننا! میں کیسے...“ انہیں چلنے پر اعتراض نہ تھا مگر فیصل نے کبھی جھوٹے منہ

ساتھ چلنے کو نہ کہا تھا۔ وہ کیسے چلی جاتیں۔

”تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے، یہاں بھی تم میری ماں کو چھٹی دیتی ہو اور اگر کبھی جو تمہارے منظر سے غائب ہونے کی سبیل نکلتی ہے تو بے شک تم انہیں ساتھ لے جانے پر بعد ہو۔ جان چھوڑ دو بی! اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تو وہ اور ضد میں آگئی۔

”ساری زندگی جان نہیں چھوڑوں گی، سمجھے۔ اور ہاں، چھٹی رہوں گی تمہاری ماں سے۔“ وہ ناہید سے چٹ گئی۔ ”کرلو جو کرنا ہے۔“

”جو تک۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ ناہید نے اپنے شانے پر رکھے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور مسکرا دیں۔ ابھی ابھی اس وقت انہیں ایک بڑا خوش کن سا خیال آیا تھا۔

”پلیز خالہ جان! کچھ بھی کریں لیکن مجھے نہیں رہنے دیں۔“ وہ پھر منمنائی۔

”ہاں ہاں، تم یہیں رہو گی۔“ انہوں نے مسلسل مسکراتے ہوئے اپنے ہی خیال کی تائید کی۔ بعد میں فیصل کو طرے سے سمجھایا۔

”ارو پچی یہ فیصل! اسے کیا یہ ماریہ کی اس حالت میں کیسے کیڑ کر رہی ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں، اگر تم اسے لے جانا چاہتے ہو، بلکہ وہ خود بھی خوشی خوشی تیار ہے مگر اتنے سے بچکوسنبھالنا اس کے بس سے باہر ہے۔ اتنے جھوٹے بچے کی سوسروریا ت ہوتی ہیں، وقت پر دودھ، پیٹی بدلنا، سلا نا وغیرہ۔ ایسا نہ ہو کہ تم اسے اپنی سہولت کے لیے لے جا رہے ہو، الٹا تمہیں اسے بھی سنبھالنا پڑے۔ تو بڑی جلدی گھبرا جاتی ہے۔ میری مانو تو تم کسی تجربہ کار خاتون کو چند روز کے لیے گھر لے آؤ تمہاری بچیاں ہیں، پھر بھیا ہیں۔“

فیصل کو بات تو لگا مگر ان کی بات بھٹلا بھی نہ سکا مگر یہ جنتا دیا۔

”لیکن خالہ جان! آخر آپ کب تک بیٹی ہی بنائے رکھیں گی اسے، تیا جان کی نمی بھی ایف اے کے پیچہ ز دے رہی ہے مگر سارے گھر کو سنبھالنا ہوا ہے اس نے، اتنا لاڈ پیار دے کر آپ نے اس کا بیڑا غرق کر کے رکھ دیا ہے۔ کل کو اس کی شادی بھی کر رہی ہے، یہی حالات رہے تو آپ ایمانداری سے بتائیں کہ کیا اس کا گزارا نہیں ہوگا۔“

”اپنے تیا کی لڑکی کی بات تم نے خوب کہی۔“ ناہید کو تاؤ آگیا۔ ”وہ کہاں سے میری

وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ کسی مناسب وقت کا..... اور وہ وقت آ ہی نہ رہا تھا..... بہت زیادہ دن نہ گزرے تھے جب اس کے دل نے پہلی بار اردو ماکے لیے کوئی سرگوشی کی تھی اور اتنا تھم غرہ بھی نہ ہوا تھا ان سرگوشیوں کو سنتے ہوئے مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ دل کی ان سرگوشیوں کو سن کر چپکے سے ہنس دیتا تھا، کہتا چکھ نہیں تھا۔ کبھی بھی کیا اور کس سے کہتا۔ اس سے جو ابھی تک خود انجان تھی..... اس کے دل کی بدلتی حالت سے کیسے واقف ہوتی۔ کبھی کبھی اس کا دل شدت سے چاہتا کہ دل کی اس سرگوشی کو کھرے سے اس کے کان میں دہرا دے مگر تصور میں اس کی دہشت سے کبھی ہلکے اور غیر ہوتی حالت دیکھ کے خود کو بمشکل باز رکھتا۔ اس کے خیال میں اردو ابھی اتنے اہم راز میں شریک ہونے کی تحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ البتہ لڑائیوں میں وہ شریک تھی۔ ریان کے ساتھ زبانی کلائی معرکوں میں اس کے جوہر خوب کھلا کرتے۔ اسے بھی اردو ما کو سنا کر مزہ آتا۔

یونہی لڑتے بھگڑتے دو سال اور بیت گئے۔ اب اس میں پہلے کی نسبت خاصا ٹھنڈا آ گیا تھا۔ پہلے کی طرح وہ بات بات پر کٹ کٹا کھانے کو نہیں دوتی تھی۔ ریان کو خاصی دیر سر کھانا پڑا تا تب کہیں جا کے وہ غصے خیز کرتی۔

☆=====☆

وہ فائل ایئر کے ایگزامینر سے کہ فارغ تھی جب فیصل، ماریہ، فنی اور رانی کو نے کر لاہور آیا۔ ماریہ کے ہاں تیسرے بچے کی آمد آتی تھی اور اس بار ڈاکٹر نے مینیریٹ کا بتایا تھا۔ لاہور ہی کے ایک بڑے پرائیویٹ کلینک میں انتظام کیا گیا تھا۔ ڈیٹ سے چند روز پہلے ہی نایبید کے اصرار پر وہ اسے یہاں لے آیا۔ ویسے بھی نایبید کا ارادہ اس بار فیصل سے اردو اور ریان کی بات طے کرنے کا تھا لیکن فیصل شاید پہلے ہی بہت کچھ طے کر کے آیا تھا۔ اس نے خالد سے تذکرہ کیا۔

”پوچھ بھی جی نے معظم کے لیے اردو ما کا ہاتھ مانگا ہے۔“

”کیوں؟“ وہ کجا بکا کر نہیں۔

”کیا مطلب، کیوں؟ کبھی ظاہر ہے، کوئی کسی لڑکی کا ہاتھ اپنے بیٹے کے لیے کیوں مانگتا ہے۔“ وہ جیس پہ جیس ہوا۔

”لیکن کیا انہیں پتا نہیں کہ ان کی اپنی بیٹی اس گھر کی بہو ہے اور نہ ہمارے خاندان میں وٹے سنے کا رواج ہے نہ ہی ان کے، پھر انہوں نے ایسا سوچا بھی کیسے۔“

”یہ ونڈر شیج میں کہاں سے آ گیا۔ ایک ہی گھر کی بات ہے۔ نہ وہ غیر ہیں، نہ ہم جو یہ

اردو ماکے ہم عمر ہو گئی۔ پتا نہیں درمیان کے کتنے سال گھر بھائے رکھا رشتے کی آس میں اور اب جب چار پیسے بھرے جز گئے تو کالج ڈال دیا پچیس سال کی لڑکی کو۔ اتنا عرصہ گھر بیٹھی رہی، ظاہر ہے گھر کے کاموں میں ماہر تو ہو گئی۔ اردو ما چندرہ سال کی تھی جب یہ ٹرک کیا اور ایسی بھی پھو بڑ نہیں۔ لاڈ پیرا پیار جگہ لیکن میری تربیت کو آئے دن الزام مت دیا کرو۔ شفیق کا بس چلے تو اسے تنکا توڑنے دیں پھر بھی میں نے اسے گھر کے کاموں میں لگا رکھا ہے۔ شام کی چائے وہ بناتی ہے، رات کو روٹیاں ڈالتی ہے، کبھی کبھی آٹا بھی کونڈھ لیتی ہے، کبھی کبھی دن صفائی کرتی ہے، پچھلی چھینوں میں جاکیز بلینگ کے کورس بھی کیے ہیں۔ سوچ رہی ہوں ان چھینوں میں اسے سلائی کٹائی بھی سکھا ڈالوں لیکن ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ تمہارا گھر ماشاء اللہ آئے گئے والا ہے۔ اسے اتنے لوگوں میں رہنا نہیں آتا، کجا کہ وہ سنبھال پائے گی۔“

”یہی تو میں کہنا چاہتا ہوں، اسے ہر ماحول میں ڈھلنے کی عادت ہوئی چاہیے۔ اگر اس کی شادی کسی بھر سے نہ ہو گئی ہوگی تو.....؟“

”اس بار سے میں بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اس پر اپنا وہ خیال ظاہر کرنا چاہتی تھیں جو کہ ابھی تک انہیں سوچنا تھا اور جس نے اچانک ان کے اندر اطمینان ہی اطمینان بھر دیا تھا لیکن وہ رک نہیں۔ شفیق صاحب نے تو مشورہ دیا تھا کہ فیصل کو بھی اعتماد میں لے کر اس فیصلے میں شریک کر لیتا چاہیے مگر نایبید نے انکار کر دیا۔

”یہ تو طے ہے کہ ابھی دو تین سال تک اردو ماکے شادی کرنا مناسب نہیں۔ کم از کم وہ میں ایس کی تو ہو جائے، اس کا گریجویٹس بھی ہو جائے پھر سوچا جائے گا۔ اس سے پہلے اردو اور ریان کی بات پچھل جانے سے سوچنا تھیں پیدا ہو گئی۔ ایک وہ سب سے بڑا فتنہ تو خود فیصل کی بیوی ہے..... وہ درہ..... میں اسے اتنا وقت نہیں دینا چاہتی کہ وہ کوئی چال چلے۔ مارے حسد کے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے اور ایک بات ابھی بھی ہے۔ وقت سے پہلے دونوں کی نسبت کا اعلان اردو ماکے اس گھر میں رہنا مشکل بنادے گا۔ فیصل بھی اعتراض کرے گا کہ وہ شادی سے پہلے بہن کا بہاں رہنا پسند نہیں کرتا۔ خواہ مخواہ کے مسئلہ پیدا کرنے کے بجائے بہتر یہی ہے کہ ڈیڑھ دو سال انتظار کر لیا جائے، اس کا بی بی اسے پورا ہوتے ہی میں فیصل سے بات کر لوں گی۔“

نایبید کو ہر بات اور ہر کام کا وقت پر طے ہونا پسند تھا۔ وقت سے پہلے کسی بھی بات کا ڈھنڈورا پیٹنا ان کا اصول نہ تھا اور شاید ان کی یہی عادت ریان میں بھی آ چکی تھی۔ وہ بھی

روایتی باتیں دہرائی جائیں۔ ویسے بھی رشتہ اچھا ہو تو یہ فرسودہ رواج نظر انداز کرنے پڑے ہیں۔“

”مثلاً کس لحاظ سے اچھا ہے یہ رشتہ؟“ انہوں نے قہقہے سے دریافت کیا۔

”سب سے بڑی بات یہ کہ رشتہ خاندان کا ہے، پھوپھی جی جی غیر نہیں ہیں۔ وہ اروما کو بہو نہیں، بیٹی جان کے پیار دیں گی۔ اسے بھی سرسال میں ایڈجسٹ ہونے میں وقت نہیں لگے گا۔ دوسری بات معظم پر حا رکھا، خود نو جوان ہے۔ ٹھیک ٹھاک کما لیتا ہے اور کیا چاہیے۔“

”اور اگر میں اس سے بزار گنا اچھا رشتہ پیش کروں..... تو؟“

”کس کا؟ کیا کوئی اور بھی پیام آیا ہے اروما کا؟“ اس نے تیوری چڑھا کے پوچھا تو

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ریان کا جو تمہارے تائے رشتے سے ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ وہ بھی خاندان ہی کا ہے، میں بھی کوئی غیر نہیں اور تمہاری پھوپھی جی سے کہیں زیادہ میں اروما کو پیار دوں گی بلکہ دینی آئی ہوں۔ میری بھی وہ بہو نہیں بلکہ بیٹی ہوگی۔ یہاں وہ صرف آسانی سے ایڈجسٹ نہیں ہوگی بلکہ پہلے ہی سے ایڈجسٹ ہے، ریان تمہارے سالے کی نسبت زیادہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ دیکھنے میں بھی اس سے زیادہ خوب رو ہے۔ تمہارا سالہا تمہاری ہی ٹل میں ملازمت کرتا ہے جب کہ وہ ایک ملٹی ٹینشل کمپنی میں جاب کر رہا ہے اور اس کے پاس ترقی کے کئی مواقع ہیں۔ اروما کو احساس کمتری بھی نہیں ہوگا کہ اس کا شوہر اس کے بھائی کا ملازم ہے۔ اب تم بتاؤ کہ تمہیں اور کیا چاہیے۔“

ایک پرو پوزل فیصل نے ان کے سامنے رکھا تو ایک انہوں نے اس کے سامنے رکھ دیا۔ انہیں سوچنے کی ذرا بھی ضرورت نہیں تھی جب کہ فیصل سوچ میں پڑ گیا تھا۔ جو بھی تھا بہر حال وہ اروما کا بھائی تھا اور اس کے لیے بہتر یہ سوچنا چاہتا تھا۔ ریان اسے ہر لحاظ سے معظم کے مقابلے میں نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھا کہ اروما اس گھر کے ماحول میں اچھی طرح رچ بس گئی ہے..... ایسے میں اگر وہ حتمی فیصلہ کرنے سے ہچکچا رہا تھا تو وجہ صرف ماریتی تھی جو اس پر معظم کے لیے بے طرح دباؤ ڈال رہی تھی اس نے ماریہ کے سامنے خالہ کی بات رکھی تو حسب توقع وہ ہنسنے لگی۔

”میں تو پہلے ہی کہتی تھی، یہ ضرور کوئی جھنڈا ڈالیں گی۔ بڑی بری عادت ہے انہیں ہر معاملے میں دخل اندازی کرنے کی۔ اب اور کچھ نہیں سوچنا تو اپنا لڑکا لے کر چل میں ٹپک پڑیں۔ ساری غلطی آپ کی ہے، کیا ضرورت تھی یوں سر جوڑ کے مشورہ کرنے کی۔ سیدھا

سیدھا فیصلہ سنا دینا تھا چار لٹروں میں پکڑا کے خالہ جان مبارک ہو، اروما کا رشتہ طے کر آئے ہیں۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، بہر حال وہ ہمارے بڑے ہیں برے وقت میں ہمارا سہارا بنے ہیں اور اروما کی تو ساری ذمہ داری ہمیشہ سے ہی انہوں نے بھائی سے پھر میں کیسے غیروں کی طرح انہیں یہ خبر سنا آتا۔ میں نے تو اپنا فرض سمجھتے ہوئے ان سے مشورہ کرنا چاہا تھا۔“

”اور انہوں نے رنگ میں بھگ ڈالنے کو اپنا فرض سمجھتے ہوئے سارا مسئلہ ہی الٹ دیا۔“

”کیا حرج ہے اگر ریان کے بارے میں بھی سوچ لیا جائے۔ اس نے دبے دبے انداز میں صلاح دی۔

”حرج.....؟ بات میری عزت کی ہے، میرے بھائی کا رشتہ پہلے آیا ہے اگر اسے مسترد کر کے کسی دوسرے ایرے غیرے کا رشتہ قبول کیا تو یہ نہ صرف میری بلکہ میرے پورے خاندان کی بے عزتی ہوگی۔ ایسا سوچنے کی بہت بھی کمزرتا۔“

”اوہو! کیوں خواہ مخواہ مجھڑی ہو۔ ایک وقت میں وہ یاد سے زیادہ رشتے آ جانا کوئی انہونی بات تو نہیں۔ بیٹیوں والے گھروں میں تو یہ ہوتا ہی ہے اور دیکھ بھال کے سب سے بہتر رشتہ منتخب کیا جاتا ہے۔“

”اچھا تو وہ بڑی بلا اب میرے سویرے بھائی سے بہتر ہو گیا۔“

”میں نے یہ کب کہا۔ میں تو صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم اروما کی ہی مرضی جان لی جائے۔ ریان میرا دیکھا بھلا ہے اور معظم میں بھی کوئی برائی نہیں۔ میری نظر میں دونوں رشتے مناسب ہیں ہاں بس اروما کا فیصلہ آخری ہوگا۔ اگر وہ معظم کے حق میں ووٹ دیتی ہے تو خالہ جان کی ناراضی کی بھی مجھے پروا نہ ہوگی لیکن اگر وہ ریان کے حق میں فیصلہ سناتی ہے تو تیری.....“ وہ رک کر پھر مضبوط لہجے میں حتمی بات سنادی۔ ”پھر تمہیں اعتراض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ کسی اعتراض کو خاطر میں نہ لانا لگا۔“

ماریہ اس کے تہیور دیکھ کے تملاتی ضرور مگر مصلحت کا تقاضا تھا کہ نرمی مگر ہوشیاری سے معاملہ سمجھا لیا جائے، اس لیے پھر سے جیتنا ابدلا۔

”ہاں یہ کی ہے تان اب عقل والی بات، وقتی..... اروما کا فیصلہ ہی ہمیں کسی نتیجے پہ پہنچا سکتا ہے، وہ ماشاء اللہ جھگڑا ہے۔ اپنا برا بھلا جانتی ہے، پھر کیا خیال ہے، آج ہی اس سے بات کرلوں۔“ وہ ٹھٹھے پہ آمادہ تھی مگر فیصل نے روک دیا۔

”یہ کون سا وقت ہے ایسی باتیں کرنے کا کل پرسوں کسی روز آرام سے بیٹھ کے یہ

دونوں پروڈیوزر اس کے سامنے رکھ دیتا۔ اسے ہر پہلو سے سوچتے سمجھتے کے لیے پورا وقت دینا اور ہاں، کسی قسم کا باؤ دست ڈالنا اس پر۔

”آپ کو میری ہر حرکت پر شک کرنے کی عادت ہے۔ جائیں۔ میں نہیں کرتی بات، آپ خود ہی کر لیں۔“

اس نے جگڑے تپووں کے ساتھ رخ پھیر لیا تو فیصل کے ہاتھ چر پھول گئے۔ یہ اس کی ناراضی کا آغاز تھا اور اگر ابتدائی طور پر وہ کوئی سدا ب نہ کرتا تو یہ ناراضی شدت اختیار کرنے والی تھی۔ اور یہ تو صرف وہی جانتا تھا کہ اسے منانے کے لیے کتنے پاپڑ پٹینے پڑتے ہیں اور یہاں..... اس گھر میں اتنے سب لوگوں کے سامنے وہ کوئی تماشا نہیں بنانا چاہتا تھا۔

”مار یہ! شک میں نہیں کرتا بلکہ تمہیں میری ہر بات کا غلط مطلب نکالنے کی عادت ہے، خدا کی قسم میرا وہ مطلب نہیں تھا جو تم سمجھی ہو پھر بھی اگر تمہیں برا لگے تو یہ دیکھو۔ میں معافی مانگ رہا ہوں۔ دیکھو پلیر غصہ مت کرنا، تمہارے لیے یہ بالکل اچھا نہیں، بی بی بائی ہو گیا تو طبیعت جگڑ جائے گی۔ اردو تمہاری ہندی نہیں، بہن بھی ہے۔ اس سے تم بات نہیں کرو گی تو اور کون کرے گا۔ مجھ سے تو مکمل کے بات کرتے ہوئے وہ بھیجے گی۔“

فیصل اسے مناتا رہا اور وہ خاموش بیٹھی دل ہی دل میں مختلف پلان بناتی رہی۔

☆=====☆

”ریان“

وہ تائب بلب کی روشنی میں بیڈ پر آڈاڑ چھا پڑا تھا۔ جب کمرے کے دروازے کے اس پار سے ہلکی سی دنگ کے ساتھ امی جان کی آواز سنائی دی۔ وہ کسمندی سے اٹھا۔ دروازے کا پینڈل کھمکتا ہوئے وال کاکاپ نظر ڈالی۔ رات کے پونے تین ہو رہے تھے اس نے اس وقت ان کے آنے پر حیران ہوتے ہوئے دروازہ کھولا۔ وہ جاہ نماز لپٹے ہاتھ میں دودھ کا گلاس لیے کھڑی تھیں۔

”تم نے رات کو کھانا ٹھیک سے نہیں کھایا تھا، میں تمہارے لیے اچھی تو سوچا پہلے تمہیں گرم دودھ دے ڈوں۔ لو پی لو اور اب سوئے کی کوشش کرو۔“ وہ اداں پلٹ گئیں اور وہ سوچنا رہ گیا۔

”امی آپ کو کیسے پتا کہ میں اب تک جاگ رہا ہوں اور اگر جانتی ہوں تو کیا آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ میں ”کیوں“ جاگ رہا ہوں۔ لیکن نہیں۔ آپ کو کیسے پتا چلے گا۔ میں نے تو سچی آپ کو بتایا بھی نہیں۔ نہ آپ کو۔ نہ اس کو۔ مگر کسی نے بھی پوچھا بھی تو

نہیں۔ نہ آپ نے۔ نہ اس نے۔ کوئی تو پوچھے۔ کوئی تو مجھ سے پوچھے کہ ریان! تم کیوں جاگتے ہو۔ تم نے کس کے پاس اپنی نیندیں گروی رکھ دی ہیں۔ تم کس سے رت چلے سو رہے مانگ لائے ہو۔ کوئی تو پوچھے۔ یہ خسارے بھرالین دین میں نے کس آس پر کیا تھا۔ یہ گھاسے کا سودا میں نے کس وجہ سے قبول کیا۔ کوئی تو پوچھے۔ کوئی تو جانے۔“

☆=====☆

جب ناہید نے ریان کو اس بات سے آگاہ کیا کہ وہ اروما کے لیے فیصل سے بات کر چکی ہیں تو کتنی ہی دیر مارے حیرت اور خوشی کے وہ کچھ بول ہی نہ سکا اور جب بولا تو صرف

”اووہ امی! اتنی جلدی..... ابھی تو میں نے.....“

”کیا ابھی میں نے“ تیس سال کے ہو رہے ہو۔ میرے اکلوتے سپوت ہو۔ کب سے تمہیں دوہلا بنانے کے خواب دیکھ رہی ہوں۔ شکر کرو کہ میں نے تمہیں تیس سال کا تو ہونے دیا ورنہ تمہارے سر پہ ساجا نہاں کا ارمان تو میرے دل میں تمہارے ساتھ ہی پیدا ہو گیا تھا۔ بس اب مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ جلدی ہے۔“

”نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں، آپ شوق سے اپنے ارمان پورے کیجیے۔ بلکہ آپ ناحق اتنے سال دل مارتی رہیں۔ مجھے حکم کرتیں۔ میں گیارہ سال کی عمر میں بھی دوہلا بننے کو تیار تھا لیکن جلد بازی تو پھر بھی ہو گئی آپ سے۔“ خوشی کی زیادتی سے وہ ادھر ادھر کی باتیں کر رہا تھا۔

”کیسی جلد بازی۔“

”ابھی تو میں نے۔ اوہو۔ آپ سمجھتی کیوں نہیں..... اچھا چلیں۔ ایک بات تو میری مان لیں کہ ابھی اروما سے اس بات کا ذکر مت کریں ورنہ تو سارا کریڈٹ آپ لے جائیں گی۔“

”کیسا کریڈٹ؟ کسی عجیب باتیں کر رہے ہو؟“

”آپ نہیں سمجھیں گی۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا وہاں سے نکلا۔ ”میری اچھی بھلی چلتی خاموشی تو اسنوری کو آپ اپنی جلد بازی کے ہاتھوں سماجی و معاشرتی، اصلاحی تہذیبی ڈرامائی تشکیل دینے جاری ہیں۔ مسٹر ریان شفیق..... اب بھی وقت ہے، منہ سے کچھ بھوت لو ورنہ تو اسنوری تو میرے تک نہ پہنچے گی بلکہ ایک بے رونق سی اربن میراج میں بدل جائے گی۔ میں خواہ خواہ ہی اختراع صہ بات کو لٹکا تا رہا کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ ابھی وقت نہیں آیا۔ اور یہ دیکھو،

وقت سر پر کھڑا شہنائیاں بجا رہا ہے۔ میں نے زندگی بھر میں اکلوتی محبت کی ہے اور اکلوتی ہی اکلوتی شادی بھی کرتی ہے، پھر کبھی دل کی ساری باتیں دل میں رہنے دوں۔ اور وہ کتنی کھلی بلی ڈائریکٹ کزن سے واقف بن جائے۔ اور میں دل کی ساری حسرتیں دل میں ہی لیے اپنی زندگی کی اس پہلی انگ۔ یعنی پچھلے لائف کا خاتمہ کر لوں، نہیں یار..... کوئی رومانک سا چوکا چمکا لگاتا چاہیے۔ وہ، وہ سب کہنے کے ارادے سے اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ جو ہر بار اسے سامنے پا کر چاہنے کے باوجود کہہ نہیں پاتا تھا۔

”بھائی! آپ نے اروما کو نہیں دیکھا ہے؟“ جب اس کے کمرے کے علاوہ کچن، میسر اور لان میں بھی اسے ڈھونڈ آیا تو گیسٹ روم میں جھانک کے ماریہ سے پوچھنے لگا۔
 ”کیوں؟ تم نے بھی نہیں دیکھا؟“ اس نے بیٹھ کی طرح ٹیڑھی بات کی۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہ ہر سیدھے سادے جملے کا جواب بھی اس قدر تو زمر و کے دینی تھی کہ سامنے والے کو مضطرب کرنا مشکل ہو جاتا۔ وہ بھی لحاظ کے مارے چپ کر گیا۔ واپس پلٹنے کو تھا کہ پیچھے سے اس کی آواز آئی۔

”کیا بات ہے؟ ہر وقت اسی کے پیچھے پھرتے رہتے ہو؟“ اس نے اس قدر جیسے ہوئے انداز میں پوچھا کہ وہ سر سے پیر تک سلگ کے رہ گیا۔
 ”آپ نے مجھے کب کسی کے پیچھے پھرتے دیکھ لیا ہے؟“ اسی کو اس سے کام تھا اس لیے بلانے آیا تھا۔ اس نے بات بتائی جو بن نہ کی کیونکہ ماریہ نے مسکرا کے بتایا۔
 ”وہ تو فیصل اور بچوں کے ساتھ سند بادگئی ہے اور خالد کے سامنے ہی سب اب کچھ دیر پہلے نکلے ہیں۔ کمال ہے خالد اتنی جلدی بھول گئیں۔ یا پھر تمہیں ہی جلدی میں کچھ اور نہ سوچا۔“

ماریہ کی ریان سے دیے ہی خاص نہ تھی اور جب سے پتا چلا تھا کہ وہ اس کے بھائی کے مقابلے پر آ رہا ہے، اسے سخت تاؤ آ رہا تھا اور شوٹی قسمت کہ ریان اس وقت اس کے سامنے آ نکلا اور..... حساب اٹھا رکھتا تو ماریہ کی فطرت میں ہی نہ تھا، بظاہر ہنستے ہوئے اس نے کئی نوکیلے وار کر دیے۔ اندر ہی اندر الجھتا ریان گھر سے نکل گیا۔ دیر رات گئے واپس آیا تو لاؤنچ کی لائٹ آن تھی۔ وہ کچھ سوچ کے خوشگوار سے احساسات میں بھیگ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ جس رات اسے آنے میں دیر ہو جائے اروما اپنے کمرے میں جانے کے بجائے یہیں لاؤنچ میں بیٹھ کر اس کا انتظار کرتی ہے تاکہ اس کے خالو اور خالد کی نیند خراب نہ ہو۔ دونوں ہی تہجد کے لیے اٹھنے کے عادی تھے۔ اس لیے عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد جلدی سو جاتے،

وہ نیند سے بے حال بھی ہوتی تو اس کا انتظار کرتی رہتی اور پھر سو سواتیں سا کر اور لاکھوں احسان جناتے ہوئے اسے رات کا کھانا اور ایک کپ چائے عنایت کی جاتی۔ اس وقت بھی اس کی تمام تکرر و کیسی سننے کے لیے خود کو تیار کرتے ہوئے ریان آگے بڑھا، آج اس کے پاس اروما کی بولتی بند کرنے کے لیے ایک ہی ہتھیار کافی تھا اور وہ اس کی متوقع حالت کا تصور کرتے ہوئے مسکرانے لگا۔

ارو ماصوفی نے منتظر کی چٹنی ناخن دانٹوں سے کتر رہی تھی۔ یہ اس کی بچپن کی عادت تھی جسے ناہید نے بپار، نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کے مختلف حربوں کے ساتھ بالآخر چھڑا ہی دیا تھا لیکن اب بھی کبھی کبھار جب وہ کسی کشمکش میں ہوتی یا گھبراہٹ کا شکار ہوتی تو انگلیاں خود بخود ہی متنبہ چلی جاتیں۔

”کہیں امی نے اسے بتا تو نہیں دیا۔ شاید اسی لیے نروس ہو رہی ہے میرا سامنا کرنے سے.....“ وہ اندازہ لگاتے ہوئے اس کے پاس پہنچا۔

”آگے تم.....“ اسے سامنے پا کر وہ ایک دم بے تاب سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ حیران رہ گیا اس بے ساختہ پذیرائی پر۔

”کب سے انتظار کر رہی ہوں، بس تمہیں بھی ذرا خبر ہو جائے کہ کہیں تمہاری ضرورت ہے فوراً“ ”مہنگے“ اور نایاب ہو جاتے ہو۔ اگرچہ وہ پہلے کی طرح اس کے دیر سے آنے سے پر خالد کو شکایت لگاتے اور آئندہ کھانا نہ گرم کر کے دینے والی دھمکیاں نہیں دے رہی تھی۔ مگر اس کا انداز پھر بھی پہلے جیسا نارمل ہی تھا۔ ریان کو اس میں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہ ہوئی ماسوائے اس کے بے چینی اور اضطراب کے۔

”تمہیں بھی جب مجھ سے کوئی کام ہوتا ہے تب میرا انتظار کرتی ہو۔“

”ظاہر ہے اور کیا شوق انتظار فرمائی رہوں۔“

”کیا حرج ہے۔ آج سنا ہستا کیسی بے ضرری عادتیں ڈال لی تو تو بہتر ہے۔“ اس نے چیخا مگر اس کے چہرے کو کوئی رول نہ پا کر اسے اندازہ ہوا کہ وہ اب تک اپنے اور اس کے رشتے کی بات سے بے خبر ہے۔

”آپ کیکن میں تعریف لے کر جائیں گی یا مجھے بھی یہی ناخن کھانے کو ملیں گے۔“

”میں اس قدر پریشان ہوں اور تمہیں پیٹ کی سوجھ رہی ہے۔“ وہ تھا ہو گئی۔ ”میرا خیال تھا کہ تم لاکھ برس کی عمر مصیبت میں ضرور اچھے دوست ثابت ہو گے۔“

”کیا مصیبت آن پڑی..... ارے..... کہیں ہجر کے دوران بوٹی تو نہیں پکڑی گئی

”میں خود بری طرح پکڑی گئی ہوں بلکہ جکڑی گئی ہوں۔“ وہ رو دینے کے قریب تھی۔
ریان بنجیدہ ہو گیا۔

”پوری بات بتاؤ، مجھے کیا ہوا ہے؟ کہیں وہ تمہارے بھائی کی ”سرتاجی“ نہ کوئی زبانی میزائل تو نہیں دے مارا؟“ شام کو وہ ارے کے تیور دیکھ چکا تھا اسی لیے اندازہ لگایا کہ ضرور اسی نے کوئی کل کھلایا ہوگا۔ وہ اچھے بھلے ضبط کا مظاہرہ کرنے کے باوجود اسی باتوں سے ہونے والی کوفت بھلانے پارہا تھا تو اروما تو پھر بے حد حساس تھی۔ اس کا اندیشہ قریب قریب درست تھا۔ اروما نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”ضرور اس بات کی تکلیف ہو رہی ہوگی کہ فیصل بھائی اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ تمہیں کیوں گھمانے لے گئے۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا، یہ بات ہوگی۔ تمہارے جانے کے بعد مرہٹوں نے پھر یہی تمہیں محترمہ۔ تمہیں ڈر نے یا گھبرانے کی کیا ضرورت ہے، اگر جانا تھا کہ میرا بھائی ہے میں جہاں مرضی جاؤں اس کے ساتھ۔ آخر فیصل بھائی پر تمہارا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا ان کی سرتاجی کا۔“

”تمہیں یہ بات نہیں بلکہ بھیا کو تو خود انہوں نے کہا تھا کہ وہ مجھے آؤنگک پہ لے جائیں۔“

”ہیں.....؟ انقلاب! اساتی نے کچھ ملانے دیا ہو شراب میں۔“ وہ گنگنا یا تو وہ چونک کے دیکھنے لگی۔

”یہ شراب سچ میں کہاں سے ٹپک پڑی۔“

”بالکل وہاں سے..... جہاں سے تمہاری بھالی محترمہ میری زندگی کے اتنے اچھے اور یادگار دن کا بیڑہ غرق کرنے اپنی تمام تر بد مزگیوں کے ساتھ ٹپک پڑیں۔“ اس کی بات سن کر اردو ما کا چہرہ رنگ گیا، وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ٹھیک ہے، تم اس یادگار دن کے مزے لو، میرے مسکوں سے تمہارا کیا تعلق۔“

”الحق ہیں آپ۔“ ریان نے سمجھنے کے لیے صوفے پر گر لیا، اب وہ اسے کیا بتاتا کہ وہ بذات خود اس کے لیے ایک خوبصورت سلسلہ ہے جسے وہ تمام عمر فرصت سے حل کرنے کی خواہش رکھتا ہے اور یہ دن یادگار بھی ہی بنتا جب وہ اپنے اظہار کے بعد اس کے گلگوں چرے سے اتر کر اسے رنگ سیتا لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے اس مسئلے سے نمٹنا جائے جس نے اردو ما کا مود متشر کیا ہوا تھا۔ ”پلو اب ساری بات الف سے لے تک بتاؤ۔“

”پہلے میں تمہارے لیے کھانا لے آؤں۔ تمہیں بھوک لگی ہوگی۔“ وہ جو خود بری طرح بے چین تھی اس سے اپنی الجھن شیر کرنے کے لیے، اس کا خیال رکھنے سے خود کو روک نہیں پائی۔ وہ مسکراتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہی کچن تک چلا آیا۔

”روٹی پکڑاؤ؟“ اروما نے سبزی پلاؤ مانگرو دیو میں رکھتے ہوئے پوچھا۔
”نہیں.....“ وہ اسے اس کی اور کام میں دقت خالق کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے چہرے پہ تو بڑبڑ اور الجھاؤ کے تاثرات اتنے نمایاں تھے کہ اب وہ بھی اصل بات جاننے کو بے تاب ہو گیا تھا۔ وہ صبر سے اسے کچن میں ہی رکھی تھنری ٹیبل پر سلا دینا اور ٹھنڈے پانی کا جگ رکھتے ہوئے دیکھنے لگا۔ چادلوں کے بعد اس نے کونٹے کا ڈنگ بھی مانگرو دیو میں رکھا اور دونوں بعد دونوں چیزیں ٹیبل پر اس کے سامنے رکھ کے خود رخ موڑ کے اسنو پہ چائے کے لیے رکھے پانی پر نظریں جمائے کہنے لگی۔

”پتا ہے ریان! ابھی کچھ دیر قبل بھائی نے ایک بڑی عجیب سی بات کہی۔“
”وہ جتنی بھی عجیب بات کریں، کم ہے۔“

”تم پلیز چپ رہ کے میری بات سنو۔“ اس نے جھجھکا کر کہا تو وہ صابعداری سے سر ہلاتے ہوئے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”بھائی نے بتایا ہے کہ پھوپھی جی نے ”عظم کا رشتہ“ میرے لیے.....“ اس نے اٹک اٹک کر بتایا اور ریان کا چادلوں سے بھرا چھوندے اندر ہی دہار گیا۔ اس نے اروما کی پشت پر کھوہنے والی نظریں گاڑ دیں۔ آہستہ سے منہ سے چھو کال کر پلیٹ میں رکھتے ہوئے وہ اس کے اگلے کمرے کا خطرہ تھا۔

”اور یہ کہ بھیا تقریباً راضی ہیں۔ بھائی مجھے کونہیں کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ میں بھی..... پتا نہیں وہ ہمیں کسے پہ میری مرضی جاننے آئی تھیں یا زبردستی اپنی مرضی مجھ پہ تھوپنے، میں سمجھتی تھی نہیں پائی۔ تو طے ہے کہ بھیا میری رضامندی کے بغیر اتنا بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کل میں بھائی کو کیا جواب دوں۔ انہوں نے مجھے سوچنے کے لیے کل تک کا وقت دیا ہے۔“ وہ ابھی تک رخ موڑے کھڑی تھی، شاید بہت مشکل سے وہ خود کو ریان سے اس بارے میں بات کرنے پہ آمادہ کر پائی تھی۔ یہ اس کی جھجک سے ظاہر تھا۔

اس نے مشکل میں منہ پر رکھے لٹے کو ٹھٹکی کی کوشش کی۔ ٹھنڈے پانی کا گلاس خالی کر کے اس نے ٹیبل پر رکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”مصرفیت کسی بھالی! بس یہ کھانا ہی گرم کر تھا، کر لیا۔ لائیں میں گرم کر دیتی ہوں دودھ۔“ اس کے لیے ماریہ کا پھنکارنا مارتا بچہ اور نوہ لیتی لگا ہیں معمول کی بات تھی اور بے وہ نو کھیلے الفاظ تو اس نے ان کے معنی تلاشنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ ایسی باتیں اکثر اس کے سر سے گزر جاتیں۔

”ارو! تم جاؤ۔“ ریان نے اسے واپس بھیجنا چاہا کہ کہیں اس کی سادگی سے شہ پا کے ماریہ بھالی اور نہ کھل جائیں۔

”ہاں بھئی! ارو! اب تم جاؤ اب میں جو آگئی ہوں۔“ اس نے دل جلانے والی مسکراہٹ بھی ڈھٹائی ہے قائم رکھی اور بے رحم طنز بھی جاری رکھے۔

”بس میں یہ برتن سبک میں رکھ۔“

”تم نے سنا نہیں ارو! میں نے کیا کہا ہے۔ میں سنبھال لوں گا برتن، تم خدا کے لیے اپنے کمرے میں جاؤ۔“ وہ دھاڑا تو اردو ماجرت سے باری باری دونوں کو دھمکتی بچن سے نکل گئی۔ ایک کا چہرہ غصے اور ضبط سے سرخ ہو رہا تھا تو دوسرا چہرہ بغضت اور حسد کی تپش سے سیاہ پڑ رہا تھا۔

”تم نے فضول میں بے چاری کو ڈانٹ کے بھیج دیا۔ دومنت کا کام ہے میرا۔ میں تو جا ہی رہی تھی۔“ اس نے فیدر رکھنا گلتے ہوئے ہمدردی جتائی۔ ”تم لوگ سکون سے بیٹھے رہو ناں کچھ دیر اور۔۔۔۔۔“

”وہ میرے لیے کھانا گرم کرنے آئی تھی اور گرم کر کے جا ہی رہی تھی۔“ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی وضاحت پیش کی حالانکہ وہ اسے صفائیاں دینے کا پابند نہیں تھا مگر ڈر تھا کہ کہیں اس خاموشی کو وہ غلط معنی نہ پہنچا دے۔

”یہ بچوں والے بھلا دے کسی اور کو دیتا میاں! میں اتنی بات سمجھ بھی نہیں جو آدمی رات کو گھر کے اس دیران کو نے میں چھپ کر اکیلے لٹے والے جوان لڑکی اور لڑکے کی نیت بھی نہ سمجھ سکوں۔“

”بس کیجیے، سوچ کیجیے کہ الفاظ استعمال کیجیے۔“ وہ بچی آواز میں مگر سخت لہجے میں بولا۔ ”میں اس سے زیادہ ضبط کا مظاہرہ نہیں کروں گا، اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ اپنی اس دہیات سوچ کو لگام دیں۔“

”دہیات میری سوچ نہیں، بلکہ اس گھر کا ماحول ہے۔ تمہاری ماں کی تربیت ہے۔ غضب خدا کا۔۔۔۔۔ اس وقت تو فیصل گھر میں موجود ہے، ارو! بڑا بھائی، اس کے باوجود تم

لوگوں کی دیدہ دلیری کا یہ عالم ہے، عام دنوں میں تو خال یوں سرشام ہی کمرے میں بند ہو کے تم دونوں کو خوب کھل کھیلنے کا موقع دیتی ہوں گی۔ سب جانتی ہوں، ارو! تو بچی ہے۔ تا کچھ اور معصوم ہے۔ تم نے ہی چٹنی چٹری باتیں کر کے اپنے بس میں کر لیا ہوگا۔ خالہ کہاں چاہتی ہیں کہ ارو! کی جائیداد ان کے ہاتھ سے نکلے اور کچھ نہ سوچھا تو اپنے بیٹے کو پنی پڑھا کے پنی کے پیچھے لگا دیا۔“

”خدا کا واسطہ ہے بھالی! یہ بے بنیاد الزام تراشیاں بند کریں۔ یہ آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں کہ میرے اور ارو! کے درمیان ایسا کچھ نہیں اور نہ ہی اس گھر کے ماحول میں ہم لوگ کوئی نقص پھیلا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود صرف اپنے ذاتی مقاصد کے لیے آپ ایک بے قصور لڑکی کو داغدار کر رہی ہیں۔“

”اسے کہتے ہیں چوری اریسہ زوری، وہ میرے شوہر کی بہن ہے میرے گھر کی عزت اور میں اسے اپنے بھائی کے حوالے سے اور بھی اہمیت دیتا چاہتی ہوں۔ اپنے ذاتی مقاصد کے لیے تو تمہاری ماں اسے استعمال کر رہی ہے انہیں تو اتنا خوف خدا نہیں رہا کہ مرنے کے بعد اپنی بہن کو کیا منہ دکھائیں گی۔“

”شرم آتی چاہے آپ کو اس بہتان طرازی پہ۔ ارو! میرے لیے مقدس اور محترم ہے۔ میں اس کے بارے میں کوئی غلط سوچ دل میں لائھی نہیں سکاس کی جائیداد نہ دے مجھے دلچسپی ہے نہ میرے والدین کو کوئی واسطہ ہے خبردار جو آپ نے وہ بارہ ایسی بات کی۔“

”تو پھر کیوں اسے گھبرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، کوئی تو وجہ ہے جو ارہ ما معظم کے لیے انکار کر رہی ہے۔ تم نے کوئی امیدیں دلا رکھی ہوں گی جن کی اس میں وہ اتنا اچھا رشتہ ٹھہرا رہی ہے۔“

”غلط فہمی ہے آپ کی۔ مجھے ارو! سے کوئی دلچسپی نہیں، کم از کم اس قسم کی تو نہیں۔ جیسی آپ سوچ رہی ہیں۔“ وہ شدید اشتعال کے عالم میں اپنے ہی دل کی نفی کر گیا۔

”ادب! پاگل کر کے رکھا ہوا ہے معصوم بچی کو، کوشش تو یہی ہے کہ وہ ہاتھ سے نکلنے نہ پائے۔“

”آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرنا فضول ہے۔“ وہ بے لہجے ڈگ بھرتا کرے سے نکل گیا۔

”ارو!۔۔۔۔۔“ دوسرے ہی لمحہ وہ اس کے دروازے پہ دستک دے رہا تھا۔

”کیا ہوا؟“ وہ آنکھیں مسکرتی دروازے پہ آئی۔ اس کی لا پرواہ طبیعت کا یہ حال تھا کہ

جان کو کتنا ہی دکھ کیوں نہ پہنچے۔ چاہے..... اور اگر میرے انکار کے بعد بھی کسی نے مجھ پر دباؤ ڈالنا چاہا تو میں صرف اور صرف تمہیں خود سے محفوظ رکھنے کے لیے معظم کا سہارا لے لینا بھی گوارا کر لوں گی۔ بس یا کچھ اور؟“

”نہیں.....“ اس نے کچھ کہنے کے لیے سامنے دیکھا اور بت بن کے رہ گیا۔ وہ تو کسی سوال کا سامنا نہ کرنے کی غرض سے نظر ہی چرائے کھڑا تھا۔ جب کہ ان دو آنکھوں میں ایک پوری حکایت درج تھی۔ جگہ کرتی وہ دوسرے ڈوروں والی آنکھیں اردو کے دل کا سارا حال سنا رہی تھیں۔ وہ لا کھڑا کے رہ گیا۔

”تو کیا اردو ابھی مجھے.....“

☆=====☆=====☆

”آج آفس سے جلدی آ جانا۔ فیمل شام کو اردو کے ساتھ یہاں پہنچنے والا ہے۔“ ناہید نے ناشتا اس کے سامنے رکھتے ہوئے یاد دہانی کرائی۔

”جلدی آؤں یا دیر سے..... آتا تو گھر ہی ہے۔“ وہ بارے ہوئے انداز میں کہنے لگا۔ جتنا اس نے اردو کا سامنا کرنے سے بچنے کی کوشش کی تھی، اتنا ہی خود کو بے بس پایا تھا اور اب تو وہ یہاں آ رہی تھی۔ پھر سے..... ایک نامعلوم مدت کے لیے، وہ کب تک اس سے کترا پائے گا۔

”میں سوچ رہی ہوں، تمہاری چچی کو بھی منع کر دوں کہ کل کا پروگرام فی الحال رہنے دیتے ہیں۔“

”کل کا کیا پروگرام؟“ وہ تیسرہ بھلا چکا تھا۔

”وہ تمہارے لیے کوئی لڑکی دکھانا چاہتیچی مجھے، میں نے تم سے ذکر تو کیا تھا، سوچ رہی ہوں اب جب کہ اردو آ رہی ہے، ایسے حالات میں یہ سلسلہ شروع کرنا عجیب سا لگتا ہے، کچھ روز کے لیے ملتوی کر دیتی ہوں۔“ انہوں نے اس کی رائے جاننے کے لیے اسے دیکھنا چاہا مگر وہ کسی اور ہی عالم میں تھا۔

”خدا کا واسطہ ہے اردو! اپنی نیڑی بیڑی سہیلیاں مت جوڑ کر تا میرے لیے۔“ بہت پہلے جب ایک بار ناہید نے ریان کی شادی کی اپنی دیرینہ خواہش کا اظہار کیا تھا تو وہ دہ جوش ہو کے اپنی کلاس فیوز کے نام گنوانے لگی تھی اور وہ باقاعدہ بللا اٹھا تھا۔

”مجھے ایسی فلاں آئےم نہیں بلکہ ایک پیر بہت بیوی چاہیے، پیر بہت۔“

”یہ پیر بہت بیوی کیسی ہوتی ہے؟“

کچن سے آتے ہی وہ سو بھی گئی تھی۔ اپنی بھائی کی کسی بات کا اثر لینا تو دور کی بات، وہ تو سرے سے ان کے ڈھکے چھپے طنز کو جان بھی نہ پاتی تھی۔ اس کی معصومیت سے ہی خائف ہو کے ریان نے مار یہ کھل کے سامنے آنے سے بیٹھرا سے منظر سے غائب کر دیا تھا۔ وہ شاید اسنے غصے اور جان لیوا اثرات سہار نہ پائی۔“ اور اگر میں نے ابھی اسی وقت یہ قدم نہ اٹھایا تو یہ شکر بڑے مسلسل برستے۔ بین گے اور میں کب تک اسے بچاتا رہوں گا۔“ اس نے گھڑی بھر میں فیصلہ کر لیا تھا۔

”وہ بات تو رہ گئی اردو! جو میں تم سے کرنا چاہتا تھا۔“ وہ ایک قدم آگے بڑھائے بغیر وہیں بٹھا رہا۔

”اردو! کیا تم مجھے دوست سمجھتی ہو؟ کیا تمہارے دل میں میرے لیے ذرا سی بھی مہربانی ہے؟“

”ریان.....!“ وہ اسے دیکھ کے رہ گئی۔

”اگر ہاں..... تو ایک احسان کرو مجھ سے..... تم کل اپنی بھائی کو“ ہاں“ کہہ دو۔“

”کیا؟“ اس کی آنکھیں ایک بار پوری کھلیں پھر جھک کے رہ گئیں، وہ بے چینی کے عالم میں اپنا جھکا ہوا سر نیلی میں لارہی تھی۔

”ہاں اردو! اگر تم میرے ساتھ، اپنی خالہ، اپنے خالو اور خود اپنے ساتھ کوئی بھلائی کرنا چاہتی ہو تو تمہیں معظم کے لیے ہاں کہنا ہوگی۔ یہ تمہارا بہت بڑا احسان ہوگا ہم سب پر اور اگر یہ کرنا تمہیں بہت مشکل لگے تب بھی اتنا تو تم کر سکتی ہو کہ مجھ سے شادی کرنے سے انکار کر دینا۔“

اردو کی جھکی پلکیں سختی سے ایک دوسرے میں پیوست ہو گئیں۔

”چاہے تم معظم کے لیے ہاں بھرو یا نہ بھرو، دینا کے کسی بھی شخص کے لیے رضامند ہو جانا مگر یاں شفیق کو بخش دو، وہ اتنا بار اٹھانے کا تحمل نہیں۔ بتاؤ اردو..... کیا تم یہ کر سکتی ہو؟“

اس نے منت کی..... اردو نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی پلکوں کے کنارے دھک رہے تھے۔ دھیرے دھیرے اس کے پونے حرکت میں آئے۔ ریان اس کی سوالیہ نظروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے اب کی بار وہ نظر ہی چرا گیا۔

”تمہیں یوں گردش کرانے کی ضرورت نہیں ریان! میں نہیں جانتی کہ میرا وجود کس طرح تمہارے لیے اتنا ناقابل برداشت ہو گیا ہے لیکن پھر بھی..... میں وجہ جانے بغیر تمہیں اس تکلیف دہ بوجھ سے آزاد کرتی ہوں۔ میں تمہارے لیے صاف انکار کر دوں گی چاہے خالہ

ریان پہ یہ مشکف ہوا کہ وہ کیوں مانی تھی تو..... تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ چپ رہی تھی مگر اس کی نگاہیں بتا رہی تھیں۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں ریان! تم جو مانگتے میں دے دیتی۔ تم جو کہتے میں کر جاتی کیونکہ..... میں تمہارا کہا نہیں ٹال سکتی۔ تمہارا سوال نہیں لوٹا سکتی۔ لیکن آخر کیوں؟ کیوں تم نے صرف جدائی مانگی.....“

اس کی نگاہیں پل بھر میں سارے راز کھول کر پھر سے جبک مٹی تھیں پھر کسی کوئی سوال نہ کرنے کے لیے..... لیکن اسے عمر بھر کے بچپتا سے میں جھٹکا کر گئیں۔ وہ پچھلے دو سالوں سے ان نگاہوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اسے اپنا فیصلہ سن کر آنے کے بعد وہ گھٹنوں کر سے میں مبتلا رہا تھا۔ بار بار دروازے تک جاتا..... پھر لوٹ آتا۔

”نہیں..... زندگی میں کچھ معاملات محبت سے بڑھ کے ہوتے ہیں۔ میں امی کو بھی سمجھاؤں گا کہیں وہ اروما کے انکار کے باوجود فیصل بھائی پہ زیادہ زور نہ ڈالنا شروع کر دیں۔ ساری عمر امی نے اروما کو کئی اولاد سے بڑھ کر جانا۔ اپنی بہن کی امانت جان کے پوری دیانت داری سے اس کی پرورش کی..... اور..... بدلے میں انہیں یہ سننے کو ملے کہ صرف ایک معمولی سی جائیداد کی خاطر انہوں نے بیٹے کے ذریعے مجھے بھی کوڑپ کر مرنے کی کوشش کی..... نہیں..... کبھی نہیں.....“ اس نے سختی سے دل کو سمجھایا جو اروما کے خاموش اقرار کے بعد چل چل چار ہوا تھا۔

اس نے تب بھی لب بپہ رکھے جب فیصل بھائی نے اروما کے فیصلے سے خالہ کو آگاہ کیا۔ وہ تب بھی کچھ نہ بولا جب امی جان ساری رات روتی رہیں۔ اس نے تو تب بھی خود کو سنبھالے رکھا جب ابوجی نے اروما کو اس گھر سے رخصت کرنے کا ارادہ کیا اور گھر میں صبح اس کی شادی کی تیاریوں میں اسے جھڑپا لیا۔ اس نے خود کو ملامت اس ذہنیت ہی نہ کی جب اروما اس کی نظروں کے سامنے کسی اور کی ہو کر کھست ہو گئی۔

ہاں مگر..... مگر..... تب..... تب ضرور پہلی بار اسے اپنے جذباتی فیصلے پہ انسو ہوا۔ جب اس کی شادی کے صرف چار ماہ بعد ہی چاک ابوجی گزر گئے اور سارا زمانہ آپا مگر ایک وہی نہ آئی۔ امی جان کو خربک حیات کی داغ بیل جلدی کا جتنا خدمت تھا، اس کی بے مروتی کا بھی اتنا ہی ملال ہوا۔ وہ بھی حیران ہو گیا کہ پل میں ساری تنگی اور ناراضی بھلا دینے والی، وہ آئینے سے دل و لاش کی اتنی پھر دل کیسے ہو گئی کہ باپ کی شفقت دینے والے خالو کے دکھ پہ بھی وہ ناراضی بھاری لگی اسے۔ تیسرے دن فیصل بھائی نے پُر ملال لہجے میں تسلیم کیا۔

”سپر ہسپتالی وہ ہوتی ہے جس کے ساتھ انسان کامیابی سے سلور جو ملی یا گولڈن جو ملی مٹا سکے۔ جس کے ساتھ ہر دن پہلے سے بڑھ کے دلکش اور سہانا لگے اور جس کے سبب وقت بتاتے ہوئے.....“ وہ کہتے کہتے رک کے اسے دکھینے لگا۔ جو بڑے اشتیاق سے اسے سن رہی تھی۔ خالہ کے سر میں تل کا مساج کرتے ہوئے ہاتھ ساکت ہو چکے تھے۔ تب اس نے پہلی بار اس کے بارے میں دوسری طرح سے سوچا اور یہ ان رہ گیا..... وہ تو بالکل ویسی ہی تھی، وہی تھی جس کی اس کے دل کو تنہا تھی۔

”کہاں کھو گئے؟“ اس روز بھی امی کی آواز پہ وہ ہز بڑا کے یونہی چونکا تھا جیسا اس وقت.....

”کچھ نہیں..... میں کوشش کروں گا جلد گھر لوٹنے کی۔“

☆=====☆

آفس ٹائم کب ختم ہو چکا تھا۔ وہ شگستہ سے انداز میں چیز کی ایک سے ٹیک لگائے کب سے چھت کو گھور رہا تھا، یہاں سے اٹھ کر گھر تک جانے کی اس کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ وہ کیسے اس کا سامنا کرے، جسے اس نے خود تار بکی کے حوالے کیا تھا۔ جس کو اس نے دوستی کے واسطے دے کر تباہی کی طرف دھکیلا تھا۔

اسے یہ فیصلہ کرنا تب وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا لگا تھا، اس کا خیال تھا کہ ماریہ بھالی بے گے بنیاد الزامات کا سبب باب کرنے کے لیے یہی ایک راستہ ہے کہ اردو ماہی رضا مندی سے معظّم کے حق میں رائے دے دے، اس نے سوچا تھا اگر اردو ماہی کے لیے ہائی بھر لے گی تو اس کے شک کو یقین میں بدلے میں دیر نہ لگے گی اور وہ احساس شکست سے مغلوب ہو کر چیخ چیخ کر سارے جہاں میں ان کے مقدس اور صاف رشتے کو داغ دار ٹھہرا دیں گی۔ اسے اپنے نیکو جذبوں کی رسوائی منظور تھی اور نہ ہی وہ اپنے ماں باپ کے عمر بھر کے بے لوث خلوص کو شرمی میں ملانا چاہتا تھا۔ ماریہ بھالی کو مطمئن کرنے کے لیے ایک ہی حربہ کافی تھا کہ اردو ماہی کی حسبِ منشاء ان کے بھائی کا رشتہ قبول کر لے اور اس نے اس سے بس اتنا ہی تو مانگا تھا۔

”مجھ پہ احسان کرو! اگر تم میرے ساتھ، اپنی خالہ، اپنے خالو اور خود اپنے ساتھ کوئی بھلائی کرنا چاہتی ہو تو مجھیں معظّم کے لیے کہاں ہوگی۔“

اور وہ مان گئی۔ حالانکہ اگر وہ انکار کر دیتی اس کی بات ماننے سے تو وہ بھلا کیا بگاڑ لیتا..... لیکن وہ مان گئی، ایک سوال بھی کیسے بغیر، ایک غلط فہمے کا ادا کیے بغیر..... اور جب

”میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ وہ خاصا بے حس اور بے مروت ہے، کسی کے کہنے میں نہیں۔“

”تو پہلے اس کی یہ خصوصیات تمہارے علم میں نہ تھیں۔“
 ”پہلے وہ صرف میرا مسالا تھا، میرا رشتہ بڑا تھا۔ اس لیے وہ لحاظ کرنے پہ مجبور تھا یا پھر لحاظ کرنے کا ذرا دم کر رہا تھا۔ اب اس کا میرا رشتہ برابر ہے۔ اس لیے اس نے اپنی اصلیت ظاہر کر دی ہے۔“

”لیکن ماریہ تو جانتی ہوگی اپنے بھائی کے کرتوت۔ اس کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ جہیں آگاہ کرتی۔“ تاہم یہ کہنے سے بڑا ہی غصہ ہو گیا۔

”جب اخلاق کا ہی جنازہ نکل چکا ہو تو اخلاقی فرض نبھانے کہاں یاد رہتے ہیں۔“
 اس کے بعد جتنی بات بھی اسے اروما سے متعلق کوئی خبر سننے کو ملی، وہ بچھتاوے کی دلدادہ میں اور اندر تک دھنستا چلا گیا۔ وہ اس کی اس حالت کا ذمہ دار خود کو سمجھتا تھا۔

☆ ===== ☆

پچھلے دو سالوں سے اس نے اروما کی ایک جھلک بھی نہ دیکھی تھی لیکن پچھلے دو سالوں میں اس نے اس کا ایک ایک درد ضرور محسوس کیا۔ اس پہ ہونے والا ہر شے اسے خرابا جاتا۔ وہ سوچتا رہتا تھا، کہ ذرا دیر کی بات یہ گھبراہٹ والی وہ کامیابی کی لڑکی ایسے درد مند صفت انسان کی ہر اسی میں کیسے زندہ ہے۔ اور وہ کیسے زندہ رہی..... اور کس حد تک زندہ رہی..... یہ تو اس پہ ایک نظر ڈالنے ہی محسوس ہو گیا۔

☆ ===== ☆

اس کے سامنے جانے کی سکت تو نہیں تھی اس میں لیکن جب تیسری بار می کا فون آیا تو اسے اٹھنا ہی پڑا مگر میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس کی نگاہ می کے کانڈھے پہ سر رکھے چھٹی اروما پہ پڑی۔ چھٹی کوئی سی تو وہ پہلے ہی تھی لیکن اب تو بڑیوں کا ڈھانچہ ہو رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کبھی بھر بڑیوں پہ کسی نے زور رنگ کی خشک کھال منڈھ دی ہو۔ اس کی بے رونق، وحشت زدہ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے تھے اور چڑیاں جسے لگ جاتے کب سے نہیں مسکراتے تھے۔ وہ اس کی حالت دیکھ کر لرز گیا۔

”اروما! یہ تم ہو..... کیا حال بنا رکھا ہے اپنا؟“ وہ بے ساختہ کہہ اٹھا اور کہتے ہی شرما سا ہو گیا۔ اگرچہ وہ کچھ نہیں بولی تھی صرف اپنی خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی لیکن ریان کو اپنے چاروں جانب ایک بازگشت کوئی سنائی دی۔

”خالہ جان! اروما کے معاملے میں مجھ سے بڑی کوتاہی ہوئی۔ معظم کسی طرح اس کے لائق نہیں۔ وہ اس پہ شک کرتا ہے بلکہ مجھے خبریٰ ہے کہ وہ اس پہ اتھک اٹھتا ہے۔“
 ”کیا ابھی اس کی شاد کو دن ہی کہتے ہوئے ہیں اور تم مجھے یہ خبر سنا رہے ہو۔“

”یہ سچ ہے خالہ جان! اس کا رویہ شروع دن سے ہی اروما کے ساتھ مناسب نہیں، میں آپ کو پریشان نہیں کرتا چاہتا تھا، صرف اس لیے بنا رہا ہوں کہ آپ اس کے نہ آنے کا کچھ اور مطلب نہ لیں۔ معظم کو اس کے یہاں آنے پہ اعتراض ہے۔ میں نے سوچا، کہیں بعد میں کوئی بڑا فسانہ بن جائے اس لیے اسے نہیں لایا ورنہ خالو کا سن کر وہ تو صدمے سے بے حال ہے۔“

”فیصل! تم نے تو میرے دل کو بے کل کر دیا ہے، وہ نامراد میری پھول سی بچی پہ ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اس کے فرشتہ سیرت ہونے پہ شک کرتا ہے، مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔ کتنی خواہش تھی میری کہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لوں لیکن جب اس نے ہی اپنا فیصلہ سنا دیا تو میں قائم کیا کر سکتے تھے لیکن مجھے کیا پتا تھا کہ.....“ وہ آنسو بہانے لگیں۔

”میں تو خود حیران رہ گیا خالہ جان جب اروما نے ریان کے بجائے معظم کے لیے ہاں کہی۔ میرا خیال تھا کہ آپ سے دور جانا پسند نہ کرے گی۔ میں نے علیحدگی میں اسے اعتماد میں لے کر گر پوچھا بھی تھا کہ کہیں وہ ماریہ کی کسی دھمکی یاد پاؤں میں آکر تو فیصلہ نہیں کر رہی لیکن اس نے قسم کھا کے کہا کہ اس میں ماریہ کا کوئی ہاتھ نہیں۔“

”ہاں..... وہ قسم کھا سکتی تھی۔ اس نے ماریہ کا ہاتھ دیکھا ہی کب تھا، وہ ہاتھ جس نے اس ڈور کا سرا اٹھا رکھا تھا۔“ ریان نے ہتھیلیاں پھینچتے ہوئے سوچا، فیصل کی زبانی اروما کے حالات جان کے وہ سلگ اٹھا تھا۔

”کیا اس بد بخت معظم کو اب بھی لحاظ نہیں کہ خود اس کی اپنی بہن تمہارے گھر ہے، اس کا حوصلہ کیسے پڑتا ہے تمہاری بہن کو مارنے کا۔“ انہوں نے غصے سے پوچھا تو وہ سر جھکا کر رہ گیا۔

”وہ عجیب بے حس انسان ہے۔ اگر میں انسانیت کے درجے سے نیچے اتر کے اس کی بہن کے ساتھ جوابی بدسلوکی کروں تب بھی اس پہ کوئی اثر نہیں ہونے والا۔ اسے کسی کا رشتہ کا لحاظ نہیں۔“

”لیکن ماریہ کو بھی تو چاہیے کہ وہ چھوٹے بھائی کو قتل دے اور تمہاری پھوپھی بھی کیا وہ بھی اروما کے ساتھ ہونے والی زیادتی خاموشی سے دیکھتی رہتی ہیں۔“

”یہ حال تمہارا ہی دیا ہوا ہے، انہم نے عمر بھر کی دوستی کے بدلے یہی تو مانگا تھا۔“
 ”برباد کر کے رکھ دیا میری بیٹی کو۔“ ناہید سسک اٹھیں، ان کی آنکھیں سترم تھیں جس سے اسے اندازہ ہوا کہ اس کے آنے سے پہلے بھی وہ دیر تک روتی رہی تھیں۔ واقعی ارہ ما کا یہ روپ تو خود اس کا دل چیرے دے رہا تھا۔

”اللہ بد دیکھ رہا ہے۔ وہ سب سے بڑا مصلف ہے، ماریہ نے جانتے بوجھتے اپنے نشئی بھائی کے بدلے اس شہر پہنچی کچا ہاتھ صاف اور صرف اس کا ترکہ ہڑپ کرنے کے لیے۔ عظیم کے مال پہ قبضہ کرنے والا تو وہی ہے بھی نہیں بخشا جاتا اور اس بد نصیب نے تو دو ہرے عذاب مول لیے ہیں اس بے زبان لڑکی کی زندگی بھی خراب کی۔ میں تو اسے بدعا بھی نہیں دے سکتی کہ بہر حال وہ بھی اپنے ہی بیٹے کی گھر بستی ہے۔“

”میں بھی بچوں کا سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں خالد جان! ورنہ ماریہ کی یہ غلطی، بلکہ مہنا کسی طور بخشنے کے لائق نہیں، جب مجھے یہ چلا کہ معظم فتنہ کرتا ہے تو میں تو سب ہی ماریہ کو اس کے گھر چھوڑ آیا تھا لیکن خالد جان وہ بے غیرت لوگ ہیں۔ پیسے کے آگے انہیں کچھ نہیں سوچتا۔ حق ہر کے نام پر وہ مجھ سے اتنا کچھ کھوا سکتے ہیں کہ میں اس عذاب سے بچھڑا کر پانے کا سوچ بھی نہیں سکتا میرے پاس اب رہائی کیا ہے۔ مکان پہلے ہی ماریہ کے نام ہے۔ مل مقروض ہو چکی ہے۔ سب مل کردہ نوں ہاتھوں سے مجھے لوٹتے رہے۔ اب مجھے پتا چلا ہے کہ فیڈی نے ان سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا سوچ کر کیا تھا۔ سب کے سب لبرے ہیں۔ جو حال میرا کیا وہی چالیس اس کے ساتھ چلتے رہے۔ ایک سال کے اندر ہی اندر معظم نے اس سے سب کچھ اپنے نام کر دیا اور یہ بے وقف..... اس نے مجھے بتایا تک نہیں۔“

”ارے سب کچھ لے لیتے مگر..... اتنا ظلم تو نہ کرتے چنے کے لیے کوئی اتنا غماک اور شقی القلب بھی ہو سکتا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ خون کے رشتوں کا حال ہے۔ اگر اپنوں کا یہ عالم ہے تو کوئی کسی غیر پر کیا بھروسہ کرے۔ میری بیٹی کی تو زندگی برباد کر کے رکھ دی۔“

وہ پھرے رو پڑیں، آنسو تھے کہ تھمتے نہ تھے۔ ریان نے ہنگامی چپکس جھپک کے اس کے چہرے کو ٹھولا۔ وہاں ایک بے تاثر خسی خاموشی اب تک جامد و ساکت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی موجود نہیں یا پھر وہ لوگ اس کے متعلق نہیں کسی اور کے بارے میں بات کر رہے ہوں۔

”خالد جان! اب آپ ہی اسے سنبھال سکتی ہیں۔ میں تو اسے اس حال میں دیکھ کر نہ جیتا ہوں نہ مرنا ہوں، یہی جتنی دیر میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے، مجھے خود پہ کوڑے پڑتے

محسوس ہوتے ہیں۔“ فیصل نے ناہید کے ہیر تمام لیے۔ اس کی آواز کیکار سی تھی۔
 ”اور اب یہ جتنی دیر میرے سامنے رہے گی، یہ کوڑے میرے جسم پہ رستے رہیں گے۔“ وہ مضطرب سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔

”وہاں رہ کے یوں بھی اس کی حالت میں بہتری کا کوئی امکان نہیں تھا۔ سب لوگ وہی تو تھے۔ وہی ماریہ، پھوپھی جی اور وہی معظم..... میں اس کی عدت ختم ہونے کا انتظار تھا مجھے۔ ورنہ میں نے کب کا سوچ رکھا تھا کہ اب اسے ماریہ کے سامنے سے بھی محفوظ رکھنا ہے۔ خالد جان! مجھے معاف کریں۔“ وہ بدستوران کے ہیر تھامے گزر گزرتا رہا۔ ”میری بہن کو سنبھال لیں۔ اسے زندگی کی طرف دوبارہ لے آئیے۔ اسے پھرے زندہ کر دیں خالد جان۔“
 ”ارو ما! مجھے اپنی جان سے بھی پیاری ہے فیصل، وہ کبھی میری بیٹی تھی اور اب بھی میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ تم بے فکر ہو کے جاؤ۔ خدا کا شکر ادا کرو، اس عفریت سے جلدی چھڑکا کر مل گیا۔ طلاق کا داغ جا کر ہی اس مگر یہی اس عفریت خانے سے زندہ توجہ نکلی۔“

”وہ خبیثہ شیطانی دینے پر بھی تیار نہیں تھا۔ پہلے تو میں بھی انتہائی قدم کے بارے میں نہیں سوچتا چاہتا تھا لیکن اس روز جب میں اپنا کچا اس سے ملنے گیا اور معظم کو نشے کی حالت میں اس پر بری طرح تشدد کرتے دیکھا تو مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں اسے اودھ مری حالت میں وہاں سے اٹھا کے لایا تھا خالد جان! تاپا جان، چچا..... سب کو چچ چچ کر اکٹھا کیا میں نے اور اپنی بہن کے لیے انصاف مانگا۔ سب خاموش تھے..... حالانکہ یہ وہی لوگ تھے جو مجھے بہن کا رشتہ یہاں کرانے پر رضامند کرنے کے لیے بڑھ چڑھ کے بولتے تھے۔ معظم تو اس دن اس کے بعد روپوش ہو گیا۔ میں اس کا انتظار کر کے وقت نہیں گنوتا چاہتا تھا۔ اس لیے مجبوراً مجھے عدالت کا سہارا لینا پڑا۔“

”اُمی.....! اچانک ریان کی نگاہ اروما کے زرد پڑتے چہرے کی طرف گئی اور اس نے فوراً ناہید کو حجب کیا۔ ان کے ہاتھ ہیر پھول گئے۔

”ارو ما..... میری جان..... کیا ہوا؟“ وہ اس کے خندے سے برف گل چھیننے لگیں۔
 ”مجھے اس کے سامنے ان اذیت ناک لوگوں کو دہران نہیں چاہیے تھا۔“ فیصل بھی پریشان سا اس کے قریب آ بیٹھا۔ اروما کے ہاتھ ہیر سے جان سے ہو کر پھیلے ہوئے تھے، وہ بشکل آنکھیں کھولے رکھے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کی گردن بار بار ایک جانب ڈھلک جاتی تھی۔ ناہید نے اس کے سفید موٹے کپڑوں سے گھاس لگا رکھا تھا، مگر پانی اس کے اندر جانے کے بجائے ٹھوڑی اور گردن سے ہوتا ہو کر بیان تک بہہ رہا تھا۔ ریان نے دھشت

”یہ لو اور ما! تمہاری پسند کا جینی والا چوکور پراٹھا۔“ ناہید نے پراٹھا اور ملائی اس کے سامنے رکھی اور ریان نے پوچھا۔

”تمہارے لیے بھی پراٹھا ڈال دوں۔“

”نہیں..... کس چائے کے ساتھ چند بسکٹ اور ایک ہاف بوائل انڈا۔“ اس نے کبدر اخبار پھر سے چرے کے آگے تان لیا۔ اردو کا میکا کی انداز میں پراٹھے کے لئے توڑ کے منہ تک لے جاتے دیکھ کر اسے بے ساختہ وہ وقت یاد آ گیا تھا جب اسے بلا ناغہ پہلے سکول اور پھر کالج جانے سے پہلے یہ مخصوص ناشتہ ڈٹ کے کرتے دیکھ کے وہ چلا اٹھتا تھا۔

”ادمانی گاڈ! ایک تو پراٹھا، اوپر سے چینی سے بھرا اور سونے پہ ساہا گاملائی میں ڈبوڑو کے کھایا جا رہا ہے۔ دیکھ لیں گا! تم ایک دن بیٹھے کے قریب ہو جاؤ گی۔ ایک تو ہائیٹ گزارے لائن بھی نہیں اس پر سے چربی بھی چڑھ گئی تو بجائے دو فیزہ کے ”مکھیزہ“، ”کنکے لگو گی۔“ اور وہ لا پر واپسی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اپنا پسندیدہ ناشتہ کرنی رہتی۔

اس نے پھر کنکے لگو سے دیکھنا چاہا، وہ یوں پراٹھا کھا رہی تھی جیسے ناہید اسے سزا کے طور پر اسے ختم کرنے کا حکم مانگتی ہوں۔ کچھ منٹ بعد وہ چائے لے کر آئیں۔ اردو ناشتہ کر چکی تھی۔ اس نے چائے کی ٹرے اپنی جانب کھانکی اور پہلے ہی کی طرح چائے کپ میں ڈالنے لگی۔

ناہید نے استعجاب سے اسے دیکھا۔ آج کتنے دنوں کے بعد اس نے کوئی ایسی حرکت کی تھی جس سے اندازہ ہو کہ وہ بھی اپنے گرد و پیش سے باخبر ہے ورنہ تو اس کے ہر انداز میں ایک لاطینی نمایاں تھی۔ ناہید کو اس کا یہ عمل اپنی بڑی کامیابی محسوس ہوا۔ اس کے ہاتھ سے کپ لیتے ہوئے انہوں نے بے ساختہ اسے دعائیں دیں۔ ریان کے آگے اس نے چائے اور شوگر پاٹ دونوں سرکا دیئے۔ وہ ہمیشہ سے اپنے کپ میں خود چینی ڈالنے کا عادی تھا۔ ایک دانہ بھی کم یا زیادہ ہوتا تو وہ چائے چھوڑ دیتا۔ اپنے اور اس کے آگے رکھی خالی پلیٹیں اٹھا کے وہ کچن کی طرف چل پڑی تو ناہید اسے روکتے روکتے رہ گئیں۔

”ریان! میں دیکھ رہی ہوں کہ تم پہلے کی طرح اس سے بیٹے ہو لیتے نہیں ہو؟“ انہوں نے کپ سے الٹھا تا یہ سوال کر ہی دیا۔

”پہلے کی طرح۔“ وہ تلخ سا مسکرایا۔ ”اب پہلے جیسا ہے بھی کیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔“

”میں مانتی ہوں، اس کی حالت کا ذکر نہیں بھی ہے لیکن میں خود کو دکھ کے اس عالم سے باہر لانا ہے جب ہی ہم اسے بھی اس دلدل سے بھینچ پائیں گے۔ تم جانتے ہو، اس کی

زادہ ہو کے پیچھے کی طرف قدم بڑھانے اور اپنا کمرے کے اپنے کمرے کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ دروازہ اس نے ایک دھماکے سے بند کیا۔ لاک لگایا اور دیوار سے ٹک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگا کہ وہ رونا نہیں جانتا تھا مگر..... آنسو روک نہیں پارہا تھا۔ وہ سسکیاں دبانے کے لیے منہ زکھول کر لیے لیے سانس بھر رہا تھا مگر آجیں اور سسکیاں اس کے سینے کے اندر شور مچا رہی تھیں۔

☆=====☆=====☆

آج اردو ناشتے کی ٹیبل پر موجود تھی۔ وہ حیران ہوا مگر اظہار کیے بغیر چیز گھٹت کے بیٹھ گیا۔ اسے آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور اس نے شاید ہی اس کی آواز سنی ہو اتنے دنوں میں، پہلے دو تین روز تو کئی بار وہ اسی طرح ٹیبل کی حالت میں چلی جاتی تھی مگر ناہید نے آہستہ آہستہ اس کا دھیان دوسری باتوں میں لگا کر شروع کر دیا۔ اس کے بچپن کی شراپتیں، اس کی امی اور ڈیڈی کی باتیں، ادھر ادھر کے قصے۔ وہ دلچسپی سے سنتی رہتی، کبھی کبھی اس کے لبوں پہ ایک بھولی بھلی انجانی سی مسکراہٹ بھی آ جاتی۔

ریان نے اسے دن میں ایک بار حال پوچھنے کے علاوہ کبھی مخاطب نہ کیا تھا۔ اب بھی کچھ دیر لاطینی سے اخبار پڑھنے کے بعد اس نے پھر اسے دیکھا۔ وہ نظریں خالی گلاس پہ جمائے بے دھیانی میں ٹیبل کی سطح کو اپنے بڑے ڈھب بڑے ہاتھوں سے کرید رہی تھی۔

”آج بہت جلدی اٹھ گئیں تم۔“ یا آخرا اس نے اس تکلف وہ سکوت کو توڑنے میں پہل کی۔ روز جب وہ آفس جاتا تو اردو ما سوری ہوتی۔ اس کی ذہنی حالت کے پیش نظر ڈاکٹر ز نے اس کے لیے سکون اور ٹریپو لکس نوجور کیے تھے اس لیے دن کا بیشتر حصہ بھی وہ سو کر گزارا کرتی اور یہ ایک لحاظ سے اس کے لیے اچھا ہی تھا۔ کم از کم وہ جتنی دیر سوئی رہتی۔ ہوش و خرد سے بے گانہ تو رہتی تھی۔ ہوش میں آتے ہی وہ سب اذیت ناک یادیں اسے بری طرح جکڑ لیتی تھیں۔ اس وقت بھی وہ نہ جانے کس لمحے کی اذیت میں گرفتار تھی کہ اس کے ناخن بچکان زدہ ہو کر ٹیبل کو کھرچ رہے تھے، لب سختی سے پیچھے ہوتے تھے اور آنکھیں دھشت زدہ ہو کر کھینچی چلی جا رہی تھیں۔

ریان اس کی حالت سے ذکر اسے مخاطب کر بیٹھا۔ اس کے سنے ہوئے اعصاب میں ایسا ایک ارتعاش سا برپا ہوا۔ جیسے وہ خود کو اس کی نگاہ پر ہی دور سے گھٹت کے لائی ہو۔ بے تاثر آنکھوں سے وہ اسے دیکھنے لگی۔ ریان سمجھ گیا۔ اس کی آواز تو اس تک جا پہنچی تھی۔ مگر سوال شاید وہ سن نہیں پاتی۔

اس نے خاموشی سے سر ہلایا۔

”جھاؤ..... تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

”میں تیار ہوں خالد جان۔“ اس نے خود پہ نظر دوڑائی۔ ریان بھی بے ساختہ اس کا جائزہ لینے لگا۔ سفید چکن کی فیص کے ساتھ سفیدی کا کٹن کی شلوار اور بڑا سا دو پہنہ تھا۔ لباس صاف ستھرا مگر بدشگن تھا۔ اس کی ساڈی سفید لباس میں اور زیادہ نمایاں ہو رہی تھی۔ تاہید نے بھی تاپنہ دیکھ کر دیکھا۔

”نہیں۔ اس میں تو تم نے کلف نہیں لگوا یا، اس لیے پریس بھی کبھی طرح نہیں ہوا۔ وہ سوٹ پہن کر آؤ جو میں نے پرسوں تمہارے لیے سلوا یا ہے۔ اتنی اچھی کرناڑی ہوئی ہے اس پہ، آؤ میں خود تمہیں تیار کرتی ہوں۔“

ریان ٹھیل سے اپنا موبائل اور چابیاں اٹھا کے پورچ میں نکل گیا۔ اس نے گاڑی اشارت کی اور اگلدار دوڑا کھول کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی اردو ما کو دیکھا، وہ لان کے پنازی رنگ کے سوٹ میں پہلے سے کہیں زیادہ نکھر کر ہوئی لگ رہی تھی۔ فیص اور دو پہن پہ سفید اور گلابی چھوٹے چھوٹے پھول کڑے ہوئے تھے۔ کلپ لگا کر سینے ہوئے بال اب سلیٹے سے گندمی ڈھیلی ڈھالی چوٹی میں مقید تھے۔ کانوں میں وہی اس کی سالوں پرانی گول سونے کی بالیاں تھیں، جن کے ایک سرے پہ چھوٹے چھوٹے دل نما سفید کھینے لگے تھے، کبھی ریان کو ان بالیوں کا اس گالوں پہ ڈالنے دیکھنا بہت اچھا لگتا تھا اور آج کتنے عرصے بعد ان کا سنہرا عکس اس کے گالوں پہ بھللا رہا تھا۔

اوائل اپریل کا ایک سہانا دن تھا۔ نہر کے کنارے لگے آم کے درختوں پہ پورا تر آتا تھا اور سنبل کے سرخ پھول اردو ما کو بے حد پسند تھے۔ ان بہار کے ان آخری دنوں میں وہ صرف ان پھولوں کا فرش نہر پہ بچھا دیکھنے کے لیے پیس تک لاگ ڈرائیو کی ضد کیا کرتی تھی۔ اس نے غیر اردو اور طر پہ گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی۔ اردو ما اپنے ہاتھوں پہ نہ جانے کیا دھونڈ رہی تھی۔

”ارو! دیکھو۔ تمہارے پسندیدہ پھول.....“ اس کے متوجہ کرنے پہ وہ سر اٹھا کے دائیں طرف جھانکنے لگی۔ ایک تھقار سے لگے درخت سرخ پھولوں سے لدے ہوئے نظر آ رہا تھا۔ ریان لالیاں آتا رہے تھے۔ وہ دلچسپی سے دیکھنے لگی۔ ریان خود کو کہتے سے روک نہیں پایا۔ ”تم نظر اٹھا کے دیکھو تو سبھی، سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے۔“ اس کے یوں تک آتی مسکراہٹ نے اچانک رستہ بدل لیا۔ وہ پھر سے اپنے ہاتھوں کی کلیں کو کھینچنے لگی۔

چپ دیکھ کے میرا کلیجہ ہر بل جیسے کسی آری سے کٹتا جاتا ہے۔ میں نے اس سے گزرے، دنوں کی ایک بات تک نہیں پوچھی۔ میں اسے واپس زندگی تک لانا چاہتی ہوں اس لیے سارا دن کوشش کرتی رہتی ہوں کہ اس کے لیے پہلے جیسا ہی ماحول بنا رہے۔ وہی بے فکر سمجھتیوں پھر ماحول..... اگر آج شفیق ہوتے تو مجھے اتنا زیادہ وقت نہ لگتا اپنی اس کوشش کو کامیاب کرنے میں، دیکھو آج ایک ہی ہفتے میں اتنی تبدیلی تو آئی ہے اس کے رویے میں، رات کو میں نے اسے نیند کی گولیاں دینے کے بجائے ایسے ہی سلائے کی کوشش کی اور صبح..... پہلے کی طرح، باں پہلے کی طرح نماز کے لیے جگہ یا اور یقین کرو۔ میرا یہ حربہ بہت کامیاب رہا۔ پہلے والے معمول کا میں نے صرف آغاز کیا اس کے بعد سے لے کر اس کی ہر حرکت میں اپنے گزشتہ معمولات کا عکس ہے۔ آج اس سے جب میں نے ناشتے کا پوچھا تو صرف سر ہلانے کے بجائے اس نے پیٹھے پر اٹھے کی فرمائش کی۔ چائے بنائی اور بالکل پہلے کی طرح ناشتہ کرتے ہی برتن دھوئے چلی گئی۔ تمہیں پتا ہے نا وہ کالج جانے سے پہلے سارے برتن دھو کے جاتی تھی۔ ”انہوں نے ایک بار پھر کچن کی طرف مڑ کے دیکھا۔ وہ سب کے آگے کھڑی تھی۔“

”میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم بھی میرا ساتھ دو۔ تمہاری اور اس کی تو بہت دوستی تھی۔“

”لیکن یہ دوستی تو میں کب کی بچ چکا ہوں، کتنا عجیب سا سودا کیا میں نے۔ اس کے ہاتھ بھی خسارہ آیا اور میرے ہاتھ بھی۔“ وہ سوچ کے رہ گیا۔

☆=====☆

تاہید کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔ اردو ما رفتہ رفتہ غم کی اس دھند سے ابھرنے لگی۔ ”ریان! میں نے سوچا ہے کہ اردو ما اپنی پڑھائی پھر سے شروع کر دے۔ گھر پہ فارغ بیٹھے بیٹھے پور ہو جاتی ہوگی۔“ صبح ناشتے کی ٹھیل پہ تاہید نے تذکرہ کیا۔ تو وہ سوالیہ نظروں سے چائے کے چھوٹے چھوٹے کھونٹ بھرتی اردو ما کو دیکھنے لگا۔ وہ اس کی بات سمجھ کے بولیں۔

”اردو ما بھی سبکی جاتی ہے۔ لی اے میں اس کے پاس انگلش لٹریچر اور سوکس تھے۔ دونوں میں ہی اس کی دلچسپی تھی۔ تم اسے یونیورسٹی لے جاؤ، اس کی دوکان کالج کی دوسن عالیہ اور نفی وہیں تو ہوتی ہیں۔ ان سے مشورہ کر کے طے کر لے گی کہ کس سبجیکٹ میں مائز نہ کرنا ہے۔ رات فون پہ دونوں سے بات ہو گئی تھی۔ یہ تو تیرا نہیں تھی یونیورسٹی کے لیے۔ کہہ رہی تھی کہ گھر پہ ہی پڑھ کے امتحان دے لے گی مگر میں نے بھی سمجھا یا دوستوں نے بھی کہ اچھا ہے ذرا مصروفیت رہے گی اور دل بھی بہلا رہے گا۔“

”دل کے پیر پہ پھول ایک ہی بار آتے ہیں ریاں..... یہاں بہاریں بار بار نہیں لوٹا کرتیں۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”لیکن دوستی تو ہر موسم میں ہی رہتی ہے۔ بے نا؟“ وہ کچھ نہ بولی۔

”یا پھر تمہیں اب دوستی پر بھی اعتبار نہیں رہا۔“ وہ پھر بھی چپ رہی۔

”اروما! پلےز، کچھ تو کہو۔ برا بھلا کہہ لو چاہے الزام دے لو مگر کچھ تو کہو۔“ اس نے گاڑی ایک طرف روک دی۔ نہر کے اس طرف دور تک گھاس پہ کاسی کے پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ وہ چہرہ مڑ کے پھول گنتے لگی۔

”اروما! میں نہیں جانتا تھا کہ معظم.....“

”بس آگے کچھ مت کہنا۔“ ایک دم اس نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے باز رکھا۔

”مجھے اپنی صفائی دینے کا ایک موقع تو دو۔“ اس سے اب یہ اجنبیت برداشت نہ ہو رہی تھی۔ ”میں صرف تمہاری بدگمانی دور کرنا چاہتا ہوں۔“

”صرف؟.....؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں پوچھا پھر فوراً کہہ اٹھی۔

”اس کی ضرورت نہیں ریاں! مجھے تم سے یا کسی اور سے کوئی شکایت نہیں، مجھے بھائی تک سے گلہ نہیں جو معظم کے بارے میں سب کچھ جانتی تھیں کہ وہ نہ صرف نفسیاتی مریض ہے بلکہ نئے کا عادی اور پیسے کے لیے حد سے تجاہد کرنے والا گھنیا انسان ہے، تم تو پھر انجان تھے۔ میں نے بھی کبھی منع کر دیا تھا کہ وہ میرا بھلا نہ بھائی سے مت لیں۔ کسی کا کیا قصور، یہ فیصلہ تو میرا اپنا تھا۔“

”ایسا کہہ کہ تم کس دھوکا دے رہی ہو اروما۔ اور کوئی نہیں مگر میں تو جانتا ہوں کہ ایسا کرنے کے لیے میں نے تمہیں مجبور کیا تھا۔“

”نہیں! تم نے مجھے مجبور نہیں کیا تھا، صرف کہا تھا اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہارے کہنے سے پہلے ہی میں نے یہ ارادہ کر رکھا ہو۔ اسی لیے مجھے فیصلہ کرنے میں وقت نہیں لگا۔“

وہ اپنے گرو فیصلیں کھڑی کر رہی تھی۔ اور ریاں انہیں دھانے کے سب اختیار کھو چکا تھا۔ وہ چیخ کے جھلانا چاہتا تھا اس کے اس بودے دعوے کو، یاد دلانا چاہتا تھا اسے اس کی وہ

تکلف..... وہ زردگی، جو ریاں کی زبان سے یہ عجیب سا حکم سننے ہی چاروں طرف چھا گئی تھی لیکن وہ کچھ یاد نہ دلا سکا۔ ان کمزور لہجوں کا اعتراف کیا کرتا جب وہ ایک مکار عورت کے ہاتھوں شکست کھا کر اپنے بھرم اور انا کو قائم کر سکے کی خاطر محبت اور دوستی کو داؤ پر لگا بیٹھا۔

فیصل کے فون متواتر آتے رہتے۔ اسے بھی اروما کے دوبارہ تعلیمی سلسلہ شروع کرنے کے فیصلے پہ خوشی ہوئی تھی۔ اسے بہن کے بارے میں جان کر ہر بار اطمینان ہی ملتا تھا لیکن اب تقریباً تین ماہ بعد جب وہ اس سے ملنے آیا تو واضح طور پر بے اطمینانی اس کے ہر عمل سے ہو بدلتی تھی۔ ناہید کو لگا جیسے تنہی ہی بار وہ کہنے کہتے رک گیا ہو اور پھر رات کو بالآخر وہ کہنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

”خالد جان! میں اروما کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہوں۔“

ان کے ساتھ ساتھ ریاں بھی چونک گیا۔ اروما اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔ کچھ دیر بعد اپنی حیرت پہ قابو پاتے ہوئے ذرا سنبھل کے انہوں نے کہا۔

”اسنے جتنوں سے تو وہ سنبھلی ہے اور تم نے مل تو لیا ہے اس سے اتنا کافی ہے وہاں کیا کرے گی۔ اور اگر بچوں کی وجہ سے کہہ رہے ہو تو انہیں بھی لے آتے، آخر یہ ان کی داوی کا گھر ہے۔“

”وہ بھی تو اروما کا اپنا گھر ہے۔“

فیصل اس وقت دہی فیصل لگ رہا تھا جو مار یہ کے کہے کو حرف آخر جان کر بغیر سوچے فیصلے کیا کرتا تھا۔

”بہن کی زندگی خراب کر دینے کے چبھتاوے سے بڑی جلدی نجات حاصل کر لی آپ نے فیصل بھائی۔“ ریاں کے منظر پہ وہ ڈپ اٹھا۔

”یہ چبھتاوہ تو شاید عمر بھر میرا پیچھا نہ چھوڑے۔ میں جس عذاب سے گزر رہا ہوں اس کی اذیت تم نہیں محسوس کر سکتے، بہن کی خوشیاں اتنی قیمتی نہیں جتنی انمول اس کی عزت ہے اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کے کردار پر یہ حرف گیری کرے۔“

”کس نے ایسی جرات کی، کیا معظم نے؟ اس کا اب کیا واسطہ ہے اروما سے۔“ ناہید نے ڈپٹ کے کہا۔

”وہ واپس آ گیا ہے اور بڑی دھڑائی اور بے غیرتی سے اروما کے ضلع لینے کے فیصلے کو تحقید کا نشانہ بنا رہا ہے۔ اپنی کھیا بہت چھپانے کے لیے اس نے خاندان بھر میں الٹی سیدھی باتیں پھیلا نا شروع کر دی ہیں۔“

”کیسا ہے اس نے؟“ ریاں کے اندر بال اٹھ رہے تھے۔

”وہ جو بھی کہو اس کر رہا ہے، اس کا واحد صل یہ ہے کہ میں اروما کو یہاں سے لے جاؤں۔“ اس نے بتانے سے گریز کیا۔ ریاں کو کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا لیکن ناہید انجان نہیں

اس لیے جانے پہنچے نہیں۔

”ہاں تاکہ وہ بھی یہ ہرزہ سرائیاں اپنے کانوں سے سن لے اور اس کے مرنے میں جو رہی سہی کسر وہ گئی ہے، وہ پوری ہو جائے۔ تم کیوں یہ چاہتے ہو کہ وہ پھر سے اس تلخ ماحول میں چل جائے۔ تمہارا سارا دوصیال آپس کے رشتوں، تاؤں سے بندھا ہوا ہے۔ خود تمہارے گھر میں معظم کی اپنی بہن موجود ہے، تم اس کا رشتہ اس کے میکے والوں سے ختم کروا سکتے ہو نہ ان لوگوں کا آنا جانا اپنے ہاں بند کروانے کی تم میں ہمت ہے۔ اس طرح تو وہ دونوں رات کی ٹینشن میں مبتلا رہے گی۔ طرح طرح کی باتیں سن کر اس کی ذہنی حالت پھر سے خراب ہو جائے گی۔ اسے تم نہیں رہنے دو۔“

”آپ نہیں سمجھ رہیں خالد جان! صورت حال کتنی نازک ہے۔ اس کا یہاں رہنا اب مناسب نہیں۔ معظم نے کبہ دیا ہے کہ ارومانے ریان کی وجہ سے خلع لی ہے۔“ وہ کہتے کہتے ڈھسے گیا۔ ریان کا پورا بدن سنسناتا تھا۔

”یہ صرف معظم کا بیان ہے یا آپ کی زہرہ محترمہ نے بھی.....“ اس نے کاٹ دار لہجے میں پوچھا۔ جواباً وہ شرمندگی سے سر جھکا کے رہ گیا۔ تاہم بھی بے یقینی کے عالم میں بیٹھی تھیں۔

”اب آپ ہی بتائیے، میں کیسے اسے یہاں رہنے دوں۔ علیحدگی کے بعد بھائی کے گھر رہنے کے بجائے لاہور چلے آنا..... لوگوں کے ہم کو یقین کا درجہ دینے والی بات ہے۔“

”کاش..... کاش فیصل بھائی۔ آپ اپنے ساتھ ماہر بھابی کو بھی لائے ہوتے۔ میں ان سے پوچھتا کر کتنے کرے اور آزمائیں گی۔ وہ۔ پہلے ایک بار ان کے اسی بے ہودہ سے شک کو رفع کرنے کی خاطر میں نے اتنا بڑا اور جذباتی قدم اٹھا لیا تھا لیکن کیا فائدہ ہوا اس سب کا۔ میں بھی اروما کی نظروں سے گر گیا۔ ہماری بے لوث اور سچی دوستی بھی دم توڑ گئی اور خود وہ بے چاری..... کیا حاصل ہوا! اتنا سب کچھ کرنے کے بعد بھی..... یہی سب..... یہ..... یہ ذلت، یہ رسوائی، وہی الزام اور وہی کچھڑ۔“ وہ چھٹ پڑا۔ تاہم اور فیصل کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کے عالم میں اسے دیکھتے رہے۔

”آپ جانتے ہیں فیصل بھائی! ماہر بھابی اس سے پہلے بھی ان گندے خیالات کا اظہار کر چکی ہیں۔ یہ تب کی بات ہے جب آپ نے ان پر مکمل اعتماد کرتے ہوئے انہیں بہن کی رضامندی معلوم کرنے کا فریضہ سونپا تھا اور وہ شاید جانتی تھیں کہ اروما کی مرضی کیا ہوگی۔ اس لیے انہوں نے دوسرا حربہ آزمایا۔ انہوں نے اروما کے حوالے سے مجھ پہ کچھڑ اچھالا۔ اسی اور ابوجی کی نیت پہ شک کیا۔ انہیں آپ لوگوں کی جائیداد کا لالچی بتلایا۔

میں باہل ہو گیا تھا یہ سب سن کر..... مجھے اور کچھ نہ سمجھا سوائے اس کے کہ انہیں زبانی حقائق پیش کر کے بجائے عملی طور پر یہ باور کرا دوں کہ مجھے نہ تو اروما میں دلچسپی ہے نہ اس کے پیسے میں، اسی جذباتی کیفیت میں میں اروما سے کبھی کبھلا کچھ کہہ میرے بجائے معظم کے لیے ہائی بھر لے۔ مجھے کیا خبر تھی کہ میرے اتنا سب کرنے کے بعد بھی یہ بدگمانیاں اس کا پیچھا کرتی رہیں گی۔“

”اتنا کچھ ہو گیا ریان! اور تم نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔“ تاہم ذکھ بھرے انداز میں شکایت کرتے لگیں۔ فیصل بھی تھلا رہا تھا۔

”ریان! تم یہ سب پہلے مجھے بتا دیتے تو میں ماریہ کی فطرت اور ارادوں سے تب ہی آگاہ ہو جاتا، تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہاری بات کا یقین نہ کروں گا یا بیوی کے بہکاوے میں آکر اپنی بہن کے کردار پر یا خالد جان کی نیت پہ شک کرنے لگوں گا۔“

”اوہ نہ! دنیا والوں کے ڈر سے اب بھی تو آپ اروما کو لینے آگئے ہیں ورنہ کیا آپ نہیں جانتے، اس کا یہاں رہنا ہی اس کے لیے بہتر ہے۔ تب بھی آپ سے کیا توقع کی جاسکتی تھی۔“ فیصل کا سر جھک گیا۔

”عزت دینے والی خدا کی ذات ہے ریان! تم یہ حقیقت کیسے فراموش کر گئے۔ اتنے نازک معاملے کے بارے میں تم نے اپنے بزرگوں کو بھی خبر رکھا۔“ تاہم نے احساس دلایا۔

”آپ لوگ کیا کر لیتے۔ ابوجی کو چاہتا تو انہیں کتنا صدمہ ہوتا۔“

”صدمہ اپنوں سے پہنچا کرتا ہے ریان! غیروں کی لگائی چوٹ پہ صرف اشتعال آتا ہے جسے تھیں آیا تھا اور یہ اشتعال ہیتمہ جسم کر دینے والے فیصل کرتا ہے۔ شفیق ایک معاملہ فہم انسان تھے، میں حلفیہ کہتی ہوں کہ اگر ان کے علم میں یہ واقعہ آتا تو وہ اسی رات تمہارا نکاح اروما سے پڑھا دیتے۔“

”کیا.....؟ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ وہ چڑ بڑا اٹھا۔

”بالکل درست کہہ رہی ہوں۔ جوش میں بھی ہوش نہ کھو نا ہی اصل حکمت عملی ہے۔ ان کی جگہ میں ہوتی تو میں بھی یہی فیصلہ کرتی بلکہ میں تو اب بھی اسی بارے میں سوچ رہی ہوں کہ لوگوں کی زبانیں بند کروانے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم دونوں کو ایک کر دیا جائے۔ پھر کسی کو اروما کے یہاں رہنے پر اعتراض نہ ہوگا۔“

”لیکن خالد جان! اروما.....“ فیصل ہچکچایا۔

”کیوں، کیا تم نہیں چاہتے کہ وہ بھی اپنے بے حد خوشیاں کشید کر لے؟ کیا زندگی پہ اس

کا کوئی حق نہیں، ایک تلخ حادثے سے ڈر کر کیا ہم اسے دوبارہ بسانے کی آرزو کرنا چھوڑ دیں۔“
”میرا یہ مطلب نہیں خالہ جان! لیکن اس طرح تو لوگوں کا یہ شک یقین میں بدل جائے گا کہ واقعی اس خلع کے پیچھے.....“

”تم بھی وہی غلطی کر رہے ہو فیصل! جو دو سال پہلے ریان نے کی۔ کیا لوگوں کے خوف سے ہم اپنے حصے کی خوشیوں سے دستبردار ہو جائیں؟ اگر یہ کرنا فائدہ مند ہوتا تو پھر ریان کے اس قدم کے بعد سب ٹھیک ہو گیا ہوتا۔ فیصل، میری بات یہ تھی کہ تم بھولنا کہ عزت دینے والا خدا ہوتا ہے اور کسی انسان کی کیا مجال ہے جو کسی کی عزت چھین سکے۔ اگر اپنا ضمیر مطمئن نہ ہو تو کسی کے بھوکنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ مت ڈرو کہ اردو اور ریان کے بارے میں لوگ کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کہیں گے۔ جب یہ دونوں اس مضبوط اور جائز پاک بندھن میں بندھ جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کسی کی ہمت نہ ہوگی اپنی اٹھانے کی۔“

☆=====☆

وہ جھپٹے پندرہ منٹ سے کہیں نہر کے ایک طرف گاڑی پارک کرنے کے بعد، چھوٹے سے ٹکڑی کے پل پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ یہیں سے اپنے پوائنٹ پہ سوار ہوتی ہے لیکن کتنے بجے..... یہ اسے علم نہ تھا۔ اپنے اندازے کے مطابق وہ ساڑھے بارہ بجے سے یہاں آئے کیچھ گیا تھا۔ صبح ہی تو اس نے امی سے سنا تھا کہ اردو اس نے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا، ابھی، اسی وقت، اس سے شام تک کا انتظار نہ ہوا تو وہ یو نیوری چلا آیا۔

کل جب ناہید نے اسے بتایا کہ وہ آج رات اردو سے بات کرنے والی ہیں تو تب بھی اسے ہلکا سا اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں وہ کوئی مسئلہ کھڑا کر دے۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہو چکا تھا اور جو کچھ کیا چاہا تھا اس میں تو وہاں بہت حصہ تو ریان کا بھی تھا اور وہ خود کو ذہنی طور پر اس جھٹکے کے لیے تیار کر لینے کے باوجود ایک لمحے کے لیے ٹوٹ سا گیا تھا اس کا انکار نہ کر، لیکن پھر اس نے خود کو سمجھایا۔

”اس کا حق بنتا ہے اتنی تھوڑی بہت ناراضی جملانے کا، میں نے بھی تو جب خود مرضی کی اجازت کر دی تھی۔ صرف اپنے لیے سوچا، اپنی پرواہ کی، کیا تھا اگر میں تو وہاں سا حوصلہ کر لیتا چار کروڑ یا تیس ستنے کا۔ دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت کر لیتا، لیکن تب میرا ظرف جواب دے گیا۔ میں نے اس کی محبت پر اپنی عزت اور مجرم کو قوت دی۔“
اور وہ اسے منانے آیا تھا۔ یا شاید اپنی بگڑی بنانے آیا تھا۔

پورے ڈیڑھ بجے وہ اسے نفی کے ساتھ سامنے سے آتی دکھائی دی تھی۔ اس کی نظر اچانک ریان پہ پڑی تو اس کے قدموں میں ٹھکن آئی۔ شاید وہ گانے گئی، وہ کیا پوچھنے آیا ہے۔ وہ خاموشی سے اس کے قریب چلا آیا۔
”کیسی ہو نفی؟“

”بالکل ٹھیک ٹھاک..... ارے ریان! تم تو ذرا نہیں بدلے ہو۔ بالکل ویسے کے ویسے۔“ وہ اردو کی بچپن کی دوست تھی۔ مگر ایک عرصے بعد ریان کو کچھ بھی تھی۔ اس کے گھٹنوں پہ اس نے مسکرا کے، خود کو لاپرواہ ظاہر کرتی اردو کی طرف دیکھا۔

”اچھا..... لوگ تو سمجھتے ہیں میں بہت بدل گیا ہوں، وہ پہلے والا ریان رہا ہی نہیں۔“
”اردو! تم تو اب گاڑی میں جاؤ گی۔ میرا کیلے بس میں جانے کا بالکل موڈ نہیں ہو رہا اس قدر گرمی میں۔ میں رکشہ میں جا رہی ہوں۔“ اس نے قریب سے گزرتے خالی رکشہ کو ہاتھ دے کر روکا۔ اس کے کچھ کہنے سے قہقہے ہلاتی بیٹھی۔

”تم یوں منکھول کر کیا دیکھ رہی ہو۔ وہ جا چکی ہے۔ اب رکشے کے پیچھے سے نکلنے دھوئیں کے کالے بدبودار بادل کو لچائی نظروں سے دیکھنے کا کیا فائدہ، اگر تمہارا بھی اس شاہی سواری میں بیٹھنے کا اتنا دل کر رہا ہے تو وہ سامنے سے آئے ”چنگ چئی“ کو روکو؟“ وہ پہلی کی طرح اپنے مخصوص شوش اور چڑانے والے لہجے میں پوچھ رہا تھا اور وہ سچ بچ بچ بھی گئی۔ اسی لیے ”چنگ چئی“ کو ہاتھ دینے کے ارادے سے رک گئی۔ حالانکہ اس کی ایسی جتنی سواریوں کو دیکھ کے ہی جان نکلتی تھی۔ وہ بھی اس کے شانے سے شانہ ملا کھڑا ہو گیا۔

”لیکن شرط یہ ہے کہ میں بھی تمہارے ساتھ بیٹھوں گا۔“ وہ ہیر بختی ہوئی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ ”اگر اس کے ساتھ ہی جانا ہے تو گاڑی میں بیٹھنے میں کیا تکلف ہے۔“
اس کے بیٹھے ہی ریان نے گاڑی اسٹارٹ کی اور فل اسپید کے ساتھ بھاگنے لگا۔ ساتھ ہی ڈی ڈی پیسیر بھی آن ہو گیا۔ نصیبیوں کی آواز دھماکے ڈالنے لگی۔

”اساں دو نویں ڈس بیٹھتاں مناؤ کون وے۔“

”یہ کیا کر رہے ہو؟“ وہ جتنی خوفزدہ گاڑی کی اسپید سے تھی، اتنی ہی کوفت زدہ اس فضول سے گانے سے ہو رہی تھی۔

”میں نے سوچا، تمہیں نیوٹا کر دلائی میں ”چنگ چئی“ کے مزے دلانے جائیں۔ پہلے خیال نہیں آیا در نہ نہر پیلٹ کے ذرا اوپر ”دیکھو مگر جھارے“ اور ہینڈ لائنس کے ساتھ ”ریان“ طیارہ ”اور ”تھیری شہزادہ“ بھی نکھوا لیتا۔“

”تو اب لکھو! وہاں کی دعا، جا بیٹا رکشہ چلا۔“ یا پھر ”جس نے کسی کا دل دکھایا، اس نے چنگ پی ہی چلایا۔“

”ماٹی گاؤ! بیٹی اب تمہیں بھی چنگ پی چلانا پڑے گا۔“ جیو نیوز چینل پر تمہارا انٹیشل انٹرویو آنے لگا آخر تم پاکستان کی پہلی خاتون رکشڈرائیور ہو گی۔“

”میں کیوں چلانے لگی یہ فضول چیز۔“

”خود ہی تو کہہ رہی ہو کہ جس نے کسی کا دل دکھایا۔“ وہ لہر الہرا کے گلنگانے لگا۔ پھر ایک دم اس کے کان کے پاس ہو لے سے کہنے لگا۔

”تم نے بھی تو میرا دل دکھایا ہے۔“ لہجہ میں ہلکی سی شکایت تھی، اپنا آپ منوانے کا مان بھی اور۔۔۔۔۔

”میں نے کسی کا دل نہیں دکھایا۔“ اس کی ساری ٹھک مزاحیہ پل میں ہوا ہو گئی۔ بڑی بڑی بھوری آنکھیں چمکنے لگیں۔

”پلیز۔۔۔۔۔ رونا نامت۔۔۔۔۔ مجھے اب تمہیں چپ کرانے کی عادت نہیں رہی۔ آؤٹ آف پریکٹس ہو چکا ہوں۔“ اس نے اپنی بالکل آہستہ کر لی تھی۔ سی ڈی پلیز بھی خاموش ہو چکا تھا۔ اردو نامے تیزی سے جلیں جھپکنے ہوئے آنسو پی کی کوشش کی۔

”یہ کہاں جا رہے ہو؟“ اسے نہر کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔

”تمہیں فالے کھانے۔“

”اتنی گرمی میں۔“

”کیا کرو۔۔۔۔۔“ اس نے شانے اچکائے۔ ”سردیوں میں فالے ہوتے ہی نہیں۔“

”میرے کہنے کا مطلب ہے کہ اس قدر تیز دھوپ اور گرمی میں میرا سر کون پہنارے ہوئے گا کوئی موڈ نہیں۔“

”یاد کرو وہ وقت جب میرا موڈ نہیں ہوتا تھا، تب جھلی جھلی دوپہروں میں سر کیسے تاپے گا، مگر تمہیں اچانک فالے کھانے کی ہزک ابھی تھی اور وہ بھی بازار سے خرید کے نہیں بلکہ تازہ توڑے ہوئے۔ تب بھی تمہارے ساتھ جاتا تھا یا نہیں۔۔۔۔۔ بولو۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔ موڈ نہیں ہے۔“

اس نے چنچا کے نفل اتاری۔

”بس کرو اور۔۔۔۔۔ خدا کے لیے بس کرو۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ تم بھلے مجھے گالیاں دے لو۔۔۔۔۔ پیت لو۔۔۔۔۔ مگر تمہارے دل میں میرے خلاف جتنا بھی زہر ہے، اسے کسی طرح نکال باہر بھیگو۔ اس زہر کو پال پال کر خود کو زہراؤ دموت کرو۔ میں نے کب

اپنی غلطی تسلیم نہیں کی۔ کب کہا کہ مجھے سزا مت دو۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔۔ مجھے سزا دو۔۔۔۔۔ مگر ایسی سزا جس کو میں اکیلا جھگٹوں، اس میں تم میری حسد دار نہ بن سکو اور یہ جو سزا تم نے مجھے سنائی ہے، اس میں تم میرے برابر کی شریک بن رہی ہو۔ جانتی ہو تم اس بار خود پے ظلم کر رہی ہو، اس سے پہلے یہ کام دوسرے کرتے آئے ہیں مگر اب تم خود تم خود صرف میری ضد میں اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہی ہو۔ کیا میں نہیں جانتا اور ما، کہ دوسری بار اپنے آپ کو یہ سزا سنا تا تمہیں کتنا دشوار محسوس ہو رہا ہو گا۔“

”کیسی سزا۔۔۔۔۔ اور کون سی سزا۔۔۔۔۔؟“ وہ گھبرا گئی، یہ گھبراہٹ بھید کھلنے کی تھی۔ ”میں تو تمہیں سزا دینے سے بجا رہی تھی۔ تم کیوں محض ہمدردی اور خدا ترسی کے نام پر ایک ان چاہے بندھن میں بندھو۔“

”کیا۔۔۔۔۔ کیا کیا تم نے۔۔۔۔۔؟“ وہ اچھل پڑا۔ ”پھر سے کہنا؟“

”ہاں ریان! میں اتنی کم ظرف نہیں کہ محض اپنی زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کی غرض سے تمہارے لیے زندگی کو مشکل ترین بنادوں۔ میں جانتی ہوں۔ خالہ جان مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں، وہ میرا بھلا ہی سوچیں گی۔ مگر کب تک۔۔۔۔۔؟ کب تک ریان! وہ تمہارے حصے کی تکلیفیں بھی مجھ پہ لٹا رہی ہیں۔ میری خاطر وہ تمہاری خوشی کا گھاگھونٹنے پہ تیار ہیں۔ کیا سب جا۔۔۔۔۔ نیت ہو جھٹے میں، اتنی سے جس بن جاؤں؟ میں تو پہلے ہی خالہ جان اور خالو جان کی محبتوں کے لیے مجھ تلے دبی ہوئی ہوں، محبت جب حد سے بڑھ جائے تو احسان بن جاتی ہے اور انہوں نے اسے کیلئے احسان مجھ پر کیے ہیں اور میں نے اپنا حق سمجھ کر ان احسانوں کو ہی بان سے قبول بھی کیا ہے۔ مگر ریان! تمہارا احسان نہیں تمہارا کوئی احسان لینا مجھے گوارا نہیں۔“

”کیسا احسان اسٹوپڈ گرل، میں اپنی خوشی۔۔۔۔۔ بلکہ بے پناہ خوشی کے ساتھ تمہیں اپنا رہا ہوں۔“ وہ ان خود ساختہ واہموں پر ہنسنے لگا۔

”مجھے بے وقوف مت بناؤ۔“ اس نے تیز نظروں سے گھورا۔ ”جب آج سے دو سال پہلے میں تمہیں قبول نہیں تھی، جب اس وقت تم نے مجھے متیں واسطے دے کر خود اٹکا کر کے کا کہا تھا تو اب مجھ میں کون سے رخسار کے پر لگ گئے ہیں۔“

”اور۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“ اس نے ایک دم بریک لگا لی۔ ”تو امی نے تمہیں ساری بات نہیں بتائی۔“

”کیسی بات؟“

”ارے یار وہی۔۔۔۔۔“ اس نے مختصر آسان ساری بات اسے سمجھائی۔ ”اب تم بتاؤ ایسی حالت

میں، میں اور کیا فیصلہ کرتا۔“

وہ گم صم سی کیفیت میں بیٹھی رہی۔

”ساری غلطی میری نہیں..... بلکہ اس وقت تو میرا خیال تھا کہ میری ذرا برابر بھی غلطی نہیں۔ میں نے جو کیا وہ درست تھا لیکن بعد میں میرے دل نے جیسے سگل سے دینے شروع کر دیئے کہ کچھ ہے جو غلط ہو گیا ہے۔ جلد بازی میں مجھ سے کوئی زیادتی سرزد ہو گئی ہے۔ اس کے بعد تمہاری زندگی میں جو جو تکلیفیں اور مشکلیں آتی گئیں وہ مجھے اور بچھتاؤں میں جھلا کرتی گئیں اور پھر اس دن جب امی نے بتایا کہ دنیا کے ڈر سے دروازے پہ دستک دیجنی خوشیوں کو واپس لوٹا دینا نعمت خداوندی کو ٹھکرا دینے کے مترادف ہے تو مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ غلط ہو گیا ہے۔ میں اس غلطی کا مداوا کرنا چاہتا ہوں اروما..... اور اب تم اسی غلطی کا اعادہ کر رہی ہو۔ اس وقت مجھے صلاح دینے والا کوئی نہیں تھا لیکن تمہارے پاس میں ہوں، تمہارا سب سے بہترین دوست..... اور میں تمہیں ایک بچے کی بات بتا رہا ہوں، اسے گھر سے پانڈھ لو۔ اور وہ یہ کہ..... فیصلہ وہ کر، جس پہ تمہارا دل مطمئن ہو۔“

”میرا دل!“ اس نے ٹٹولا..... ”اس میں تو سالوں سے ایک ہی تصویر بچی تھی۔“ وہ جھینپ کر اسے کن اکھیوں سے دیکھنے لگی۔ وہ مسکرا رہا تھا جیسے اس کے دل کا ایک ایک منظر اس کی اپنی آنکھوں کے سامنے روشن ہو۔

”اور اگر اب بھی تمہارا دل اس بات کو فراموش کرنے میں ناکام ہے تو ایسا کرتے ہیں کم مکا کر لیتے ہیں، تم سزا صاف کر دو۔ میں تاوان ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یو، کیا قبول کرو گی تاوان میں۔“ اس نے فالے کے پودوں کے قریب گاڑی کھڑی کی۔

”ریان شفیق..... یا تازہ یہ تازہ کھٹ ٹھٹھے فالے.....“

”اوں..... وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”فالے.....“ اچانک وہ بوٹی تو ریان بدک اٹھا۔

”کیا؟ فالے.....؟“

”ہاں تازہ تازہ کھٹ ٹھٹھے فالے..... بھری تہی دو پہروں میں کھلانے والا۔“

وہ سر جھکا کے شرمیلیں مسکراہٹ کے ساتھ فیصلہ سنا گئی۔

”بولو بھر سکو گے یہ تاوان.....“ اور ریان کالوں لوں ”ہاں“ کا زور ہاتھ۔

☆=====☆

ایک جگنو ہے بند مٹھی میں

ایک سیدھے سادے نوجوان کا قصہ جو بھٹک کر بظاہر ایک ایسی روشن راہ پر چل پڑا تھا جس میں تاریکیاں اس کا مقدر تھیں..... وہ محبت اور کاروبار میں، قربانی اور خود غرضی میں تیز نہ کر سکا تھا..... ایسے میں ایک ننھے جگنو نے روشنی دکھا کر اسے بھٹکنے اور کھونے سے بچالیا۔

کے لیے غائب نہ ہو جائے کہیں اور ہاں..... سردی اور ہی ہے، بیلو، پپو، اور گزیا کا خاص خیال رکھنا۔“

ان کی بڑی صاحبزادی گود میں کسمپاتی گزیا کو بل بل کے تھپکتے حسب عادت سر ہلا کر ماں کو تسلی دینے لگیں اور ہمیشہ کی طرح ان کے مٹنی انداز میں سر ہلانے پر پھوپھی اماں غیر مطمئن ہی رہیں لیکن وقت کی کمی کے پیش نظر دوبارہ اپنا ہدایت نامہ نشر کرنے کے بجائے دوسری بیٹی کو پیش یاب کرنے لگیں۔

”صف! میری جان، بھائی کا دھیان رکھنا اور ابراہیم کی بڑی مہربانی کہ وہ اتنے دن تم لوگوں کی دیکھ بھال کے لیے ہمارے گھر رہے گا۔ اگر عاکف کسی کام کا ہوتا تو میں بے چارے ابراہیم کو تکلیف ہی کیوں دیتی، بس اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم اسے گھر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دینا، اس سے روز پوچھ لیا کرنا کہ کیا کھانے کو جی چاہ رہا ہے، یہ نہیں کہ بس اپنی پسند کی دالیں ہی چڑھاتی رہا کرو۔“

پھوپھی اماں کل سے کم دیش دس بار یہ ہدایت اسے دے چکی تھیں، اکیلے میں بھی اور سب کے سامنے بھی اور اس وقت انیر پورٹ کا ابراہیم کے بالکل سامنے کھڑی صف نے یہ آخری تاکید سن کر اچھی خاصی شرمندگی محسوس کی لیکن اسے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے میں کمال حاصل تھا۔ اس لیے تسلی بھری مسکراہٹ سے سر ہلایا۔

”اور ہاں، موتی کو زیادہ بھڑکانا نہیں۔ بچی ہے، پیار سے سمجھانا۔“

ابراہیم نے رست وادج پہ ٹائم ویکنے کے بعد ابراہیم کی بڑی ہمزہ ہی نظر اس ساڑھے پانچ فٹ کی ”بچی“ پہ ڈالی جس کی کس کے گئی وہ چوٹیوں میں سے کئی بال نکل کر چہرے اور گردن پہ لہرا رہے تھے، پھوپھی اماں سے لپٹ لپٹ کر رونے کی وجہ سے اس کی ہلکی شریقی آنکھیں اس وقت بالکل روح افزا کے رنگ کی ہو رہی تھیں اور عاکف کے ڈھیلے ڈھالے سونے میں ملیوں وہ اس کی لمبی لمبی آنکھوں میں اپنی مٹھیاں تک چھپانے کھڑی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسی سونے میں ملوث مٹھی سے موتی نکالی تاکہ رگڑ کے شوش شوش کرتی وہ ابراہیم کو زہر لگ رہی تھی بلکہ انگلی سے لمبے سے اسے بے فکر لے کر ادھر ادھر ”جھانٹاں“ (تاک جھانک) مارنا عاکف بھی برا لگنے لگا کیونکہ اب پھوپھی اماں نے اپنا ہدایت نامہ اس پر اٹھایا شروع کر دیا تھا۔

”اکو! میرے بیٹے، بہنوں کو زیادہ جگ نہ کرنا اور موتی سے تو بالکل لڑائی نہیں کرنی۔ سن لیا، مجھے واپسی پہ کوئی شکایت سننے کو نہ ملے۔ دن بھر بھلے خوار ہوتے رہنا مگر خدا کے واسطے

انیر پورٹ پہ پھوپھی اماں اور موتی کے درمیان ہونے والا جذباتی منظر اسے کوفت میں مبتلا کر رہا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پھپھلے چند روز سے وہ جس زبردست کوفت اور جھجھلاہٹ کے زیر اثر تھا موتی کے طویل دردناک المیہ سین نے اس میں خاطر خواہ اضافہ کیا تھا۔

”ہی! آپ کیا آنکھوں میں آنسو بھرے کھڑی ہیں، الگ کیجیے اس بے وقوف لڑکی کو پھوپھی اماں سے۔ فضول تناشائیاں رکھا ہے۔“

جھلایا ہوا تو پہلے ہی سے تھا، یہ دیکھ کر اور بھٹا گیا کہ بجائے ان دونوں کو خاموش کرانے کے سب ہی متاثر ہو جانے والی نظروں سے یہ منظر ملاحظہ فرما رہے تھے۔ امی نے تو کیا اس کی ہدایت پہ عمل کرنا تھا، صف صدمہ سے سرخ ہوتا چہرہ لیے آگے بڑھی اور تقریباً سمجھنے کے موتی کو اپنی امی سے الگ کرنے لگی، احتجاجاً موتی اور زور زور سے ہلکنے لگی۔

”چچی مجھے بھی ساتھ لے چلیے۔ میں آپ کے بغیر.....“

”فضول خدمت کرو موتی! کتنا سمجھا کے لائی تھی میں تمہیں۔“ صف زچ ہو گئی۔

”نہ بنی! اسے یوں تو مت ڈانٹو، پہلے ہی رو رو کے بلکان ہو رہی ہے۔ بس میری جان! میں کیا کروں، کیسے لے جاؤں تجھے۔ بس میری بچی، دعا کرتا تیری چچی اور ماموں، ممانی خیر خیریت سے یہ فیض ادا کر کے واپس لوٹیں۔“

پھوپھی اماں نے اسے چمکارا اور ساتھ ہی اپنی دونوں بیٹیوں اور اکلوتے فرزند کو ہدایات جاری کرنے لگیں۔

”نکرت! دوسرے تیرے دن چکر لگا لیا کرنا، یوں تو صف ماشاء اللہ بڑی سمجھ دار ہے مگر تم بڑی ہو، ان کا خیال ضرور رکھنا۔ عاکف کا بھی دھیان رکھنا، گیند بلا اٹھا کے دو دو دن

بارے میں سوچنے تک کی زحمت نہیں کی۔“

وہ سرگوشی میں کہتے رہے۔ وہ چپ چاپ سر جھکا رہا، کیا کہتا، جج تو یہی تھا اس نے یہ بات سنتے ہی فٹ اختلاف کا پرچم بلند کر دیا تھا اور سوچنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ انکار کی اچھی خاصی وجوہات تھیں۔ زندہ سلامت..... ایک تو تیرا اور دوسری خود موتی۔ آدھے پونے گھنٹے تک ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر ابھی ان سب کا جی نہ بھر رہا تھا لیکن جانا تو تھا اور پھر جہاں جانا تھا، اس کی کشش بھی اتنی بھر پور تھی کہ گھر تو کیا بندہ سارا جہاں چھوڑ کے بھی وہاں جانا چاہیے۔

☆=====☆

ایئر پورٹ سے واپس گھر جاتے ہوئے سب ہی چپ چاپ تھے بس کبھی کبھار اندر کی گود میں لپٹی گڑا کسی نامعلوم ہی وجہ کے تحت ایک احتجاجی چیخ ضرور بلند کرتی جس کے سدباب کے لیے وہ گرم کپڑوں اور کپڑوں میں ملغوف اس چوبیس سالہ کی بیٹی کو زور زور سے تھپانا شروع کر دیتی۔ اس کے دونوں بیٹے سکول میں تھے ورنہ اس وقت اس مختصر سی سوز کی ایف ایس میں بھونچا آیا ہوتا۔

صاف خاموشی سے باہر نکلتے ہی جگہ اس کے شانے پہ اپنا بکھرے بالوں والا سر بے لگاری سے ڈالے موتی پہ سیدھ سو رہی تھی، اس کے گرد صدف کی شال لپیٹی ہوئی تھی، ابراہیم نے جب بھی اسے دیکھا، کسی نہ کسی کے کپڑوں میں ہی دیکھا، کبھی عارف کے کٹے سے پٹاوری چیل پہنے پھر رہی ہوئی، کبھی پھوپھی اماں کی مختصر سی چل میں پیر پھنسائے سڑ پٹر کر رہی ہوئی۔ اس وقت بھی اس نے عارف کا ہی کھلا سار سن اور کالے چیک کا سونتر پکین رکھا تھا۔ کچھ دیر قبل براؤن اور اسکرین لکری لائننگ والی شال جو صدف لپیٹے ہوئے تھی اب موتی کے اوپر تھی۔

ابراہیم نے بے زاری سے بیک ویو سر سے نظر ہٹائی۔ ساتھ کی سیٹ پہ بیٹھے عارف پہ نظریں گئی تو اسے بھی اوجھٹا پایا۔ یقیناً ساری رات پھوپھی اماں نے اپنے ان دو لادلوں کو سونے نہ دیا ہوگا۔ ایئر پورٹ جاتے ہوئے اس کی گاڑی میں ابواورامی کے ساتھ پھوپھی اماں بھی تھیں اور وقفے وقفے سے مڑ کے پیچھے آتی ٹیکسی کو دیکھ جاتیں جس میں اس وقت یہ چاروں سوار تھے۔

”آئے ہائے، ان کی عقل دیکھو، صبح سویرے کا وقت، کڑا کے کی سردی اور صدف، کھڑکی کے شیشے اتار رکھے ہیں۔ یہ عارف تو موتی کھال کا ہے۔ صدف نے بھی شال سے منہ سر

رات کو گھر وقت پہ پہنچ جایا کرنا۔ ابراہیم نے بھی ڈیوٹی نہ کھانا ہوتا ہے، کوئی تمہارے گھر کی چوکیداری کے واسطے دن رات بیٹھا نہیں رہے گا۔“

وہ مزید تو ان کی دیکھا دیکھی امی جان کو بھی ہزک بھی، غوراً ابراہیم کو تائید کرنے لگیں۔ ”بیٹا! آج ہی سارا کام نٹالینا، گھر اچھی طرح لاک کر کے ساری ضرورت کی چیزیں ساتھ لے کر پھوپھی کے گھر چلے جانا۔ تمہارے چھوٹے بہن بھائی ہیں، ذمہ داری سے خیال رکھنا ان کا۔ تمہارے دم سے آپ کو بھی حوصلہ رہے گا ورنہ یونہی پریشان ہوئی رہیں گی۔“ ”جی امی.....“ بڑی مشکل سے اس نے لہجہ کو جتنی الامکان نرم رکھنے کی کوشش کی۔ اب ہٹا نہیں وہ کتنی مطمئن ہوئیں، ہونیں بھی یا نہیں۔

”چلو بھئی، اب اندر چلنے کی کرو۔“

ابو جان کا قہر وہ اسے حیات تو کی مانند لگا۔ اگر دگر کھڑے سب ہی عازمین جج اپنے پیادوں سے ملنے کے بعد سامان سمیت اندر جانے کی تیاری میں تھے۔ بادل نخواستہ امی اور پھوپھی اماں نے بھی اپنی اپنی اولاد کو مزید بدایتوں سے فیض یاب کرنے کا طویل دورانیہ کا پروگرام سہیلنا۔

موتی نے بی بی سسکی بھر کے پھوپھی اماں کو الوداع ”جھمی“ ڈالی۔ امی جان کا نرم گرم سا ہاتھ اس کے سر سے ہوتا مضبوط شانوں تک ٹھہر گیا۔ ان کی ڈیڈ پائی آنکھیں دیکھ کے ابراہیم کا سر خود دہی ان کے آگے جھک گیا۔ انہوں نے بیٹے کی روشن پیشانی پہ ایک پیار بھرا بوسہ ثبت کیا۔ سیدھے ہوتے ابراہیم کی نگاہ امی کے پیچھے کھڑے ابو جان پہ پڑی۔ وہ آگے بڑھ کے ان کے گلے لگ گیا۔ پچھلے کئی دن سے باپ بیٹے کے درمیان جو بھلی سی سرد مہری چھائی ہوئی تھی۔ ایک نکتہ چھٹ گئی۔ اس کی چوڑی پشت تھپتھپے ہوئے معظّم علی نے آہستہ سے کہا۔

”کھانا سنا معاف کرنا بیٹا!“

”ابو جان!“ وہ تڑپ گیا۔ باپ کے گرد اس کی گرفت اور مضبوط ہو گئی۔ یہ مختصر سا جملہ اسے شرمندگی کی اتھارہ گہرائیوں میں ڈبو گیا۔

”تمہاری ماں نے مجھے منع کیا تھا کہ سڑ پہ نکلے ہوئے بیٹے سے ایسا کوئی ذکر مت جیبنے نا جو کسی لٹی کا باعث بنے مگر میں جانتے جاتے صرف اتنا کہوں گا بیٹا! کہ ایک فرض میں ادا کرنے جا رہا ہوں، دوسرے فرض کی ادا نیکی تم پہ فرض ہے، اس کے بارے میں سوچنا ضرور..... میں مجبور نہیں کر رہا صرف سوچنے کا کہہ رہا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں، تم نے اس

لیٹ رکھا ہے لیکن موتی کو تو ٹھنڈ بڑی جلدی لگتی ہے اور وہ ندرت کی گود میں گزیا بھی تو ہے، اگر گئی ہوگی ٹھنی سی جان۔“

آخر وہ نہ سکیں اور گاڑی رکاو کے ان کے خوب لٹے لیتے ہوئے شیشے چڑھوئے۔ اگر اللہ کے گھر جانے کی خواہش اتنی شدید نہ ہوتی تو بھلا کب حوصلہ کپا تیں وہ کہیں جانے کا۔
”آیا! آپ کو گھر اتار دوں یا نہیں آئیں گی؟“ پوچھی اماں کی جگہ سی گلی کے ککڑ پہ گاڑی روکتے ہوئے ابراہیم نے پوچھا۔

”نہیں اتار دو، میں بھلو کی دادی سے کہہ آئی تھی کہ چند گھنٹے سنہال لیں بچوں کو۔ شام کو ان کے پیپا مجھے لیتے جائیں گے۔ اب بھلا تم کہاں یہاں سے ڈھوک چوہدریاں تک جاؤ گے۔“

وہ خاموش ہی رہا، جتنا تکلف نبھانا تھا۔ نبھا چکا، جانتا تھا سرسری سا بھی اخلاق مزید برتا تو نہ صرف اتنی ٹریفک میں سے گزرے ڈھوک چوہدریاں تک انہیں چھوڑنے جانا پڑے گا بلکہ ہوسکتا ہے وہ سیکے ہر بار شریف آدمی کرتے ہوئے ایک اینڈ ڈراپ کی ذمہ داری اسے ہی سونپ دیں۔ ندرت جو اپنی بات کہہ دینے کے بعد بھی اندر ہی بندھی تھی، ابراہیم کی مصلحت بھری خاموشی پر مایوس ہو کے آتر ہی گئی۔ ظاہر ہے اب شام کو اعجاز بھائی کے ساتھ سوزو کی پک اپ میں ڈیروں مسافروں کے ساتھ مل کے جانا کوئی اتنا خوشگوار بھی نہ ہوتا تھا۔
”ابراہیم بھائی! اندر نہیں آئیں گے؟“ خائف نے لمبی سی جھانکی لینے کے بعد پوچھا۔
”نہیں..... ابھی تو نہیں، میں کل بیچ ڈیوٹی کے بعد سیدھا نہیں آ جاؤں گا۔“ اس نے گاڑی اشارت کی۔

”چڑھا آئے امی ابو کو؟“ میزھیاں چڑھتے ہوئے اسے عقب سے سارہ آتر ہی کی آواز آئی۔
”جے تھاشا آتی نیند کچھ دیر کے لیے ٹاٹا ہوا وہ اگلے قدموں نیچے آتر آیا۔

”آؤ ناشتہ کرلو۔ بہت دیر کر دی تے۔ اچھا ہوا، میں نے پرانے نہیں ڈالے ورنہ ٹھنڈے ہو جاتے۔ تم بھجوا ڈیا پڑھو۔ میں بس ابھی ناشتہ لے کر آتی ہوں۔“
”آتر آنا شیتو میں نے صبح کر لیا تھا۔“

”صبح..... کہاں..... ایر پورٹ؟“ وہ چپکیں۔
”جی نہیں، ڈیوٹی سے میں سیدھا وہاں..... پوچھی اماں کے گھر گیا تھا۔ غلامت تو دس بچے کی تھی۔ آٹھ بجے انہیں لے کر مجھے ہی تو ایر پورٹ تک جانا تھا۔“

وہ خواہ خواہ ہی وضاحتیں پیش کرنے لگا۔ سارہ آتر ہی نے خاموشی سے سر ہلایا۔

”اچھا، چائے تو پیو گے؟“
”جی، لیکن آپ عنایت کے ہاتھ اوپر ہی بھجوا دیجیے۔“ اسے اعتقاد کیلے کے سارہ آتر ہی شرارت سے مسکرائیں پھر چھڑنے کے انداز میں کہنے لگیں۔

”ہاں جی، تم کیوں بیٹھے لگے یہاں..... اس وقت تیرا تو گھر پہ ہوتی نہیں جس کی کشش تمہیں باندھ رکھ دے۔“
”آتر! آپ بھی بس۔“ وہ جھل سا ہو گیا۔

”درست کہہ رہی ہوں۔ ابھی وہ ہوتی تو میں دیکھتی، کس طرح تم یہاں سے اٹھتے۔“
ابراہیم سر نیچا کیے مسکرانے لگا۔ آتر ہی کی بے تکلفی کبھی اسے ایسے ہی شرمندہ کر دیتی تھی۔

”نہیں آتر! بس میں چاہ رہا تھا، چائے آنے تک فریش ہو جاؤں۔“
ساری رات کی سخت ترین ڈیوٹی کے بعد تو اسے یوں بھی خند آیا کرتی تھی اور وہ دن کو کوئی کئی گھنٹے سویا کرتا لیکن چونکہ پچھلے دو دنوں سے امی اور ابو کے آنے کی وجہ سے اس کی دن کی نیند کا دورانیہ بھی کم رہا تھا اس لیے اس وقت نیند کا جھجھک بھر پور تھا۔ اسڑوٹک چائے کا گرما گرم کپ بھی اس پہ چھائی غنود کی کم نہ کر سکا۔ وہ یوں بے سدھ سو یا کہ شام کو چھ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں اور اوڑھنوں میں اندھیرا اچھا ہوا تھا۔ صرف سائینڈ ٹیبل پہ پڑے کلاک کے چمکتے ہندسے اندھیرے میں جگمگا رہے تھے۔ اس نے جھٹکے سے کھل پڑے کیا اور پہلے بیڈ روم کی پھر لاؤنج اور بیس کی لائٹس آن کرنے لگا۔ اللہ حیر سے اسے دھشت ہوتی تھی اور مغرب کے بعد لائٹس آن کرنے کا معمول امی جان سے خود بخود اس میں منتقل ہو گیا تھا۔ روشنی پھیلتی ہی میزھیاں سے تک تک تیل کی آواز ابھرنے لگی۔ ابراہیم کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے فوراً واش روم کا رخ کیا۔ پانچ منٹ کے بعد جب وہ ذرا بہتر طبعی میں باہر نکلا تو تیرا کلاؤڈ میں غے جھپٹے پایا۔

”وگاڈ! اتنی لمبی نیند۔“
”السلام علیکم..... ہمیشہ کی طرح تیرا کی جلد بازی اور بے تابانی پڑوکتے ہوئے وہ اس کی لائی کانی کی طرف متوجہ ہوا۔

”وعلیکم السلام۔“ اور ہمیشہ کی طرح تیرا نے اس کے اس طرح جتانے پہ چپا چپا کے سلام کا جواب دیا۔ اسے ابراہیم سے سخت شکایت تھی کہ پچھلے دو دنوں سے وہ مسلسل نظر انداز ہو رہی ہے۔ اسے امی، ابو کے آنے، پوچھی اماں کی طرف ٹھہرنے اور چپ چائے کی تمام

”تم حالات ہموار کرنے والا کوئی کام بھی تو نہیں کر رہے۔ تم نے اپنے ابو کو اصل وجہ بتائی ہوئی اپنے انکار کی تو وہ اتنا ناراض بھی نہ ہوتے۔ میں کہتی رہ گئی کہ ان کی روانگی سے پہلے بس ایک بار یہ بات کر لو گھر تمہاری ہمت ہی نہ ہوئی۔ البتہ وہ جاتے جاتے اچھا انتظام کر گئے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تمہیں اس گھر کا پابند کر گئے تاکہ ان کی غیر موجودگی میں بھی تم یہ بات فراموش نہ کر سکو بلکہ اگر صبح شام چلتے پھرتے ہر وقت وہ لڑکی تمہاری نظروں کے سامنے رہی تو شاید تم اپنی ضد سے ہٹ بھی جاؤ۔۔۔۔۔ ہے نا۔“

”عد ہو گئی۔۔۔۔۔ یعنی۔۔۔۔۔ اتنی بدگمانی۔۔۔۔۔ نہیں نیرا! ابو جان تو صرف۔۔۔۔۔“

وہ چاہتے ہوئے بھی اس کا تجربہ یہ رد نہ کر سکا۔ پہلے اسے یہ خیال ہی نہ آیا تھا کہ ابو جان کے اس اقدام کے پیچھے یہ مقصد بھی ہو سکتا ہے لیکن اب نیرا نے توجہ دلائی تو اسے بھی شک ہوئے لگا کہ ہونے ہو مجھے وہاں بھرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے لیکن دل ہی دل میں ابو جان سے خائف ہونے کے باوجود وہ نیرا کے سامنے اس کے اندیشے کو بوند سے بوند سے

”تم غلط سوچ رہی ہو۔ دراصل پچھو بھی اماں نے اپنے بچوں کی تربیت بالکل ایسے کی ہے جیسے کوئی مرثی اپنے چوڑے پردوں تلے چھپا کے پاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی کڑی نگہداشت کے نتیجے میں ان میں خود اعتمادی اور احساسِ ذمہ داری کہاں سے آئے گا بس یہی وجہ ہے میرے وہاں بھرنے کی۔ رہی بات میرے اس لڑکی کے بارے میں سمجھو ہونے کی تو یہ تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ تم نے اسے دیکھا نہیں۔ بلیوی نیرا! اس میں ایسی کوئی بات نہیں کہ تم میرے حوالے سے یوں عدم تحفظ کا شکار ہو۔“

اس نے اپنے طور پر تسلی دینا چاہی لیکن نیرا اٹا بگڑ گئی۔

”اچھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر وہ ذرا سی بھی حسین ہوئی تو پھر میرے لیے ضرور خطرہ بن سکتی تھی۔ تو مسز ابراہیم! زمانے میں مجھ سے حسین اور لڑکیاں بھی ہوں گی اور کوئی ہوں گی، مجھے تو ہر لمحہ عدم تحفظ کا شکار ہونا چاہیے۔“

”یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ تم سے حسین بھی کوئی اور ہے؟“

اس نے گہری نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے حسن بے پردہ کے تو بے شک جسے کو دیکھتے ہوئے کہا اور ابراہیم کی توقع کے عین مطابق اس کا سارا پیش بس اس ایک جملے کی مار بھی نہ سہہ سکا اور جھاک کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ تانت تراؤں میں دونوں ناگیں صوفے پہ بیٹھے بیٹھی تھیں، بلیک ویلٹ کے فنگل والے ٹراؤز میں سے پنڈلیوں کا سڈول پن واضح ہو رہا تھا اور گورے نازک ٹخنوں کی جھلک بار بار ابراہیم کا دھیان بٹا دیتی تھی۔ نیٹ کا دوپٹہ آدھا گود میں

مصرفیات دوبارہ سے بتاتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے ابراہیم دل ہی دل میں خوف زدہ ہو رہا تھا کہ اگر نیرا کو یہ پتا چلا جائے کہ وہ ان کے واپس پاکستان آنے تک پھوبھی اماں کی طرف بھرنے والا ہے تو شاید اسے منانے میں اگلے ہی دن لگ جائیں۔

”چلو ٹھیک ہے جو ہوا سو ہوا، معاف کیا۔“ بڑی شامندی نراکت کے ساتھ نیرا نے اپنا موی ہاتھ لہراتے ہوئے اس کی گلو خلاصی کی۔ ”لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ معافی ملنے کے بعد تم سٹانی کا ارادہ بھی ترک کر دو۔ کل سے میرے کالج آنے سے بھی آدھ گھنٹہ پہلے تم جاگ جایا کرو گے اور میرا انتظار۔۔۔۔۔ نہیں بلکہ بیٹھے کالج سے کہہ کر دو گے ہم ایک اچھا سا چایا کر س گے۔ دوپہر میں گھر پہ کارڈز بھیلیں گے، کیرم کی بازی لگا کرے گی، اچھی اچھی موویز دیکھیں گے پھر شام کو ڈیوٹی پہ جانے سے پہلے تم میرے ہاتھ کا ڈنڑکا کرو گے ٹھیک۔۔۔۔۔“

ابھی ابراہیم سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے کئی روزہ پروگرام کے جواب میں وہ اپنا پروگرام کیسے سامنے کرے گا کہ نیرا کی توجہ کا ریڈر میں دھڑ سے بیگ اور بریف کیس پہ پڑی۔

”یہ یہ کس کا ہے؟“

”میرا۔“ وہ ذرا سستکھارا اور تمام تر ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”دراصل پچھو بھی اماں حج پہ تو جانا چاہ رہی تھیں لیکن گھر اور بچوں کی وجہ سے فکر مند تھیں۔ اس لیے ابو نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی انہیں تسلی کرادی کہ ان کی غیر موجودگی میں میں اتنے دن وہیں ان کے گھر رہوں گا۔“

”تنت۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔ غصے اور حیرت کی زیادتی سے نیرا اس سے زیادہ کچھ بول ہی نہ سکی، لب بچھٹے قائل لگا ہوں سے اسے گھورتی رہی۔ ابراہیم نے اس حادثاتی خاموشی کو غنیمت جانتے ہوئے وضاحت جاری رکھی۔

”میں چاہتا تھا بعد میں انکار کر سکتا تھا لیکن ایک اور انکار کا مطلب ہوتا ابو جان کی مزید ناراضی۔ تم جانتی ہو کہ ان کے فیصلے کو رد کر کے اور اپنی مرضی ان کے آگے رکھ کے میں نے پہلے ہی ای ابو دونوں کو خفا کر دیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کی ناراضی اور غصے کے باوجود میں ان کا یہ فیصلہ ہرگز قبول نہیں کروں گا لیکن یہ دوسری بات۔۔۔۔۔ یہ نسبتاً کم ناقابل قبول اور عارضی سی ہے۔ اس کے سامنے یہ نقصان کم اور فائدہ زیادہ ہے۔ میں چاہتا تھا کہ جاتے جاتے ابو جان کا دل میرے لیے نرم ہو جائے۔ ایسے میں وہاں رہنے سے صاف انکار کر کے میں مزید حالات کیسے خراب کر لیتا۔“

اس نے جلدی جلدی اپنی بات مکمل کی۔ مبادا اس کی بات سننے بغیر ہی نیرا ایچٹ پڑے۔

پڑا تھا اور اُدھا نیچے کارپٹ پر گر ا ہوا تھا۔ شولڈر کٹ سرفی مائل براؤن بال ناز سے جھٹکتی اور آلوچہ کے رنگ کی اپ اسٹک سے بچے گداز کیوں کو شراست سے دبا کر مسکراتی وہ ابراہیم کے ہوش اُڑانے لگی

”میں تیار ہو کے آتی ہوں، مجھے ڈنر پہ لے کے جاؤ۔“

”تیار..... کیا ابھی تمہیں اور بھی تیار ہونا ہے؟“

وہ حیرت سے اس کے تک سک سے درست چلیے کو دیکھنے لگا۔ سیلف پرنٹ ویلوٹ کے اسٹاکس سے ٹراڈز اور شارٹ شرٹ میں لمبوں لائنٹ میک اپ اور سلور نازک سی جیولری کے ساتھ وہ خاصی اہتمام سے تیار ہوئی تھی۔

”ہاں تو اور کیا؟ آج تم مجھے ہی۔ سی میں ڈنر کر رہے ہو اچھا.....“

وہ تو آڈر ڈرے کے مڑ گئی۔ ابراہیم حساب لگانے لگا کہ کس وقت تک ڈنر کے لیے نکلا جائے تاکہ بی۔ سی سے چھٹا لک واپس نہرا کو ڈراپ کرنے کے بعد وہ ٹائم پر ڈیوٹی کے لیے پریس پہنچ جائے۔ اچھا خاصا لمبا پیکر تھا۔ پہلے اس نے سوچا۔ نہرا کو بی۔ سی کے بجائے میپس انکیم تھری میں کسی ریسٹورنٹ میں ڈنر کرنے پر آمادہ کر لے لیکن پھر اس نے خود ہی یہ ارادہ ترک کر دیا۔ مشکلوں سے تو اس کا مود ٹھیک ہوا تھا۔ وہ ڈریس اپ ہونے کے لیے اٹھا تو راستے میں پڑے سوٹ کیس کو دیکھ کر ٹھکا۔ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کودا اور وہ قریبی صوفے پر گرنے کے انداز میں ڈھیر ہو گیا۔

”اوہ، نوہ۔ مجھے کل صبح ڈیوٹی کے بعد چھوٹی اماں کے گھر رہنے جانا ہے۔ صبح تو نیند اور تھکن کے مارے اتنی بری حالت ہوتی ہے پریس سے ڈرائیو کرتے ہوئے یہاں تک آکر سامان لے کر وہ بارہ چھوٹی اماں کے گھر تک جاسکا تو قدر مشکل ہے اور ساری رات یہ سامان ساتھ ہی تو نہیں رکھ سکتا۔ بریف کیس اور بیگ کی تو خبر ہے لیکن کمپوز بھی ہے اور وہ جاگنگ مشین بھی۔ وہ سب تو ڈیگی میں رات بھر نہیں چھوڑ سکتا۔ پارکنگ کی سیکورٹی تو ایک دم ناقص ہے۔“

واحد مل سہی تھا کہ وہ ڈیوٹی پہ نکلنے ہوئے راستے میں رک کر یہ سارا سامان چھوٹی اماں کے گھر پہنچا دے۔ اگر نہرا اساتھ ہوئی تو کسی نہ کسی ہدمز کی کانڈیش تھا اور ڈنر سے فارغ ہو کر اسے ڈراپ کرنے کے بعد یہ فریضہ انجام دیتا تو پریس سے لیٹ ہو جاتا۔ تا چار اس نے اول الذکر صرل پہ عمل کرنے کا سوچا اور دل گردہ مضبوط کر کے نہرا کا سامنا کرنے کی بہت متعجب کرنے لگا۔ پہلے اس نے عنایت کی مدد سے سارا سامان گاڑی میں منتقل کیا، اپنا کمرہ لاک

کیا، ٹیرس کے علاوہ تمام لائسنس آف کر کے وہ خاموشی سے بیڑھیاں اُترا۔ نیچے لاؤنج میں انکل کیبل سے جی بھلارہ تھے۔

”ہاں بھئی ابراہیم! بڑے دنوں بعد سامنا ہوا۔“

”جی ہنسی وہ مصر فیت ہی کچھ ایسی رہی۔ امی اور ابو لاہور سے آئے ہوئے تھے۔ انہیں جج کے لیے روانہ کرنا تھا۔“

وہ صوفے پہ بیٹھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ نہرا کے روم سے برنی سپیر کا Evening Party ملن پھاڑ رہا تھا۔

”بھئی تمہارا آئی تو کسی پارٹی میں گئی ہیں۔ نہرا اندر ہی ہوگی۔ جاؤ چلے جاؤ۔“ انہوں نے ریسوٹ پر بے چینی سے انگلیاں تھرتھاتے ہوئے کمال سے اکتھانی سے اجازت دی۔ پچھلے دو تین ماہ میں انکل اور آئی دونوں کے کھلے ڈلے مزاج سے اچھی خاصی آگاہی ہو جانے کے باوجود وہ اس اجازت پہ ہکا بکا رہ گیا۔

”جی؟“ اسے لگا شاید سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ بھلا انکل اپنی بیٹی کے کمرے میں ایک جوان جہان کرائے دار مرد کو جانے کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں۔

”تم تو جانتے ہو، وہ تیار ہونے میں کتنا وقت لیتی ہے۔ کب تک یوں بیٹھے انتظار کرتے رہو گے۔ اس کا ڈیک فل وایوم میں بیج رہا ہے۔ یہاں سے آواز دی تو بھئی نسن سکے گی۔ جاؤ شاباش، بلا کے لاؤ اسے..... تمہیں دیر ہو رہی ہوگی۔“

انہوں نے بعد اصرار ابراہیم کو گھایا۔ شش و پنج کا شکار ابراہیم کو پڑو تک جاکے یونہی ذرا سا پلٹا تو اچھتی کی نظریں۔ دی اسکرین تک گئی اور آنکھیں جیسے پوری کھل گئیں۔ جمیل ایک بار پھر پیچھے ہوجا تھا۔ فیشن ٹی۔ وی پہ انکل اس وقت بلیک بیوٹی ٹوئی سمیل کی کیٹ واک دیکھ رہے تھے اور شاید یہی وجہ تھی اسے فوراً سے چیئرٹر لاؤنج سے غائب کرنے کی۔ وہ لا حول پڑھتا دائیں جانب مڑ گیا۔ دو تین بار زور زور سے ٹھک ٹھک کرنے کے بعد دروازہ کھلا اور نہرا کی صورت نظر آنے سے پہلے اس کی آواز سنائی دی۔

”اوہو، کیا ہے پاپا؟“ وہ جھٹلائی پھر اسے دیکھ کر پشیمان ہو گئی۔

”بس دو منٹ..... آ جاؤ۔“ مکمل کلر کی لاگ اسکرٹ کے اوپر اس نے ہاٹ ریڈ کلر کی ہائی ٹیک مہین رکھی تھی اور ان ہی دو رنگوں کے استراج کا خوبصورت اسکارف اس کی لائنی گردن پہ لپٹا ہوا تھا۔ ریڈ لپ اسٹک اس کے بے تحاشا گوری رنگت والے چہرے پہ بڑی بھلی لگ رہی تھی۔

”بس یہ شوز پہن لوں، تو نکلتے ہیں۔“ ریڈ لیدر کا شوذر بیک شانے پہ اٹکا کر ہائی ہیل سینڈل میں پاؤں جھنڈاتے ہوئے اس نے نظر اٹھا کر ابراہیم کو تسلی دینا چاہی۔ اس نے غور کیا، تیرا کی آنکھوں کا رنگ بھی تبدیل ہو چکا تھا۔ کچھ دیر قبل اس نے گرے لیس نگار کے تھے اور اب لائٹ براؤن لگے ہوئے تھے۔

”وہ..... تیرا..... کیا ہوا کہ..... دراصل ابھی ابھی آفس سے فون آیا ہے کہ کوئی ایمر جنسی ہے۔ مجھے ڈیوٹی پہ دھکے پہلے پہنچنا ہو گا۔ تو اس وجہ سے.....“ تیرا کی خشمگین نگاہیں اسے بوکھلائے دے رہی تھیں۔

”تو..... تو کیا.....؟“ سیدی طرح کہو تا کہ مجھے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ یہی بات ہے نا؟“ حیر لیے جس کیسے کہتے تیرا ایک دم ہنپہر کر گرسکتے گی، وہ اور بھی بوکھلا گیا۔

”او ملیر تیرا! پلایز رومٹ..... بچوں کی طرح بی ہیومت کرو۔ ٹرائی نو انڈرا سٹینڈ، میری ٹی ٹی جاب ہے۔ سٹیل ہونے میں ٹائم لگے گا۔ میں اپنی ڈیوٹی اکتور کرنا افورڈ نہیں کر سکتا۔“

”مجھے تو اکتور کر سکتے ہو؟“

”ہرگز نہیں لیکن تم تو میری براہم سمجھو۔ اچھا دیکھو، پکا پراس، کل نہ صرف ڈز کر میں گئے بلکہ آؤنگ ہے بھی چلیں گے۔“

”میں اسلام آباد جاؤں گی۔ ہر مارکیٹ میں بڑے اچھے نئے پرنٹ آئے ہیں۔ کب سے ماسے کہہ رہی ہوں بے چلیں۔“

”اوکے..... ذن.....“ بمشکل بہت سے وعدوں، تسلیوں سے بہلا کر وہ یہاں سے نکلا۔ اگرچہ بتا دیتا تو شاید زیادہ دیر لگ جاتی وضاحتوں میں جب وہ راجہ بازار میں بازو مارکیٹ کی بیک پر نیا محلہ میں پہنچا تو اٹھ بیچے والے تھے۔ عارف لپک کے آیا اور اس کا سامان اندر پہنچانے لگا۔

”آپ..... آپ تو صبح آنے والے تھے۔“ صدف نے کچھ حیرت کچھ پریشانی سے پوچھا تو وہ چڑ گیا (ایک تو یہاں آنے کی وجہ سے اتنی بربک تیرا کے ساتھ سر کھپانا پڑا اور یہ محترمہ اعتراض کر رہی ہیں کہ آپ تو صبح آنے والے تھے)

”واپس چلا جاتا ہوں۔“ بے حد شگ انداز میں لپکے گئے اس مختصر جملے نے صدف کو مزید حیران پریشان کر دیا۔

”جی؟ میرا مطلب یہ نہیں تھا، میں تو صرف.....“

”میں صبح ہی آؤں گا، ابھی صرف سامان آیا ہے۔“

صدف کے چہرے کے اڑتے رنگوں کو دیکھ کر اس کا دل ہلچ گیا۔ اب وہ قدرے نرمی سے بولا۔

”آپ چائے پیسے گے؟“

”چائے..... ہوں..... نہیں۔ ایسا کرو مجھے کھانا لا دو، میں آل ریڈی خاصا لیت ہو چکا ہوں۔ نو بجے تک مجھے پرہیز پہنچنا ہے۔ میں نے آج کچھ بھی نہیں کیا۔“

وہ بھوک کا احساس ہوتے ہی وہیں بیٹھ گیا۔ اب تو خاصے دن یہاں ہی رہنا تھا، تکلف کتنے دن تک چلا۔ ویسے بھی ریسٹورنٹ جانے کا نام بھی تو نہ رہا تھا ورنہ اسے تکلیف نہ دیتا کیونکہ اس وقت وہ دس بارہ بچوں میں گھر کی بیٹی انہیں نیشن دے رہی تھی۔

”آپ نے کچھ بھی نہیں کیا؟“ وہ پھر جی سے اٹھی۔ پریشانی کے رنگ مزید گہرے ہو گئے۔ ابراہیم نے سر جھکا (محترمہ کو ہنپ نظر آنے کا زیادہ ہی مراقب ہے) ساتھ ہی جگن میں کھڑ پڑکی آواز میں اور عارف کو پڑنے والی بلند پکاریں سنائی دینے لگیں۔

دس منٹ پونہی گزر گئے تو ابراہیم نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے ٹائم دیکھا۔

”ہو سکتا ہے، پڑھانے کی مصروفیت میں اس نے اب تک کھانا تیار ہی نہ کیا ہو۔ اس نے سوچا اور کمرے سے باہر جھانک کے دیکھا۔ موتی ایک ہاتھ میں چادر اٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے بکری کی ری تھا سے اندر گھسیتی لا رہی تھی۔

”آپ نے راجہ کو دیکھا؟“ جواہر ابراہیم نے ایک سر آدھ بھری۔ پچھلے تین ماہ میں وہ جتنی بار بھی اس گھر میں آیا۔ موتی نے اپنے لاڈلے بکری کا تعارف اس سے یہی کہہ کر کر دیا تھا۔

”دیکھیں ذرا، کتنا موٹا اور نگرا ہو گیا ہے۔ میں روزانہ اسے اپنے ہاتھ سے ”پٹھے“ (چارہ) ڈالتی ہوں۔ چچی جان تو کہہ گی ہیں کہ راجہ کی طرف سے میں موتی کی وجہ سے بالکل بے فکر ہوں۔“

”اسے لے جا کہاں رہی ہو۔“

”اندر چکن کے ساتھ والے اسٹور میں باندھوں گی۔ رات کو سردی ہوتی ہے جگن میں۔“

”تمہاری آپ کہاں ہیں؟“

”میری کیا؟“ اس کی بڑی بڑی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ ”میری تو کوئی آپ نہیں۔“

”اوہو..... وہ صدف؟“ وہ سخت جھنجھلا رہا تھا۔

”اچھا..... آپ!..... وہ تو آپ! ہیں اور ندرت کو میں باجی کہتی ہوں۔“

ابراہیم اس وقت آپا، آپا، آپا اور باکی کے درمیان فرق تلاش کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔
نیل سے گاڑی کی چابیاں اٹھا لے ہوئے کہنے لگا۔

”میں جا رہا ہوں، دروازہ لاک کرلو۔“

”کھانا کھینچے میں سے نیل لگا دی ہے۔“

عقب سے صدف کی نرم سی آواز پہ پلٹا۔ دل تو چاہا انکار کرتا ہوا سیدھا باہر نکل جائے
لیکن اتنی شائستگی پیشکش پہ یوں بدتریزی کا مظاہرہ کرنا خود اسے مناسب نہ لگا۔ خاموشی سے آ
کر ڈانٹنگ نیل پہ بیٹھ گیا۔ سادگی سے کی تازہ دھواؤں شگ پودینہ چمڑی ہوئی گاڑھی دی،
موگ کی کڑی یعنی ہوئی دال اور لیٹوں کا اجار نیل پہ بچا ہوا تھا۔ انگلی ہی لمحے صدف نے
سنے دستروان میں لپے کر گرم پھلے اور شے کی بیٹنی پلٹ میں سنہری تلے ہوئے شامی
کباب بھی آگے دھریئے۔

”عالم کباب ہے؟“ اسے اکیلے کھانا کھانا مناسب معلوم نہ ہوا تو دریافت کر بیٹھا۔
اسی اثنا میں کال بیل کی آواز آئی۔

”لوشیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر۔“

موتی جست لگا کے باہر دروازہ کھولنے لگی۔ عاکف نے آتے ہی ہاتھ میں پکڑا شاپر
کھولا اور نیل پہ موجود خالی پلٹ میں گرما گرم چکن ٹکڑے لٹنے لگا۔

”سوری بھائی جان! تھوڑی دیر ہو گئی، رست بہت تھا۔“

”اس کی کیا ضرورت تھی؟“ وہ شرمندہ ہو گیا۔ ”جب گھر میں کھانا پکا ہوا تھا تو باہر سے
لانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”دراصل مجھے نظم نہیں تھا کہ آپ رات کو..... غلطی میری ہی ہے مجھے آپ کے لیے
اہتمام کر کے رکھنا چاہیے تھا۔“ صدف اس کی پلٹ میں نکلے اٹھا اٹھا کے رکھنے لگی۔

”اہتمام کر لیتے؟ میں کوئی مہمان ہوں اور چائیز، آئندہ یہ تکلف مت کرنا ورنہ مجھے
یہاں اطمینان اور بے تکلفی سے رہنے میں مشکل پیش آئے گی۔“

اس نے پھوپھی اماں کے نامساعد گھریلو حالات اور سادہ طرز زندگی کی وجہ سے کہا ورنہ
حقیقت تو یہ تھی کہ موگ کی دال اور اچار دیکھ کر اس کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ وہ پھیلے اٹا چنورا
ہرگز نہ تھا، اگرچہ دال اور ہزری بچپن سے ہی زیادہ نہ بھاتی تھی لیکن پھر بھی اسی جان کھانا
مہذب ہی نہیں۔ اپنے میں ایک آدھ بار منہ ڈالنے کے بعد کوال بھی کھائی جاتی لیکن جب

سے وہ چکلا۔ میں سے فرج ولاز اسکیم کے اس آف وائٹ دیواروں اور گرین دروازوں
والے پنگلے میں بطور بے انگ گیسٹ آقا تھا، اسے نت نئے پُر تکلف کھانوں کی چاٹ پڑ گئی تھی
اور تیرا سے دن بدن بڑھتی دوتی نے اسے ہونٹنگ کی لت بھی ڈال دی لیکن جو بھی تھا، پھوپھی
اماں کی غیر موجودگی میں وہ ان کے گھر آنے کو زیر بار نہ کرنا چاہتا تھا اس لیے دل ہی دل میں
ارادہ کر لیا کہ جتنے دن وہ یہاں رہے گا، وہ تمام رقم صدف کو دے دیا کرے گا جو کہ وہ دو
وقت کے کھانے اور ناشتے کی مدد میں سارہ آٹنی کو الگ سے پکڑا کرنا تھا (کرائے کے
علاوہ)

☆=====☆=====☆

اسے یہاں آئے تیرا روز تھا اور پچھلے دو دن جو اسے تیرا کی ناز برداری کرنا پڑی تھی،
اسے ایسا لگنے لگا تھا کہ جیسے اس نے یہاں آ کر کوئی جرم کر لیا ہے جس کی پاداش میں اسے اپنی
آجی تنخواہ تیرا کی شاگ پہ لٹانی پڑی۔ کبھی کبھی تو اسے تیرا کا رویہ بڑا عجیب سا لگتا۔ اس کی
بے تکلفانہ فرمائشوں پہ ٹھک بھی جاتا لیکن پھر اس کے مسکین چہرے پہ چھائی حد درجہ
معصومیت اور لہجے سے نہایت پکڑنا اشتیاق کوئی غلط خیال دل میں آنے ہی نہ دیتا۔

”اور کچھ نہیں، بس طبیعت میں لا پرواہی زیادہ ہے اور پھر مجھے اپنا محنتی ہے، اسی لیے تو
بے تکلفی سے فرمائش کر ڈالتی ہے۔“

وہ سر جھٹک دیتا لیکن ان دو دنوں میں جس طرح تیرا نے اسے بوتکس، سی ڈی شاہین،
جیولرز اور ریشورٹس میں پرہیز کروائی تھی۔ وہ پکا ارادہ کیے بیٹھا تھا کہ بیماری کا بہانہ نہ کرے کچھ
دن اس سے بالکل ملتے نہیں جائے گا شمر ہے کہ یہاں کا ایڈریس اس کے پاس نہیں تھا، ہاں
موبائل پہ وہ بار بار آنے کا اصرار ضرور کر سکتی ہے لیکن فون پہ جھوٹا یونان کون۔ نامشکل کام تھا۔
وہ ابھی ابھی سو کے اٹھا تھا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ کچھ دیر نرم
گرم گرم دھوپ کا مزہ لینے کے ارادے سے صحن میں نکلا لیکن کونے میں بندھے ”راجہ“ کے
شور اور گندگی کی بدبو نے ملے بھر نے داہو پلٹ کر اندر جانے کو تھا کہ کال بیل کی آواز پہ
مڑا۔ دروازہ کھولا تو صدف سامنے تھی۔ آہستگی سے سلام کرتی وہ اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں
کیٹو اور رامرد کے قبیلے تھے۔ وہیں تخت پہ دھر کے موتی کو آواز دی۔

”جی آپ!۔“

”موتی! صرف چارہ ڈال دینے سے تو ذمہ داری پوری نہیں ہو جاتی، دیکھو ذرا کس قدر
گند پھیلا ہوا ہے صحن میں۔ میں جس ساری جھاڑو دے کے اور یہ پور کونافیا کل سے دھو کے

مٹی تھی۔ تم کم از کم یہ کھرا ہوا چارہ تو جھاڑو سے ایک طرف لگا دیتیں۔ چلو، ساری صفائی کرو مگن کی۔“

”اگو سے بھی کہیں۔“ وہ منمنائی۔

”بائی دے وے، یہ عید سے کئی مہ پہلے بکرا خریدنا اور پھر اسے اتنے ناز و نعم سے پالنا کیا بہت ضروری ہے۔“

”ضروری تو خیر نہیں لیکن یہ ہمارے گھر کی روایت بھی ہے اور ضرورت بھی۔ آپ نے لکھا تھا کیا؟“ اس نے بچن کی طرف مڑتے ہوئے اچانک سوال کیا۔

”نہیں۔ مجھے تو جاگے ہوئے ابھی کچھ ہی منٹ ہوئے ہیں۔“

وہ عموماً اسی وقت جاگا کرتا جب صدف سکول سے آنے والی ہوتی یا کچھ دیر قبل آئی ہوتی اور وہ یہ سوال کرنا کبھی نہ بھولتی تھی۔ بلکہ جب صبح سویرے وہ ڈیوٹی سے واپس آتا تو وہ سکول جانے کے لیے بالکل تیار ہوتی لیکن اس کے شستے سے غافل نہیں ہوتی تھی، تمام تیاریاں مکمل ہوتیں، ہاٹ پائٹ میں خست کر کرے پراٹھے، ٹی پائٹ میں دم کی ہوئی جائے اور بیالے میں آلیٹ کے لیے لٹکس کیا ہوا آمیزہ۔ صدف جاتے جاتے کسی نہ کسی طرح ہتھوڑے کو مٹی کو چنگے کے بعد بچن میں لاکھڑا کرتی اور وہ جمائیاں لیتے ہوئے فرانی پان میں یہ آمیزہ الٹ کر تلنے کی زحمت گوارا کر لیتی۔

ابراہیم کو صدف کے اسٹیپنا پر حیرت بھی ہوتی تھی اور رشک بھی آتا تھا۔ کئی گھنٹے پراٹھری کلاسز کے بچوں کے ساتھ سرکھپا کے آنے کے بعد بھی وہ کمال کی تازہ دم ہوتی، آتے ہی گھر کے سب کاموں کو اپنے ڈے لے لیتی۔

وہ اس کے پیچھے ہی بچن میں چلا آیا کیونکہ عارف گھر پہنچا اور مونی کو ابھی اس نے دال چاول کی بھری پیٹ سے تیرد آزما دیکھا تھا۔ اس لیے مناسب نہ سمجھا کہ صرف اس کے لیے وہ ٹیبل سجائے۔

”نہیں کھا لیتا ہوں میں بھی۔“

کاؤنٹر کے نزدیک موڑ حاکمیت کے وہ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ وہ چپ چاپ ڈش میں چاول نکالنے لگی، ایک دو ٹکے میں دال نکالنے کے بعد اس نے چھوٹے سے ڈونگے میں فرانی پان میں بھجوں کے رکھا قیر کا لٹاوا ابراہیم کا دھیان بھراس طرف چلا گیا کہ صرف اس کی وجہ سے اسے دونوں وقت خالص اہتمام کرنا پڑتا ہے ورنہ وہ قیر اتنی کم مقدار میں نہ بھجوتی۔ اس نے اپنی لاچارپی اور مہکلو پن پر خود کو ڈنڈا اور اسے فریج سے آنا نکالنے دیکھ کے فوراً منع

کرنے لگا۔

”اگر اپنے لیے روٹی پکا رہی ہو تو ٹھیک ہے میرے لیے مت پکانا۔ میں چاول ہی کھاؤں گا۔“

صدف نے بھی اصرار نہ کیا۔ پہلے ابراہیم نے تھوڑے سے چاولوں پر وہ کالی کالی گاڑھی دال ڈالی اور سفید چاول اور کالی دال کے کئی نیش پے غور کرتا ہوا جھک کے کھانا شروع ہوا۔ اپنی شکل و صورت سے قطعی نظر دال کا ڈانڈ خوشگوار حد تک اچھا تھا یعنی سیرت عمدہ تھی۔

”اس دال کا نام کیا ہے؟“ وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

”ثابت مسور۔ آپ نے پہلے کبھی نہیں کھائی؟“

”نہیں۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ بس نام یاد نہیں رہتے۔“

اس نے بتانا ضروری نہ سمجھا کہ ایسی گاڑھی پتی ہوتی دالیں یوں چاولوں پہ الٹ الٹ کے کبھی نہیں کھائیں۔ کبھی کبھار خوب سالے والی ماش کی بجنی دال کھایا کرتا تھا یا عرصے بعد اگر امی جان چنے پکاتیں اپنے مخصوص لاہوری انداز میں، لیکن آج گاڑا اور ہری مرچ کے اچار اور مونی کی پٹنی کے ساتھ دال چاول کھانے میں اسے واقعی لطف آ گیا۔ کچھ دیر بعد عارف بھی آ گیا۔ قیر دیکھ کے اس نے یہ بلیک اینڈ وائٹ لٹچ لٹچ کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

”میر کر پھر، کھانا ختم کر کے ڈالتی ہوں روٹی۔“

”یہ مونی کس مرض کی دوا ہے؟“ ابراہیم نے پوچھا۔

”وہ تو خور مرض ہے اور وہ بھی لا علاج۔“

عارف نے قہقہہ لگایا پھر انھ کے تواجو لے پر رکھنے لگا۔ فریج سے آٹا نکال کے بھی باہر رکھ دیا۔

”ابراہیم بھائی! آپ کا تو تھوڑے سے بھی قریب ہے، کیا خیال ہے پارٹی ہو جائے۔“

اس نے نہ جانے کہاں سے خیال آیا۔ خود ابراہیم بھی حیران رہ گیا۔

”میرا تھوڑے۔۔۔ ابھی کہاں، ابھی تو فوری ہے۔“

”دلیس آپ کو اتنا نہیں بھی پتا کہ آپ بڑی عید یعنی بقر عید کو پیدا ہوئے تھے ہم تو امی جان سے ہزاروں بار یہ واقعہ سن چکے ہیں کہ کس طرح عید میں دن آپ نے رونق افروز ہو کے عید کی خوشیاں دو بالا کر دی تھیں اور امی عید کی مناسبت سے آپ کا نام رکھنے کا فیصلہ ہوا تھا، آپ کی دادی محترمہ تو آپ کا نام بکر دین یا عید محمد عرف عید رکھنے پہ بعد تھیں، یہ تو ہماری امی جان نے سچ میں پڑ کر ابراہیم نام تجویز کیا، عید، امی اور قربانی کے حوالے سے یہ

نام سب کو پسند آیا اور سب ہی اس پر متفق ہو گئے۔“

”واقعی..... پھر تو واقعی پھونکی اماں نے بڑا احسان کیا مجھ پر۔“

ابراہیم نے تصور میں خود کو ”عیدو، عیدو“ کی صدا میں پڑتے دیکھ کے ہنسنے لگا۔

”ممانی جان نے کبھی یہ واقعہ آپ کو نہیں سنایا؟“

”در اصل مجھے اپنے بچپن کے قصے سننے سے خود ہی دلچسپی نہیں۔“ اس نے صاف گوئی سے اعتراف کیا۔

بچپن کی حماقتیں اور لڑکپن کی بدحواسیاں سوائے شرمندگی کے اور کچھ بھی کیا ہیں جو انہیں دہرایا جاتے۔

”ہائے، مجھے تو بڑا مزہ آتا ہے، کوئی کرے نہ کرے میں خود ہی عمر رفتہ کو آواز دے لیتا ہوں۔ جیسے کہ ہر سال بڑی عید آتے ہی مجھے بچپن کی وہ تمام بفر عیدیں یاد آ جاتی ہیں جب میں قربانی سے کچھ درختوں میں اپنے تمام ”راجاؤں“ کے لپٹ لپٹ کے دھاڑیں مارا کرتا تھا اور ابو اور چاچی وغیرہ کے ہاتھ پہ دانت تک گاڑ دیا کرتا تھا، رسی چمڑوانے کے لیے۔ اسنے مہینوں کے ساتھ سے قربت اور انسیت تو ہو ہی جاتی ہے وہ تو اب بھی ہوتی ہے لیکن بچپن کی محبتیں بڑی زور آور شدت پسند ہوتی ہیں..... ہاں؟“ وہ کہیں کھوسا گیا۔

”تو پھر اسنے دن پہلے کبھی پالنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ پانچو جانور کی طرح اس کی سیوا کی جائے، لاڈ اٹھائے جائیں، ہنہلایا دھلایا جائے اور پھر اپنے ہاتھوں سے قصائی کے سپرد کرتے ہوئے دل کا پتا تو ہوا اور بچپن میں تو یوں بھی دل زیادہ حساس ہوتا ہے۔ کیا ضرورت ہوتی ہے بچوں کے کچے دھنوں کو یوں جھکا لگانے کی۔ میں ابھی صدف سے یہی پوچھ رہا تھا۔“

ابراہیم نے خاموشی سے کھانا کھاتی صدف کو گفتگو میں شامل کیا۔

”میں آپ سے کچھ بھی ہوں کہ یہ ہماری ضرورت بھی ہے اور کئی سالوں سے اب روایت میں بھی شامل ہے۔ پہلے میں ضرورت کی وضاحت کروں۔ ضرورت اتنی اشد اور ناگزیر بھی نہیں بس سہولت کہہ دیجیے۔ آپ جانتے ہیں قربانی ہر صاحب استطاعت پر فرض ہے اور اس استطاعت کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ بہت سے لوگ عید کے نزدیک اخراجات زیادہ ہو جانے کی وجہ سے بکرا لے نہیں پاتے، ان دنوں قیمتیں بھی آسمانوں سے باہر کر رہی ہوتی ہیں۔ عام درجے کا بکرا بھی پانچ سات ہزار سے کم نہیں

ملتا۔ لوگ تین چار ہزار جب میں ڈال کر بکرا منڈی جاتے ہیں اور نا کام لوٹ کر بڑی آسانی سے خود کو صاحب استطاعت افراد کی لسٹ سے خارج کر کے قربانی کے فریضے سے بری الذمہ ہو جاتے ہیں جبکہ اکثریت ان میں سے ایسی نہیں ہوتی۔ اگر کچھ مہینے پہلے ہی وہ لوگ پلان کر کے واقعی قربانی کی نیت سے رقم پس انداز کریں تو با آسانی اس فرض سے سبکدوش ہو سکتے ہیں۔ امی جان نے اس کا صلہ یہ نکالا کہ اپنے ان عزیزوں اور ملنے والوں سے جو دیہات وغیرہ میں رہتے ہیں، بکرے کا نوڑا عیدہ بچے کے کربانی کی نیت سے پانا شروع کر دیا۔ یہ سستا پڑتا ہے، اگرچہ سال بھر اس کے چارے وغیرہ کا خرچہ بھی ہوتا ہے لیکن ایک شبت کی ہزار نہیں دینے پڑتے اور ہر سال اس کو پالنے، دیکھنے بھالنے کی ذمہ داری کا تو قربانی کا جانور تو اللہ کا مہمان ہوتا ہے اگر عقیدت سے اس کی دیکھ بھال کی جائے تو میرا خیال ہے گراں نہیں گزرے گا۔“

”اور وہ جودل میں ایک خاص انیت پیدا ہو جاتی ہے اس جانور کے لیے تو کیا ہی اچھی بات ہے۔ اس طرح دل پہ جبر کرتے ہوئے اپنے ہی پالے ہوئے بکرے کو یوں قصائی کے ہاتھ میں دینا اس سے تو بہتر ہے کہ..... میں تو یہی کرتا ہوں عموماً عید سے ایک دن پہلے بلکہ رات کو بکرا خرید کے لاتا ہوں، چند گھنٹے گراؤنڈ میں بندھا رہتا ہے پھر صبح قربانی کا فرض ادا ہو جاتا ہے۔“

”فرض تو ادا ہو جاتا ہے لیکن دل قربانی کے مفہوم سے نا آشنا ہی رہتا ہے۔ ہمیں تو امی جان نے یہی بتایا ہے کہ اللہ کو تمہارے دھنوں، بکروں کی ضرورت نہیں۔ یہ فرض دراصل ہمیں اس واقعے کی یاد دلاتا ہے جس قربانی کی مثال تاریخ انسانی میں دوسری نہیں ملتی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کے حکم کی قبول کرتے ہوئے بنا کسی تامل کے اپنے نختہ جگر کو قربانی کے لیے پیش کر دیا اور عظیم قربانی تو اس اعلیٰ مقام پہنچنے کی بھی تھی جس نے باپ کو اللہ کے حضور سرخرو کرنے کے لیے ایک سوال حل نہ کیا اور خاموشی سے اپنا سر قلم کرنے کے لیے جھکا دیا۔ ہم کتناہ گار کہاں اس درجے تک پہنچ سکتے ہیں لیکن ہر بار ”راجہ“ کو اللہ کی راہ میں قربان کرتے ہوئے دل میں یہ قسملی تو ہوتی ہے کہ ہم صلہ بازار سے خریدی ایک چیز نہیں قربان کر رہے بلکہ اللہ کی خوشنودی کے لیے، اس کے عائد کیے ایک فرض کو نبھانے کے لیے اپنی ایک عزیز چیز پیش کر رہے ہیں۔ یہی تو قربانی کا جذبہ ہے۔

کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بیٹے سے محبت نہ تھی؟

کیا حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنی جان اور زندگی پیاری نہ تھی؟ یقیناً ایسا ہی تھا لیکن

اللہ کی محبت ہر محبت پر غالب آگئی اور قربانی کا اصل مفہوم یہی ہے کہ ایک عزیز شے کو دوسری عزیز تر ہستی پر قربان کر دیا جائے۔ چاہے اس کے لیے دل کشا ہی تر پے، کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو مگر اس عزیز تر ہستی کی خوشنودی کی خوشی اتنی بڑی ہو کہ چھوٹے موٹے دکھ پل میں فنا ہو جائیں جو اس قربانی کا حوصلہ نہیں پاتا۔ وہ کسی سے محبت کا دعویٰ بھی نہیں کر سکتا۔“

اس کے طویل بیان نے ابراہیم پر جیسے سکتہ طاری کر دیا۔ وہ عمر زدہ سا بیٹھا ایک ایک لفظ اپنے اندر اتارتا رہا۔ بات ایک معمولی سے جگے پھٹکے مسئلے سے شروع ہوئی تھی اور کتنی حقیقتیں اس پر آشکار کر گئی۔

”کیوں ابراہیم بھائی، بے تاس میری بہن، کبھی کبھی استانی۔ ایمان سے تنخواہ حلال کرنا کوئی اس سے سیکھے۔ ایک تنخواہ میں ذیل ڈیوٹی بھگتانی ہے۔ سکول کے بچوں کے ساتھ ساتھ گھر والوں اور گھر آئے بھائیوں پر بھی نیک پر سامان پر فرض ہے۔“

عاکف نے اسے مخاطب کرنا چاہا لیکن اس کا ذہن بری طرح الجھ چکا تھا۔ صدف کے کہے جیسے بار بار کانوں میں گونج رہے تھے۔

”ایک محبت ہے دوسری محبت غالب آ جائے تو۔۔۔۔۔“

”ایک عزیز ہستی کے لیے عزیز شے قربان کر دینا ہی محبت ہے۔“

”جو قربانی کا حوصلہ نہیں پاتا۔ اسے محبت کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔“

”کیا میں ہی ملاہوں آپ کو قربانی کے لیے؟“ ابو جان سے کیا گیا وہ احتجاج اسے بے ساختہ یاد آیا۔

”بہت خوب، پیچھتاوے آپ کے خواہش آپ کی اور کوئی پرانے احسانوں کا بوجھ بھی آپ پر اور سمجھتے چڑھا رہے ہیں آپ“ مجھے۔ مجھ سے اس قربانی کی امید مت رکھیے۔“

اپنے ہی کنبے گئے بے نرم الفاظ بچپن مارتے اس تک لوٹے۔ وہ سر جھکا کر رہ گیا۔

☆=====☆

وہ اگلوں تھا تو نہیں لیکن اگلوں کی طرح ہی چلا۔ اس میں اور بڑے بھیا اویس علی میں تقریباً گیارہ سال کا فرق تھا۔ اس کی بڑی امی یعنی معظم علی کی چیلی بیوی اویس علی کی پیدائش کے ساتھ ہی وفات پا گئیں۔ کئی سال معظم علی نے پایت اور اواسی سے الجھے گزار دیے۔

ان کی آپا نصرت آدراجن کی شادی طے تھی، ننھے اویس میں ہی گم ہو کر رہ گئیں۔ ایسے میں شادی کا تصور انہیں ہولا کے رکھ دیتا۔ اگر وہ شادی کر کے گاؤں چلی جاتیں تو بوڑھی ماں کیا خود کو سنبھالتی اور کیا ننھے سے بن ماں کے پوتے کو۔ مگر پھر بے لڑ بھگتوں کے انہوں نے

شادی رکوا دی۔ وہ شادی صرف بھائی کے دو بار گھر بس جانے تک ملتوی کرنا چاہتی تھیں لیکن ہوا یہ کہ رشتہ ہی ٹوٹ گیا۔ انہوں نے بھی ملال نہ کیا اور اللہ کی رضا جان کے سب کچھ اویس کو سمجھتے ہوئے ہی جی جان سے اس کی پرورش کرنا شروع کر دی۔

چند سال بعد جب معظم ذرا سنبھلے اور زندگی کی رعنائیاں انہیں بھر سے اپنی جانب کھینچنے لگیں اور اس کے ساتھ ساتھ بہن کی بے آبادی بھی دکھ دینے لگی تو وہ بارہ گھر بسانے کے لیے رضا مند ہو گئے ساتھ ہی شرط عائد کر دی کہ نصرت آرا کا نکاح بھی ان کے ساتھ ہی چڑھایا جائے۔

معظم علی اگرچہ پچیس کے ہو رہے تھے، وہ باج بھی تھے لیکن پھر بھی ایک اچھے گھرانے کی پڑھی لکھی خوبصورت لڑکی سعیدہ ان کی زندگی میں آگئی لیکن نصرت آرا کی بڑھتی عمر آڑے آ گئی۔ بڑی مشکل سے رشتہ ملا اور کرامت حسین کے ساتھ بات طے ہو گئی۔ دونوں بہن بھائی کے گھر بس گئے۔ قسمت کی بات کہ معظم علی کے لیے تو یہ دوسری شادی بے حد مبارک ثابت ہوئی۔ ان کا کاروبار ہلکا سا تھا جو بچہ بچہ ملا۔ اب ان کا شمار خوشحال گھرانوں میں ہونے لگا جبکہ کرامت حسین تو معمولی سا پرچون فروش تھا، اسی دکان تک محدود رہا۔

معظم علی نے گاہ بے گاہ بہن کی امداد کرنا چاہی لیکن بہن سے بڑھ کے بہنوئی خود وار تھا اور پھر وہ اپنی اس سادہ زندگی میں راضی برضا تھے، دونوں میاں بیوی کو نہ تو تنگ دیتی سے شکایت تھی نہ زیادہ کی تناسل اس لیے کبھی دکھڑے نہ روئے۔

رفتہ رفتہ معظم علی نے بھی بہن کے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ وہ اپنی زندگی میں گمن ہو گئے۔ سعیدہ اچھی فطرت کی خاتون تھیں۔ اویس کے ساتھ کبھی سو تیلی ماں کا فرق نہ رکھا لیکن وہ بونیک کی حدود میں داخل ہوتا بچہ وقت سے پہلے کچھ دار ہو گیا تھا اور رشتوں کی نزاکت سمجھنے لگا تھا۔ اس کے دل نے یہ رشتہ کچھ زیادہ خوشی سے قبول نہ کیا اور باہل میں رہنے کی ضد کی۔ مری کے بورڈنگ سے وہ لندن چڑھنے چلا گیا اور پھر وہیں سے اپنی شادی کی اطلاع بھی بھیج دی۔ ماں باپ سے تو اس کی دانستگی قائم ہو ہی نہ سکی۔ بچپن میں لوریاں سنانے اور چپکنے والی چوبھی ماماں کو بھی بیکس بھول گیا جبکہ معظم علی اویس کے لیے اپنی آگیا کی بڑی بیٹی ندرت کا خواب دیکھتے بیٹھے تھے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے سمبر کر لیا اور سعیدہ کی طرح اپنی توجہ ابراہیم پر مرکوز کر دی، جو پہلے ہی حدود توجہ ملنے سے خود سر اور خود پسند ہو چلا تھا۔

تعلیمی میدان کی حد تک ابراہیم شروع ہی سے ذہین و فطین رہا لیکن دنیا داری کے معاملے میں بس یونہی ساتھ رہا۔ پرنیکل لائف میں داخل ہونے کے بعد بھی اسے انسانوں کو

پر کھٹے، برسنے کا سلیقہ نہ آیا تھا اور شاید ابھی جاتا اگر وہ انسانوں سے اس طرح گھبرا کر اگک تھلک رہنے کا عادی نہ ہوتا۔ اس کی خود پسندی نے کبھی کوئی قریبی دوست بنانے نہ دیا، بھائی سے ویسے بھی عمو اور ذہن کا کئی برس کا فاصلہ تھا اور باقی رشتے بھی برائے نام ہی تھے۔ دو ماموں تھے ایک جرنی میں اور دوسرے کراچی میں۔ کراچی والے ماموں سے بھی بس اتنا ہی رابطہ واسطہ تھا جتنا کہ جرنی والے ماموں سے۔ یعنی عید کے عید کا رڈ اور سال میں ایک آدھ فون تک محدود۔

نانا، نانی تو خیر اس کی پیدائش سے پہلے ہی گزر چکے تھے دادا، دادی بھی ہوش کی عمر آنے تک وفات پا گئے۔ لے دے کے ایک پھوپھی اماں ہی تھیں۔ وہ اگرچہ پنڈی میں رہتی تھیں لیکن خاصا آنا جانا لگا رہتا۔ وہ تو سال میں ایک آدھ بار خصوصاً بچوں کی گرمیوں کی چھٹیوں میں ضروری چند دن سیکے یعنی بھائی کے گھر رہنے آتیں لیکن جیسے ہی بچے بڑے ہوئے اور پچو بھاجان کا بھی انتقال ہو گیا، یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

ابو جان البتہ کاروبار کے سلسلے میں پنڈی آتے جاتے رہتے تھے اور ہر باری امی جان بڑے اجہام سے موسم کے لحاظ سے بڑی تند کے لیے سوٹ اور بچوں کے لیے مختلف چیزیں تحفہ بھیجتی رہتیں۔ بچپن میں وہ بھی دو تین بار پنڈی ہو آتیں لیکن جب جاب کے سلسلے میں اسے مستقل پنڈی شفٹ ہونا پڑا تو نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بار بار پھوپھی اماں کے گھر آنا پڑا اور یوں یہ سلسلہ چل نکلا۔

اس کا رومان شروع ہی سے جزلزم کی طرف تھا۔ ابو جان نے اسے اپنے بزنس کی طرف راغب کرنے کی بڑی کوشش کی پھر تا کام ہو کے یہاں تک پیشکش کی کہ وہ اس کے لیے ذاتی اخبار یا ماہنامہ وغیرہ نکالنے پر تیار ہیں لیکن ابراہیم نے انکار کر دیا۔ وہ جانتا تھا کہ میگزین نکالنا آسان اور چلانا کتنا دشوار ہے۔ اس کے لیے تجربے اور اس سے بھی بڑھ کے نام جو وہ کسی مشہور اشاعتی ادارے سے منسلک ہو کے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ اس نے ابو جان کی آفر شکر سے اسے ساتھ یہ کہہ کر ٹوٹا دی کہ وہ کم از کم آٹھ دس سال بعد اس پر غور کرے گا۔

ملک کے سب سے کثیر الاشاعت روز نامے سے منسلک ہوتے ہی اس کی ٹرانسفر پنڈی برانچ میں ہو گئی۔ وہ جانے کی تیاری کر رہا تھا جب امی اور ابو نے اسے آپا فہرست کے ہاں مظہر نے کی تاکید کی لیکن اس کے سختی سے انکار کر دینے کے بعد دوبارہ اصرار نہ کیا وہ بھی اپنے تنہائی پسند آدمی کو مہینے کے مزاج سے واقف تھے لیکن اسے وقتاً فوقتاً پھوپھی کے ہاں جاتے رہنے کی نصیحت ضروری کی جو اس نے سر جھکا کر سن لی۔

بعد میں نہ جانے کس وجہ سے مگر ہر ہفتے تو وہ ضروری ہاں جاتا رہا۔ حالانکہ پہلے اس کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ بچپن کا کوئی ایسا خوشگوار واقعہ نہ تھا جس کی کشش اسے اس گھر تک کھینچتی۔ اسے یاد تھا کہ وہ جب بھی ایک آدھ روز کے لیے پنڈی آیا، اچھا خاصا بور ہوا کرتا تھا۔ عاکف اس سے خاصا چھوٹا تھا اور جھگڑا اور ضدی بھی جبکہ نہرت، صدف تقریباً اس کی ہم عمر ہی تھیں، نہرت ایک سال بڑی جبکہ صدف چھ سات ماہ چھوٹی لیکن لڑکیوں سے کھیلنے کا اسے کبھی شوق نہیں رہا تھا۔ اس لیے ایک کونے میں بیٹھا عمران سیریز پڑھتا رہتا۔ پھوپھی اماں کی گود میں ایک گوری سی، رونی چلائی تھیں کی بچی بھی دیکھی اسے صدف اور اکو کی ”ننی بہن“ ہی سمجھا۔ بعد میں بڑا ہونے کے بعد یہ پتا چلا کہ یہ بچی پھوپھی اماں کے جینھ کی بچی تھی۔

وہ دونوں میاں بیوی ایک بس کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے تھے، اور چونکہ جاتے جاتے وہ دونوں سرموسم کی وجہ سے تھیں بچی کو بچنے کے حوالے کر گئے تھے اس لیے انہوں نے اسے حکم الہی سمجھ کے خود پر فرض کر لیا اور تاحیات بچی کی ذمہ داری کا بیڑا اٹھالیا۔ کم ہی لوگ جانتے تھے کہ وہ ان کی سنگی بیٹی تھی وہ توجہ وہ چچی کہہ کر پکارتی پڑتا چلتا

سالوں بعد اسے دیکھنے پر بھی ابراہیم کو ایسا کہ جیسے وہ دیکھی کی ویسی ہی تھی۔ رونی بسورٹی، ناک سلیزٹی، دھڑ دھڑ چلتی، سر کھینچتی اور صدف کی جھجکیاں کھاسے مسکراتی۔ ہاں شکل و صورت خوب نکھر آئی تھی۔ رنگ گورا تو بچپن سے تھا۔ اب گلابی بھی ہو گیا۔ گول گپا سامہ اب بیٹھوی ہو چکا تھا اور پڑ گشت گالوں میں دھنسی رہنے والے آنکھیں اب بڑی بڑی سی نرمکی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ ناک البتہ ویسی کی ویسی موٹی پکڑا سی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو ابراہیم توجہ دیتا یہ توجہ ابو جان تھے جنہوں نے اس کی توجہ اس طرف دلائی اور وہ سنتے ہی بدک اٹھا۔ اسے ابو جان کا یہ فیصلہ سراسر نا انصافی لگنے لگا۔ وہ تو کچھ اور سوچے بیٹھا تھا۔ نیہ کا ذکر امی جان سے کرنے کا ارادہ تھا لیکن انہوں نے بات ہی ایسی کی کہ وہ جتنے سے اکھڑ گیا۔

”ابو جان! آپ جانتے بھی ہیں، کیا کہہ رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ آپ نے کیا سوچ کے یہ بات کی۔ آپ نے دیکھا اسے کیا ہے؟“

”میں نے آپ کی شگفتگی دیکھی ہے۔“ وہ آہستہ سے بولے۔ ”برے سے برے حالات میں اور کڑی سے کڑی آزمائش میں بھی میں نے ان کا حوصلہ ٹوٹنے نہ دیکھا تھا لیکن اب وہ جھٹکنے لگی ہیں، ہارنے لگی ہیں۔ ان کے لہجے سے جھٹکتی مایوسی مجھے بھرم سنا دیتی ہے۔ وہ ساری

زندگی صبر اور قناعت سے کام لیتی رہیں لیکن ندرت اپنے حالات سے سمجھوتا نہیں کر پارہی۔ آپا بھی کیا کرتیں۔ بھائی جان کے جیسے حالات تھے۔ ان میں اعجاز جیسا رشتہ ہی مل سکتا تھا لیکن غربت کے ساتھ ساتھ اس میں بذرائع اور مفت خوری جیسی عادتیں بھی ہیں۔ آپا داماد اور سہمیوں کے مطالبات پورے کرتے کرتے بلکان ہو رہی ہیں۔ عاکف ہے تو کام دھندے سے نہیں لگ رہا۔ ایسے میں بے چاری صدف ہی سارے گھر کا بوجھ سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ چار سال سے اپنے چچا کے گھر ٹانگی ہوئی ہے۔ باقاعدہ معاشی تو نہیں مگر بات طے ہے۔ آپا کی بیٹی ہے۔ اس لیے وہی وصف ہیں، وہی جذبہ ہیں۔ بھائی کے پیروں پر کھڑے ہونے سے پہلے شادی کرنے سے تیار نہیں۔ دو سال سے آپا دیو کو فال رہی ہیں۔ آخر صدف کی تنخواہ اور نیوشوں سے گھر کے خرچے چلتے ہیں۔ میں نے آپا سے بات کی ہے۔ عاکف کو لاہور لے جاؤں اپنے ساتھ کاروبار پہ لگاؤں۔ تم تو اپنی ملازمت میں مصروف ہو۔ انہیں صدف کا گھر جلد از جلد بسالنے کا مشورہ بھی دیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تاریخ خود کو ہرائے اور آپا کی طرح صدف بھی عمر کے سترہ سال قربانیوں میں گزار کر اچھے رشتے کی آس میں بیٹھی رہ جائے لیکن آپا کا کہنا ہے کہ وہ صدف کے ساتھ ساتھ موتی کو بھی گھر باریک دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ موتی کو اپنی ذمہ داری سمجھتی ہیں۔ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہونے کے لیے کسی اچھی جگہ سے بیٹھنا چاہتی ہیں۔ جلد بازی میں ندرت والی غلطی دہرا کے دنیا کو باتیں بنانے کا موقع نہیں دینا چاہتیں۔“

”وہ یہ چاہتی ہیں..... وہ یہ نہیں چاہتیں..... ان سب سے میرا تعلق بلکہ آپ کا بھی کیا تعلق؟“ وہ کہنا کیا یہ تفصیل سننے سے۔

”کیا تعلق؟ وہ میری بہن ہیں اور بہن بھی ایسی جن کی اس حالت کا بڑی حد تک میں بھی ذمہ دار ہوں۔ میرا فرض ہے کہ میں ان کے مشکل دور میں کام آؤں۔“ وہ دھک سے پتھر پتھر لہجے میں بولے تو وہ بھی ذرا نرم ہو گیا۔

”آپ کو اپنا سارے تلاش کرنے میں ان کی مدد کر سکتے ہیں۔“

”ندرت کی بارگشی میں نے بھی سوچا تھا۔ جب ادبوس نے چپ چپاتے شادی کر لی تو میں نے آپا کو بھی یہی کہہ کر دلاسا دیا اور انہوں نے بھی رشتہ کرتے ہوئے مجھ سے پوری چھان بین کروائی تھی لیکن ہوا کیا..... انجانے لوگوں سے دھوکا کھینچے۔ اب میں رسک نہیں لینا چاہتا کیونکہ موتی کے بارے میں آپا یوں بھی بہت حساس ہیں۔ ان کے خیال میں اپنی اولاد کے لیے وہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں جبکہ موتی کے بارے میں روزِ حشر انہیں اس کے

والدین کو جواب دینا پڑے گا۔ وہ بڑی آس سے مجھ سے.....“

”اوہو ابو جان! آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ذرا میرے نقطہ نظر سے بھی تو دیکھیں۔ وہ عمر میں مجھ سے بارہ تیرہ سال تو ضرور چھوٹی ہوگی۔ میٹرک دو قسطوں میں گھٹ گھٹ کر کرنے کے بعد اب کہیں فرسٹ ایئر میں چھپی ہے۔ عقل سے سلیقہ..... آپ بھی بس یونی احساسِ جرم کا شکار ہو رہے ہیں۔ پچھلی اماں کی قسمت میں جو کھتا تھا وہی ہوا، ندرت کے لیے بھی آپ نے بہتر ہی سوچا، آگے اس کی تقدیر۔“

”تقدیر کو سارے الزام دینا درست نہیں۔ کیا یہ جھوٹ ہے کہ آپا نے صرف ادبوس کی خاطر اپنی معاشی تروالی؟ اور کیا یہ بھی غلط ہے کہ اسی کو پالنے کی خاطر انہوں نے بال سفید کر لیے کیونکہ معاشی سی جذباتیت کے زیر اثر تھا۔ صرف اسی وجہ سے انہیں ڈھنگ کا رشتہ نہ مل سکا۔ میں خود ان کے سامنے تمام عجز سمجھتا رہا ہوں۔ خدا کا واسطہ ہے، مجھے اب تو سزا تھا کہ بڑی بہن کے آگے جانے دو۔ ندرت کے سلسلے میں جو ہو گیا سو ہو گیا۔ میں کوشش کروں گا اعجاز کو سمجھا بھجھا کر اسے پتے پہ لاؤں۔ ایک ہی بار اگر اسے کچھ امداد چاہیے تو مدد کروں۔ صدف بھی انہوں میں جائے گی۔ عاکف کو اپنے ساتھ کاروبار میں لگا لوں۔ جب موتی یہاں آجائے گی تو آپا بھی تیار ہو جائیں گی میرے ساتھ رہنے۔“

”آپ یہ سب کیجیے، بخوبی سمجھ لیکن میرا حصہ اس ساری پلاننگ سے الگ رکھیے۔ میں کسی پچھتاوے کا شکار ہوں نہ ہی کسی احساسِ جرم میں گھرا ہوا ہوں۔ مجھے اپنے لیے قربانی کا بکرا بنانے کی ضرورت نہیں۔ آپ میرے علاوہ کوئی اور طریقہ ڈھونڈ نکالیں اپنے ازلوں کے لیے۔“

وہ کسی طور نہ مانا، انکار کی ایک وجہ موتی کے لیے ناپسندیدگی تھی تو دوسری وجہ میرا کہے لیے پیدا ہوئی نئی نئی پسندیدگی تھی۔

نیرا سے اس کی ملاقات پنڈی شفت ہونے کے کچھ عرصے بعد ہوئی تھی۔ وہ رانیل کے کیمپن میں کسی فائل کو ڈھونڈتا تھا کہ وہاں گرے اور پنگ ساڑھی میں ایک باوقار سنی سنوری خاتون کو بے تکلفی سے براجمان دیکھ کر ٹھک گیا۔ اخلافا انہیں سلام کیا، رانیل نے مختصر سا تعارف کرایا۔

”ابراہیم! آپ آئی ہیں، ساڑھ آئی اور آئی! ایہ ابراہیم علی ہے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی لاہور رانچ سے یہاں شفت ہوا ہے۔“

ساڑھ آئی یہ جاننے کے بعد کہ وہ یہاں اکلیلا ہے۔ بڑی فکر مند ہوئیں ان کا تردد اور

اخلاق دیکھ کے وہ بہت متاثر ہوا۔ یوں بھی خاصا ہوم سک ہو رہا تھا، اسی لیے دوسرے تیسرے دن پچوبھی اماں کے گھر بھی چلا گیا کرتا حالانکہ وہاں کا ماحول اس کی تنہائی پسند فطرت پر گراں گزرتا۔ سوئی اور اکو کی جھینا جھینا، ٹو ٹوئیں میں، پچوبھی اماں کا اونچی آواز میں واویلا مچانے لگا، جتنے کے جوتی اکو کے دے مارنا، صدف کی ڈانٹ ڈپٹ اور اگر جوندت آئی ہوتی تو اس کے میاں اچاڑی کی جہالت بھری گفتگو، اس کے بچوں کی دھچکا مشتی اور موتی کا ننھے ننھے بچوں سے مقابلے پہ اتر کے لڑنا سب اسے زہر لگا کرتا لیکن انجانے شہر میں کبھی بکھار پوکھا کر وہ گھٹنے بھر کے لیے وہاں جانے پہ مجبور ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ تیسرے ہی دن ورائی پر اسٹور میں سارہ آئی تھی وہ بارہ اتفاقاً ملاقات کے بعد جب وہ انہیں ڈراپ کرنے چکا کہ گیا تو ان کے ایک ہی بار کہنے پر چائے پینے اندر بھی چلا گیا۔ اس نے ویسے بھی ایسی تک سب سے درست، دوستانہ انداز میں گپ شب لگانے والی جس کہ آئی پہلی بار دیکھی تھیں، انکل بھی بڑے زندہ دل تھے اور ان کی بیٹی نیرا، اسے دیکھ کے تو وہ حیران ہی رہ گیا۔ وہ حسین بھی تھی، طرح دار بھی اور غریبی بھی۔ ابراہیم نے دل ہی دل میں اعتراف کیا، اس حسن کے ساتھ یہ نخرہ، یہ ناز واد اور غرور اسے سچے سچے بھی خوب تھے۔ اپنے والدین کی بہ نسبت وہ ذرا روکے انداز میں اس سے ملی۔ سارہ آئی نہ وضاحت کی۔

”بے لیا ذرا شرمیلی ہے۔ اسٹرنجرز سے جلدی کھلتی ملی نہیں۔ تم محسوس نہ کرنا۔ آتے جاتے رہا کرو۔ تم سے مل کے مجھے بہت اچھا لگا۔ بلکہ تم اس سنڈے لچ میرے ساتھ کیوں نہیں کرتے؟“

وہ انکار نہ کر سکا۔ پھر اس لچ کے بعد جوابی دُند دینا بھی تو فرض تھا اس نے ہانی ڈے ان میں ان کی فٹلی کو ڈنڈا دیا۔ یوں اس تیسری ملاقات میں نیرا اس سے دوستی ہوئی گئی۔ وہ بیکانہ نہ دیکھ سادہ مزاج تھی۔ پہلے پہل اسے ہوتا مغرور سمجھا تھا۔ وہ بالکل ویسی نہ تھی۔ بلکہ جلد ہی خاصی بے تکلف ہو گئی۔ زندگی سے بھرپور اس لڑکی کی رعنائی اور دلکشی اتنی پُرکشش تھی کہ سارہ آئی کی طرف سے اسے پہلے انک گیسٹ بھمبرانے کی آفر وہ رد نہ کر سکا۔ وہ ان کے اوپر کے پورشن میں کیا شفقت ہوا کہ نیرا سے قربت دن بدن بڑھتی چلی گئی اور پسندیدگی محبت میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اس بار لاہور جا کر امی جان سے نیرا کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا کہ ان کا کچ کے لیے جانے کا ارادہ ہو گیا، ابو جان نے پچوبھی اماں کو بھی ساتھ جانے پہ رضامند کر لیا۔ وہ پنڈی آئے کے بعد اس کے پورشن میں بس چند گھنٹوں کے لیے ہی رکے تھے اور پھر اپنی آپا کے ہاں ہی چلے گئے وہیں یہ سارا منصوبہ بنا اور اس کے سارے ارادے

دوسرے کے دوسرے رہ گئے لیکن ابھی وہ اتنا بے دست و پا نہیں ہوا تھا کہ خاموشی سے ہتھیار ڈال دیتا اس نے ابو جان سے دو ٹوک الفاظ میں کہہ دیا۔

”پچھتاوے آپ کے، خواہشیں آپ کی اور ہیمنٹ چڑھا رہے ہیں آپ مجھے۔ مجھ سے اس قربانی کی امید مت رکھیے۔“

اور اب صدف نے انجانے میں اس کے الفاظ اسے لوٹا دیئے تھے۔ وہ اپنے ہی الفاظ کی رعبے رعبے اور بد صورتی کو کاچ کر رہا تھا اور اسے صدف کی بات بار بار اس کے ذہن پہ دیکھ دے رہی تھی۔

”جو قربانی کا حوصلہ نہیں رکھتے، وہ محبت کا جھوٹی نہیں کر سکتے اور ایک عزیز کو دوسری عزیز تر ہستی کے لیے فکر نہ کرنا ہی قربانی ہے۔“

وہ ساری رات سوچتا رہا، عزیز اور عزیز تر میں کیا فرق ہے۔

☆=====☆

ساری رات کی الجھنوں اور سوچوں کے زیر اثر وہ اتنا ڈسٹرب تھا کہ بار بار موبائل پہ نیرا کا نمبر دیکھ کر کپ آف کر دیتا تھا اس وقت وہ اس کے سوالوں کا جواب دینے کی ہمت خود میں نہ پا رہا تھا۔ تین چار بار ناکام ہونے کے بعد شاید نیرا تھک گئی تھی، مایوس ہو گئی تھی یا شاید ناراض ہو گئی تھی جو اس کا موبائل خاموش ہو گیا۔ اس کی ناراضی کے خدشے نے ابراہیم کو مزید مضطرب کر دیا۔ جانتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو کتنی جلد آتے تھے اور بس وہ اسی ایک بات سے ڈرتا تھا۔ اس کی ساری محاحات اس کے آنسو دیکھ کے دم توڑ دیتی تھی۔ دو آنسو بھری ٹھوکہ کنال آنکھیں اس طرح بار بار اس کے تصور میں آتی رہیں کہ شام ہوتے ہی اس نے گاڑی کا رخ سیٹلائٹ ٹاؤن کے بجائے چکلاک کی طرف موڑ دیا۔ قصداً وہ گھر سے ڈیوٹی ٹائم سے دو گھنٹے پہلے ہی نکل آیا تھا لیکن سارہ آئی سے یہ کن کرخت مایوسی ہوئی کہ وہ سو رہی ہے اور طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اس نے چگانے کو منع کیا ہے۔

”اس وقت؟“ یوں اس سانسو نے کا وقت ہے؟“

”رات بھر بخار کی وجہ سے جاگتی رہی۔ دن کو نہ جانے کس بات پہ ٹوڈ خراب کیے رکھا۔ ابھی میں نے زبردستی دوادے کر سلا یا ہے۔ تم کہتے ہو تو چکا دیتی ہوں۔ تمہارے آنے کا سن کر چکے جانے پہ ناراض تو نہیں ہو گی لیکن میں طبیعت زیادہ نہ خراب جائے۔ تم تو ابھی چلے جاؤ گے پھر یہ چاری کو پتا نہیں کب نیند آئے۔“

”نہیں رہنے دیجیے۔ میں کل پھر آ جاؤں گا۔“

”تم ابھی تک گتیں نہیں؟“ اس نے اٹھا سوال کیا۔

”آج سچڑے ہے۔“

وہ پہلے بھی کئی بار جتا چکی تھی کہ..... ہفتہ اور اتوار چھٹی ہوتی ہے، وہ بیچول گیا تھا۔ اپنی بات کہہ کر وہ پھر سے فرش پر رکے شاہزادہ دیکھنے لگی جن میں سے پہلے، سبزیوں اور دوسری چیزیں جھانک رہی تھیں۔

”میرے ایک کوئیک نے مجھ سے ریکوریٹ کی تھی کہ میں اسے کراچی پہنچا دالے جسد بازار تک ڈراپ کروں، ابتداً واجد بازار میں نے تو سمجھی لاہور میں بھی نہیں دیکھا، بے اختیار دل لچل گیا تازہ ہزری اور پھل خریدے نو۔ وہاں امی جان کے ساتھ میں ہی جایا کرتا تھا شادمان والے اتوار بازار۔ اس لیے امی خریداری کا خاصا تجربہ ہے۔ یہ سب خرید کے ڈک میں کل ہی رکھ لیا تھا، آج کھڑے ہوئے سوچا کہ کچھ گوشت، مرغی اور پھل بھی لے لوں۔“

اس نے اس سے نظریں جراتے ہوئے کہا۔ ابھی دو دن پہلے اس نے صدف کو تین ہزار پکڑانے چاہے تھے۔

”گھر کے اخراجات کے لیے۔“ وہ سادگی سے بتانے لگا۔

”امی سارا انتظام کر کے گئی ہیں۔“ وہ متانت سے بتانے لگی۔

”ہاں، لیکن ظاہر ہے میرے یہاں رہنے سے اخراجات تو بڑھے ہوں گے۔ یہ میری طرف سے رکھ لو، تمہیں دقت تو ہوتی ہوگی اضافی خرچے سے۔“

”ہمارے پاس مہمانوں کو بوجھنے کی روایت ہے نہ ہی ان سے خرچہ وصول کی۔“ وہ
 فیض میں آگئی۔ ”آپ براہِ کرم یہ بات اپنے پاس رکھیے ہم اسے تمہے گزر رہے بھی نہیں کہ چند دن
 کسی مہمان کی مہارت بھی نہ کر سکیں۔“
 ”تم غلط سمجھ رہی ہو میں تو.....“

لیکن وہ کچھ جسے بغیر سی واپس پلٹ گئی، ابراہیم نے بارہ ماہ کی، اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ صرف کو گھر کی بلوغت پر اسے کرنے میں خاصی مشکل پیش آ رہی ہے حالانکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ پریشانی اس کی مستقل ہو۔ اور ابراہیم کے آنے سے پہلے بھی وہ کوئی صحیح علاج کے گزرا کر رہی ہو یا خیر اس کی خود بخود کے بچوں کو میسر ہو دے کہ کتنا کامیابی ہو گی لیکن یہاں اس گھر میں رہتے ہوئے چشم پوشی اختیار کیے رکھنا اسے اچھا محسوس نہ ہو رہا تھا۔ آج اس نے یہ طریقہ لیا تھا، پہلے، واپس جیب میں رکھوائے جا سکتے ہیں، سامان کیسے بھجوائے گی اور یہی ہوا وہ

وہ منع کرتے ہوئے انھیں لگا تو سارہ آنٹی نے بڑی اپنائیت سے اس کا بازو تھام لیا۔

”تم دونوں سمجھ دار ہو، اپنا راز اچھا خود جانتے ہو اور میں نے تو اپنی بیٹی کو اتنا کونفیدنس بنایا ہے کہ اپنے بارے میں کوئی بھی فیصلہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے کر سکتا لیکن پھر مجھی ماں اور سب سے بڑھ کے دوست ہونے کے ناتے میں تم سے اتنا خردور کیوں کی تم دونوں کے درمیان جو بھی فیصلہ ہوتا ہے، اسے جلد از جلد دور کرنے کی کوشش کرو، مجھ سے اپنی بیٹی کی پڑمردگی اور مایوسی دیکھی نہیں جاتی۔ جب سے تم اپنے عزیزوں کے گھر رہنے لگے ہو، وہ بڑی ڈری ڈری سی رہنے لگی ہے اور اس کا یہ خوف، بجا بھی ہے۔ اگر تم کی طرح اپنے بیٹن کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہے تو تمہاری اپنی پرسنل لائف کا کیا ہوگا۔ تم تو ان سے اتنی سی بات تک نہ منہا سکتے کہ تم اس گندے سے محلے کے ذریعہ ناماں میں نہیں رہ سکتے تو اپنی پسند کے لیے ان کی ہدائے ہمارے کیسے کر دے۔ لی بی بی..... اپنے لیے کوئی بولڈ اسٹیپ لینے کی ہمت پیدا کرو۔“ انہوں نے زور سے کر کہا اور وہ ہرلا کے رہ گیا۔

گھر سے کھانا کھا کر بغیر نکل آیا تھا۔ بھوک اور سستی سے حالت خراب ہو رہی تھی۔ رات بھر ذہنی کے دوران بھی ذہن الجھن کا شکار رہا اور دن کو تیرا کے مسلسل کال کرنے اور پھر بعد میں اسے انکوار کرنے کی غمازت نے ہل بھر اکٹھا کر نکلے دی۔ چار پانچ رات چائے پی کر تو بھوک مر رہی تھی۔ شام کو بھی میرا کے ساتھ ذکر کرنے کے ارادے سے بھوکا بھی نکل آیا۔ وہ دو نڈلی اور آٹنی نے بھی جھوٹے منہ کچھ کھانے کو نہ پوچھا۔ اس نے ایک فاسٹ فوڈ کے سامنے گاڑی پارک کی۔ وہ نگر پیک کر رہا تھا۔ جب سڑک کے اس طرف ایک بوسٹک سے اس نے تیرا کو نکلے دیکھا۔ وہ سڑک دھبے کے اوپر بیرون ٹاپ پہنچے ہوئے تھی، وہی سرخی ہال چمک دار براؤن بال چرسے پہ پھیلے ہوئے تھے، سامنے سے داران کی لمبی بس گزری اور کچھ لمحوں کے لیے وہ اسے دیکھنے سے قاصر رہا، بس نکل گئی تو وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

”خدا ہی میری آنکھوں کو کھولا ہوا ہو۔ وہ تو ابھی چند منٹ پہلے گھر میں سو رہی تھی۔ ضرور اس سے ملتی جلتی کوئی دوسری ہوگی۔ سارا دن اسے حواسوں پر سوار کرنے کا نتیجہ ہے کہ اب ہر کسی پر اس کا گمان ہونے لگا ہے۔“ سر جھٹکتے ہوئے دو گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆=====☆=====☆

”یہ آپ کیا اٹھالائے؟“

آج صبح وہ معمول سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ پہنچا تھا لیکن خلاف توقع صدف گمریہ تھی

اور منہ سر لپیٹے گھر کے جالے جھاڑ رہی تھی۔

سرخ چہرہ لیے سنجیدگی سے اپنے کام میں مصروف رہی۔ کہا تو صرف اتنا۔

”میں تمام دودا سلف باقاعدگی سے لے آتی ہوں۔ کبھی گھر میں کسی چیز کی کمی نہیں ہوتی۔“

”میں جانتا ہوں اور یہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تم چاہے سے واپس آکر بازاروں کی خاک

چھاتی پھرو، ریزھیوں پہ بھاؤ تاؤ کرنی رہو۔ عاکف کو تو تم نے بالکل ہی آزاد چھوڑ دیا ہے۔

جب تک کوئی ذمہ داری اس پہ نہیں ڈالو گی۔ وہ کیسے احساس کرے گا۔ مجھے بالکل نہیں پسند

تمہارا یوں مارے مارے پھرنا۔ اس لیے بٹھے بھر کا سامان لے آیا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض

نہیں ہونا چاہیے۔“

اور وہ واقعی خاموشی سے سامان اٹھائے کچن میں لے گئی۔

”سیری جیکت کہاں ہے؟“ اس نے کچن میں بیٹھے کیو کھاتے عاکف سے پوچھا۔

”وہیں جہاں روز اس وقت ہوتی ہے۔“ اس نے منہ سے جج کے فائر کرتے ہوئے

جواب دیا۔

”دیکھ آیا ہوں، نہیں ملی۔“ روز صبح برآمدے میں موجود اسٹینڈ کے اوپر لٹکا تھا اور رات

کو جاتے ہوئے وہیں سے اتار کر پہن لیتا تھا۔ دن کے کئی گھنٹے تو سونے میں گزر جاتے،

جاگنے پر بیدار کے آگے بیٹھ کر کچھ دیر ٹی۔ وی دیکھتا رہتا نہ باہر نکلتا ہوتا نہ ہی جیکت کی

ضرورت پڑتی۔

”کہاں دیکھا؟“

”وہیں اس اسٹینڈ پہ۔“ ابراہیم نے اشارہ کیا۔

”وہاں تو صبح صبح اور شام کو ہوتی ہے۔ سارا دن جہاں ہوتی ہے وہیں ہوگی۔“

”کیا بھارت میں بھڑا ہے ہو۔ مجھے ذرا مارکٹ تک جانا ہے، باہر خاصی سردی ہے۔

کہاں گئی جیکت؟“ وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا اسی اثنا میں گیت کھلا اور چھلانگ مارنے کے انداز

میں مولیٰ اندر آئی۔ ابراہیم کی نظر اس پہ پک گئی۔ کانچ یو پیٹارم پہ وہ اس کی نئی اپنیورٹز لیدر

جیکت پہنے ہوئے تھی۔

”وہیں جہاں روز ہوتی ہے۔“

عاکف کا ہنسا پہ پوری طرح عیاں ہو گیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ پچھلے دو تین روز سے

اس پہ پائے جانے والے نئے داغ دھبوں کا سراغ بھی مل گیا۔ اس وقت بھی ایک ہاتھ

سے بھٹکھاتی اور دوسرے ہاتھ سے گالوں تک آتی مولیٰ سی لٹ کوکان کے پیچھے اُڑتی ہوئی

موتی کی جیکت گرد سے اٹی ہوئی تھی۔ بسنے کی بھاپات کو دانتوں سے اچھی طرح کریدنے

کے بعد اس نے خالی بھٹ ”راجہ“ کے آگے پھینکا اور چاٹ مسالے سے بھری انگلیاں

لاپرواہی سے جیکت کی سائینڈ سے رگڑ کر صاف کرتے ہوئے سلام چھڑا دیا جس کا جواب تو

خیر ابراہیم نے کیا دینا تھا، رانت کچکا پکارتے ہوئے اپنی جیکت پہ نظریں گاڑے کہنے لگا۔

”مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا ہے اگر زحمت نہ ہو تو کیا آپ یہ جیکت اتار دیں

گی۔“

جواباً وہ یوں منہ اٹھائے ہونٹوں کی طرح کھٹنے لگی جیسے اس نے اپنی جیکت نہیں بلکہ اس

کا سفید مٹیوں والا کالا پراندہ مانگ لیا ہو۔

”جیکت یہ دالی۔ ابراہیم بھائی کی۔ جو تم پہن گئی تھیں۔ بلکہ پہن جاتی ہو

روزی۔“

عاکف نے انگشت شہادت اس کی کپٹی پہ مار مار کے بات سمجھائی۔ وہ ہڑبڑاکے وہیں

بٹن کھولنے لگی عاکف برے برے سے منہ ہٹاتے ابراہیم کی طرف مڑا۔

”اس کے یہاں۔۔۔۔۔“ وہ دماغ پر اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔ ”یہاں زور لگانا پڑتا

ہے، باقاعدہ ٹنگیں دینی پڑتی ہیں پھر کہیں جا کے ایک روزن کھتا ہے اور بات اندر گھس پانی

ہے اور کبھی کبھی تو ایسا ہوتا ہے۔ جیسے میں بات انز بھی جائے تو عقل شریف ناک پہ انگلی دھر

کے پچھتی ہے“ اے بہن، تم کون؟“

وہ خراب موڈ کے باوجود ہنس پڑا اور جیسے ہی یہ احساس ہوا کہ اس دھب دھب کر کے

اندر جانے والی ”جھپٹی“ سی کی تو ابو جان نے اس کے مقدر بچھڑنے کے لیے منتخب کر لیا ہے

تو ہنسی وہیں دم توڑ گئی اور روز سا آ گیا۔

وہ اپنا کمپیوٹر اٹھا تو لایا تھا لیکن ٹیلی فون نکشن نہ ہونے کی وجہ سے انٹرنیٹ استعمال نہ

کر سکتا تھا۔ ابھی اسی ارادے سے وہ انٹرنیٹ کلب گیا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹہ وہاں لگانے کے بعد

جب جانے کے ارادے سے نکلا تو ساڑھے چار ہو رہے تھے۔ نیراتے سے ملنے کی روز ہو چکے

تھے، بے ساختہ آئی اس کی یاد نے خود بخود ہی گاڑی کارخانہ اس طرف کر دیا دے بھی گھر جانے

کا اس کا ارادہ نہ ہو رہا تھا۔ صبح سے ندرت اپنی گڑبا کے ساتھ آئی ہوئی تھی، بچی یا با جانا،

مسکسل بچے چلے جاری تھی اور سکول کے بعد اس کے دونوں سہیلوں نے بھی سسٹن ہلہ بولنا

تھا۔ آفٹ قسم کے ان تینوں بچوں سے دے دیے بھی وہ بڑا گھبراہٹا تھا اور سونے پہ سہاگن کے ابا

جان کا کچا زجاس قدر سے بڑا گھٹکھو کرتے کہ وہ عاجز آ جاتا تو کبھی انتہائی پکڑ نہ فرمائش کی

جانی کسج اخبار میں جو خبریں چھپنا ہیں، وہ بتائی جائیں تاکہ قرب و جوار میں اپنی سیاسی نو جھ

لُٹھ اور باختری کا رعب جھاڑا جائے اور کبھی فلاں اکیلے لیس کی چٹکا جیتی شہ سرخی لگانے پہ اصرار ہوتا جس نے انہیں آؤ گراف دینے سے انکار کیا تھا۔

☆ ===== ☆

”تم انتہائی کم ہمت انسان ہو۔“

پچھلے آدھ گھنٹے میں چوٹی بار تیرا نے کہا۔ ”اب اگر تم نے اپنے پیرنس کے تجویز کردہ رشتے پہ اپنی تاپندیدگی کا ظہر کر سی دی تھی تو گے ہاتھوں انہیں اپنی پسند کے بارے میں بھی بتا دیتا تھا۔“

”یہ اتنا آسان نہیں تھا تیرا! ایک تو ان کے لیے میرا انکاری غیر متوقع تھا۔ اوپر سے میں نے انکشافات کیسے کرتا۔“

”تم کہہ کہ تو دیکھتے پھر شاید انہیں تمہارا انکار اتنا بے موقع اور بلا وجہ معلوم نہ ہوتا۔ وہ یہاں آئے بھی تو تھے، تم میرا تعارف کراتے ہوئے اسی وقت ساری بات انہیں بتا دیتے تو شاید وہ جانے سے پہلے ہی بے مسئلہ حل کر جاتے۔ تم خود ہی تو بتا رہے ہو کہ وہ لڑکی ذرا بھی خاص نہیں۔ پھر مجھ میں بھلا کیا کی تھی کہ انہیں کوئی اعتراض ہوتا بلکہ وہ تو خوش خوشی تمہاری پسند کو اپنا لیتے۔“

تیرا کی خوش فہمیوں پہ ابراہیم بے بسی سے چٹشانی مصل کے رہ گیا اب اسے کیا بتاتا کہ ابھی تو اس نے ہوا تک ہونا لگتے تھی کہ وہ کسی کو پسند بھی کرنے لگا ہے، اس کے باوجود تیرا اور سازندہ آئنی سے متعارف ہونے کے بعد امی اور اوودوں کے تاثرات کو کچھ خوشگوار نہ تھے۔ امی نے تو صاف صاف کہہ دیا تھا۔

”بڑی مکاری عورت لگ رہی ہے تمہاری آئنی۔ عجیب سی حرکتیں ہیں بلکہ پورا گھرا نہ ہی عجیب سا ہے۔ اکلوتا بیٹا گھر داماد ہے کسی سیمٹھا، بڑی بیٹی دادا کی عمر کے بندے سے بیاہی ہے جبکہ چھوٹی والی کچھ زیادہ ہی چھوٹی بن کے دکھارہی ہے۔ شوہر ہے تو وہ بھی زن مرید سا۔“ وہ امی کے اس بے لاگ تبصرے پہ جڑ بڑ ہو کے رہ گیا۔ انہوں نے ساری عمر ایک مخصوص ماحول میں گزاری تھی۔ اب انہیں اگلے اور آئنی کے زریں اصول و قواعد سے کیا روشناس کراتا بقول ان کے۔

”ہم نے اولاد کو اپری پوری مکمل آزادی دی ہوئی ہے۔ اولاد کو اپنی پراپرٹی جان کے اپنی مرضی پہ چلانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ یہ بیار نہیں بلکہ بلیک میلنگ ہوتی ہے۔ احتشام میرا اکلوتا بیٹا، دل تو نہیں چاہتا تھا ایک بلیک کو کبھی نظروں سے اوجھل رہے لیکن وہ من سے بھی تو

بے تحاشا سمجھ کر تھا اور کمن کے پیرس کو اکلوتی بیٹی کے لیے ایسا شوہر چاہیے تھا جو ان کا گھر داماد بن کے رہے ہم نے خود غرضی سے کام نہ لیا اور خوش دلی سے اسے وہاں رہنے کی اجازت دے دی۔ میرا اپنی دوست افروز کے ساتھ ایسا یا رخاں کو پسند کرنے لگی جو عمر میں اس کے والد کے برابر ہیں۔ عشق اندھا ہوتا ہے ہمارے سمجھانے بجھانے پہ بھی وہ نہ مانی پھر ہم نے محسوس کیا کہ خان صاحب خاصے مخلص انسان ہیں اور عروس کے فرق کے باوجود دونوں میں اندازہ اشتیاد تک غضب کی ہے۔ زمانہ کیا کہے گا اور جنگ بھائی وغیرہ کے خوف کو پرے جھٹکتے ہوئے ہم نے وہی فیصلہ کیا جس میں میرا کی خوشی تھی۔“

اسے سازندہ آئنی کی وہ گنگو یاد آئی، جو پہلی بار ان کے گھر آنے پہ تھی لیکن وہ اسے امی جان کے سامنے دہرائے سے باز رہا انہوں نے تو ایسی روشن خیالی پر چار حرف بھیجے تھے۔ ”کیا سوچنے لگے؟“ تیرا نے امی کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرائے۔

”ہوں..... کچھ نہیں۔“

”دیکھ رہی ہوں۔ تم کچھ زیادہ ہی کھوئے کھوئے رہنے لگے ہو۔“

وہ اس کی قیاس آرائی کو جھٹلا نہ سکا۔ آج کل کو ایسی ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کچھ روز قبل تک وہ کتنا کمن تھا۔ روٹین کتنی تسلی بخش تھی۔ عرصے تک امی اور ابو کے سخت حفاظتی اقدامات والے لاڈ پیار میں رہنے کے بعد یہ نئی فنی آزادی اسے ہواؤں میں اڑانے لگی، وہاں تو اگر کسی کلاس فیلو لڑکا کا فون بھی بھولے سے لے جاتا تو باقاعدہ تعیش شروع ہو جاتی حالانکہ کوئی بچہ کمن میں پڑھنے کے باوجود اس کی کسی بھی لڑکی سے اس قسم کی دوستی نہیں تھی۔ یہ تو بس تیرا ہی تھی جو اپنی فطری بے ساختگی اور اپنائیت کی وجہ سے اتنی جلدی اس کے قریب آگئی تھی کہ وہ تو پہلی نظر میں ہی اس کے کمن سے گھاس گھو گیا تھا لیکن اگر تیرا پیش قدمی نہ کرتی تو وہ وہی دل ہی دل میں اس کمن کو سراہتے ہوئے دوستی کی حسرت سہینے رہ جاتا جیسا کہ اس سے پہلے بھی وہ بارہو چکا تھا لیکن اس بار ایسا نہ ہوا اور وہ اپنے دل کو زیادہ دیر تک سینے میں مقید نہ رکھ سکا۔ کتنے خوش گوار شب و روز تھے۔ گھر میں نہ ہوتے ہوئے بھی گھر جیسا سکون و آرام لیکن گھر والی روک ٹوک مفقود تھی۔

صبح صبح جب وہ لوٹتا تو تیرا کالج کو بیٹھام میں تیار بس اس کی منتظر ہوتی۔ اس کا تردد تازہ چہرہ دیکھتے ہی ابراہیم کی ساری کوفت ہوا ہو جاتی۔ اور پھر آئنی کا اصرار کر کے بڑے مختلف ناشے کروانا۔ ایک لمبی سی نیند سے فارغ ہوتے ہی پھر پور شام اس کا انتظار کر رہی ہوتی، وہ ہوتا اور تیرا۔ اسلام آباد، راولپنڈی اور آس پاس کا کوئی مقام انہوں نے نہ چھوڑا تھا۔ لا لگ

ڈرائیو، میوزک کنسرٹ، شاپنگ مال، فائو اسٹار میں ہونے۔۔۔۔۔

کیا مزے تھے اور امی ابو نے جیسے آکر ایک خواب سے جگا دیا تھا۔ نیرا بھی زندگی سے بھرپور لڑکی کے ساتھ نے اس کے اندر ایسی ہی بھرپور زندگی جینے کے خواب چکا دیئے تھے جبکہ موتی۔۔۔ ابو نے موتی کا نام اس کے ساتھ لے کر اسے خوف زدہ کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی مرضی کے بغیر وہ کبھی بھی اس کے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔۔۔ وہ کوئی بے زبان مشرقی و شیرازہ نہیں جس کا ہاتھ چپ چاپ کسی دوسرے کے ہاتھ میں تھما دیا جائے گا۔ وہ احتجاج کر سکتا تھا اور کر رہا تھا لیکن ایک بے چینی تھی۔۔۔ ایک اضطراب تھا جس نے اس کی ذات کا احاطہ کر رکھا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس مسلسل بے چینی کی وجہ سے وہ ابوجان کے جانے کے بعد بھی نیرا کے ساتھ اور قربت میں وہ شرمسار محسوس نہیں کر رہا۔

”کیا کچھ نہیں، کچھ تو ہے جو بار بار تمہارا دھیان بٹ جاتا ہے۔“ نیرا نے پھر تفتیش کرنا چاہی۔ اس نے ہیشکل یہ کہہ کر ٹالا۔

”بس بار! کچھ آپ سہت ہوں۔“

”وہ تو ہو گئے ہی۔ اتنا ان کی ضروری تھا ان ننھے منوں کی خبر گیری کرنا تو وہ آ جاتے یہاں تمہاری سرپرستی میں۔“ جہیں بے آرام کرنا بہت ضروری تھا۔ ”وہ تنگ کے بولی۔

”صاف چاب کرتی ہے۔ اس کا سکول یہاں سے بہت دور پڑتا اور شام کو محلے کے کتے ہی بچے اس سے ٹیوٹ بھی پڑھتے ہیں۔ ان کا خرچ بھی ہوتا۔“

”کون صاف؟ وہ والی؟“ نیرا نے شکوک سا ہو کے پوچھا تو باوجود نمیشن کے ابراہیم کو اس کی فکر مندی پہ پئی آ گئی۔

”نہیں! وہ تو ایک دم فضول سی لڑکی ہے، فرسٹ ایئر فوول۔ وہ کہاں اور بیچنگ کہاں۔ اسے تو بچوں سے رسلنگ کرنے سے فرصت نہیں، پڑھائے گی کیا خاک، صاف پھوپھی جان کی بیٹی ہے اور ہاں۔۔۔ کیچڈ بھی ہے۔“

اس نے فوراً ہی تادیاب کہیں وہ شک کا دائرہ وسیع کرتے ہوئے اس بے ضرری لڑکی کو بھی نہ ٹھٹھٹ لے۔

”اوما کی گاڈ! کیا خاک آرام کر پاتے ہو گے تم۔ بھانت بھانت کے بیچے اور وہ بھی سرکاری سکولوں میں پڑھنے والے تمہارے سر پہ پاتے ہوئے چھ کا پہاڑا رتے ہو گے۔ کتنا عجیب سا ماحول ہو گا وہاں کا۔۔۔ نہ جانے تم کیسے ایڈرسٹ کرتے ہو گے۔ مجھے تو سوچ

سوچ کر پریشانی ہوتی ہے۔ بہت تکلیف ہوتی ہوگی ناں وہاں رہنے میں۔“

اس نے ابراہیم کے شانے پہ ہمدردی سے ہاتھ رکھتے ہوئے لہجے میں زمانے بھر کی درد مندی سموتے ہوئے پوچھا تو وہ چاہتے ہوئے بھی رو نہ کر سکا کیونکہ اس کی بات جھٹائے جانے کا رد عمل خاصا خوفناک ہوتا تھا۔ اس لیے مصطفیٰ چپ ہی رہا ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ یہ ساری اجنبیت اور تکلیف بس پہلے ایک دودن کی بات تھی اور وہ بھی صرف اس کے اپنے گریز اور طبیعت کے تنکداری کی وجہ سے روز صدف اور ان کو نے اسے ہر ممکن آرام پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

”میں تو کہتی ہوں، اب باقی کے دن تم انہیں خود ہی اپنی دیکھ بھال کر لینے دو۔ آخر تمہارا اپنا آرام بھی تو ضروری ہے۔ تم یہیں چلے آؤ، تمہارے فادر پوچھیں گے تو کہہ دینا کہ تمہاری صحت اور کام دونوں پر اثر پڑ رہا ہے۔ آخر انہیں تمہاری بھی تو فکر ہونی چاہیے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔ نیرا! میں ٹھیک ہوں۔ ڈونٹ ڈی۔“

”وری کیسے نہ کروں اور میں نہ کروں تو اور کون ہے جو تمہارے لیے کچھ سوچے۔ تمہاری اتنی نفرت چاب ہے۔ تمہیں بالکل ریلیکس رہنا چاہیے۔ اتنی نمیشن تمہارے کام پہ اثر ڈالے گی۔ تم تارے تھے کہ تمہاری پردوشن ہونے والی ہے۔ اس کا کیا بنایا؟“

ابراہیم نے موضوع بدل جانے پہ اللہ کا شکر ادا کیا اور بتانے لگا کہ چیف ایڈیٹر اس کے کام اور صلاحیتوں سے کس حد تک مطمئن ہیں اور شام کا روزنامہ اس کی زیر ادارت نکالنے کے چلان پر کام ہو رہا ہے۔

”لفظا تنگ۔۔۔ یہ ہوئی ناں اچیومنٹ۔ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ تم بہت آگے جاؤ گے۔ بہت سی روشنیاں۔۔۔ بہت بڑا نام۔ اور بہت سا پیرواؤ۔۔۔ بس اب پہلے تو تم اس ڈیپاسی کا رے نجات حاصل کرو۔ یہ تمہارے اسٹینڈرڈ سے بچے نہیں کرتی۔ تم تو مر سیڈیز کم از کم بھڑا سوک میں چڑھ گئے۔“

”ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ اسے سچ کر سوک یا کارڈ لے لوں۔“

”بیچنا کیوں ہے۔ ایسا کرو، یہ بھی رکھ لو۔ کم از کم مجھے صبح اور دو پہر بس پہ کالج آنا جانا نہیں پڑے گا۔“

اس نے کمال بے تکلفی سے کہا تو ابراہیم کچھ کہہ نہ سکا اور ساتھ ہی اسے کچھ دن پہلے کا واقعہ یاد آ گیا۔ وہ نیرا سے پوچھتے پوچھتے گیا کہ کیونکہ اسے خود یقین نہ تھا، اس دن شاپنگ سینٹر سے دھیر سارے شاپنگ بیگز اٹھائے ایک نوجوان کے ساتھ باہر نکلی وہ نیرا ہی تھی کیونکہ

دس بارہ منٹ پہلے آئی تھی اس کے سونے کی اطلاع دی تھی۔ ظاہر ہے وہ اس کی نظر کا دھوکا ہی تھا یا بھر حد سے زیادہ مشابہت..... اس کا ذکر کرنا تو گویا نیرا کی ناراضی مول لینا تھا۔ تو وہ بھڑک جاتی ہے سنتے ہی کہ اس نے اس کی ماسکے بیان کو سمجھوتہ کہا۔

”اور تم تو بھی نہیں سمجھ سکتے جب وہ حکم کھلا تمہارے ابو جان کے خلاف تمہیں بھڑکاتی ہے۔“

اندر سے کسی نے بڑی ناراضی آواز میں جتا کر کہا تو وہ چونک پڑا۔

”ہاں..... ہاں یہی ہے وہ..... یہی بات ہے جو مجھے اتنے دنوں سے بے چین کیے جا رہی ہے۔ نہ جانے کون اندر میری بات پر تپلا کے جواب دیئے جاتا ہے۔“ وہ مضطرب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے ابھی سے چل دیئے، میں نے تو پایا اور ماسے کہہ بھی دیا کہ ہم ذکر کرنے جا رہے ہیں اور یہ بھی کہ وہ کچھ نہ پکائیں میں وہاں ہی پان کے لیے پیک کرواؤں گی۔“

”نیرا! پلیز ڈونٹ مائنڈ، میری طبیعت ٹھیک نہیں، میں باہر سے کچھ کھانا نہیں چاہتا، پھر کسی دن.....“

”اونو، پچھل کیمپکس میں اتنا شاندار فوڈ فیسلٹل لگا ہے۔ آج لاسٹ نائٹ سے پھر ایسا کرو، مجھے بھی یہ ٹاؤن ڈراپ کر دو۔ میں اپنی فرینڈ کے ساتھ ہی چلی جاؤں۔ تین دن سے وہ مجھے ساتھ چلے گا کہہ رہی ہے مگر میں تمہارے ساتھ جا چاہ رہی تھی۔ اس لیے نا لے گئی۔ چلو اب کم از کم ان ہی کے ساتھ چلی جاؤں۔ تمہیں تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے اتنے دنوں بعد آئے ہو اور وہ اتنے آف موڈ کے ساتھ۔“

وہ جلدی جلدی بالوں میں برش چلانے لگی، سائینڈ پڑا گرین اور بلیک پاؤچ اٹھا کے اندر جھانکنے لگی تو ابراہیم سمجھ گیا، اب اسے ڈراپ کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس نے تنقیدی نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ گرین جینز پہ بلیک اور سلور سیلیبس ٹاپ تھی۔ اگرچہ ہیئر والے بنڈ روم سے باہر نکلنے سے پہلے اس نے بلیک کوٹ پہن لیا تھا لیکن ٹاپ کا حد سے زیادہ کھلا گر بیان اور ٹانگوں پہ پھنسی ہوئی جینز سبز پوشی کے لیے نا کافی لگ رہی تھی۔ وہ ٹوکنا چاہتا تھا کہ نیرا کے اگلے مطالبے پہ بری طرح چونک گیا۔

”مجھے تو تھا ڈر دے دو۔“

”واٹ؟“

”تو تھا ڈر..... اولی تو..... تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے میں نے نہ جانے کیا کچھ مانگ

لیا ہو۔ ظاہر ہے، اتنے فوڈ فیسلٹیوں میں جاری ہوں۔ میری پاکٹ منی تو تم جانتے ہی ہو، کیا ہے۔ مابے چاری خود پایا کے گھر بیٹھے رہنے سے پریشان رہتی ہیں۔ ان سے کیا مانگوں؟“

ابراہیم نے چپ چاپ ہزار ہزار کے دونٹ نکال کے اسے تھا تو دیئے مگر سارے راستے کوئی بات بھی جو بھٹکتی رہی، اندر سے بار بار کوئی کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا لیکن وہ جتنی سے اس آواز کا گلا گھونٹ دیتا۔ جو بھی تھا، وہ نیرا کے متعلق کوئی ایسی وہی بات دل میں لاتا تک نہ چاہتا تھا لیکن کچھ تھا۔ کچھ تو جو کھک رہا تھا۔ شاید پندی کے سب سے پوش ایریا میں موجود ان کے خوبصورت سے بچکے کا ہونا۔ اور اس بچکے میں رہنے والی فیملی کے سر پرست کا ہر وقت ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھے رہنا۔ کسی معقول آمدنی کا ذریعہ نظر نہ آنے کے باوجود ان سب کے شاہانہ رہن رہن کے انداز۔ یا پھر نیرا کو ماں باپ سے ملنے والی حد و وجہ آزادی اور چھوٹ۔

پہلے پھل اسے یہ آزادی بڑی بھائی تھی۔ بغیر کسی کھٹکے کے وہ ہر رات گئے تک اسے لے کر اسلام آباد کی خوبصورت سڑکوں پہ پھرا تھا، اونچے سے اونچے ریسٹوران میں کافی پی تھی، پی سی کے بولنے لان میں ڈر کیے تھے لیکن جب سے اس نے نیرا کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا تھا اسے یہ سب وقت بے وقت کھٹکے لگا تھا۔ نیرا کی بے تکلفی اسے کبھی بری نہ لگی تھی لیکن سائرہ آئی کی بلا تردد اس سے کچھ بھی مانگ لینا اسے کھٹا تھا۔ وہ باہر جا رہا ہوتا اور انکل آواز میں لگاتے۔

”فلاں سی ڈی فلاں گمریٹ.....“ یا پھر آئی نکلنے ہوئے سپر شور سے لانے والی گرومری کی لسٹ تھا۔ دیتیں۔ کبھی کبھی بل بھی جمع کرنے کو دے دیتیں۔ صرف بل..... اسے یہ سب پہلے برا محسوس نہ ہوتا تھا۔ وہ اسے اس فیملی کی امانیت پہ محمول کرتا رہا لیکن جب سے وہ چھو بھئی جان کے گھر گیا تھا، جو حقیقت اس کے اپنے تھے۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ امانیت کا اظہار رکھ رکھاؤ کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے بغیر اپنے وقار کو محسوس لگنے۔

☆=====☆=====☆

”ہائے..... ہائے چچی..... میں مر گئی..... اف۔“

آج اتوار کا دن تھا عمو ماہ ساڑھے آٹھ بجے سوتا تو ذرا دیر بجے تک ہی جا سکتا لیکن اتوار کو نیشن پڑھنے والے بیچے دن کو کبیرہ بجے بھی آجاتے اور ان کی آوازوں سے اس کا دیر تک سوئے رہنا دشوار تھا حالانکہ صدف کافی کنٹرول رکھتی تھی بچوں پر لیکن پھر بھی اتنے

اسٹریٹ لائسنس کی روشنی میں بیچنے کے پڑھنے کے بعد نامور سرجن بن کر ابھرتا یا پھر صحیح اخبار سچ کر اور شام کو نوٹیفکیشن گنٹل کے قریب موپے کے گھر سے سچ سچ کر بھی پائے کا وکیل بن جاتا، لیکن ایسا بھی نہ تھا کہ میں پڑھ ہی نہیں سکتا تھا، موقع ملتا، حالات اجازت دیتے تو شاید کچھ بن ہی جاتا، میں جانتا ہوں، ٹاٹ کے سکولوں سے بھی کتنے کتنے نامور سائنس دان، صحافی اور ادیب نکلے ہیں لیکن بھائی وہ اور زمانہ تھا اب ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ آج کے انجینئر، ڈاکٹر، ہائی کوالیفائیڈ ہوتے ہیں اور وہ بھی فارن سے۔ میرے ابا جی مجھے پہلی دیواروں والے سکول میں ہی پڑھا سکتے تھے۔ میں واجبی سا طالب علم تھا، رزل کل کے (بمشکل) پاس ہی ہوتا رہا۔ صدف آپی تو خاصی لائق فائق ہیں، میٹرک میں فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لی لیکن کیا فائدہ میڈیکل میں پڑھانے کے وسائل تو تھے نہیں، بی۔ ایس۔ سی بھی انہوں نے نیوشن پڑھا پڑھا کر کیا۔ میں تو یہ بھی نہ کر سکا، میٹرک میں اسٹنٹ نمبری نہ آئے کہ جنرل سائنس یا کامرس میں بھی تکلیفیں لیتا، آؤس میں ہسٹری اور سوسائٹس جیسے مضامین کے ساتھ بی گریڈ بی۔ اے کرنے کے بعد میرے لیے ایلا ملازمت چلتی ہے۔ لڑکیاں پھر اچھی رہتی ہیں۔ بی گریڈ بلکسی گریڈ میں بھی بی اے اور ایف اے کرنے کے بعد گلی اور محلوں میں کھلے جھونے ڈال سکول انہیں کھا ہی لیتے ہیں۔“

”خیر کما لیتی ہوں گی وہ ان سکولوں سے۔ ہزار۔۔۔ بارہ سو؟ پھر کتنی ایک ہیں جو اپنی فیملی کی کفالت کرتی ہیں؟ زیادہ تو عوقبہ یا پھر ٹائم پاس کے لیے نیچنگ کرتی ہیں۔ مردوں کا ایک اپنا کردار ہوتا ہے سوسائٹی کے سیٹ آپ میٹ۔ انہیں اپنی پالاک ایسی کرنی چاہیے کہ ایک واضح راہ نظر آتی ہو جنہیں پتا تھا کہ تم اس گھر کے واحد نقل ہو، جنہیں ابتداء سے۔۔۔“

”مگر کیسے؟۔۔۔ کبھی تو سوال ہے کہ کیسے؟“ وہ بات کاٹ کے چلا ہوا تھا۔ ”مجھے نیوشن کی ضرورت تھی، ابا! اکیڈمیوں کی فیسیں نہیں بھر سکتے تھے۔ کالج میں ریفرنس بس چاہیے ہوتی تھیں، وہ میں سینڈ پینڈ جی نہیں خرید سکتا تھا۔ کیسے میں لا کالج یا انجینئرنگ یا یونیورسٹی تک پہنچتا؟ اور اب اس فضولی ڈگری کے ساتھ کوئی مجھے کلرک کی جاب بھی نہیں دیتا، اس کے لیے بھی لوگ تجربہ مانگتے ہیں۔ بتائیے، وہ کہاں سے لاؤں، کس بینک میں ڈاکر ڈالوں اور تجربہ آؤ لاؤں؟“

”پھر بھی جنہیں کچھ نہ کچھ تو کرتا ہے۔ ایسا تک تک پلے گا۔ بھو بھی اماں تہا رہی وجہ

سے کتنی پریشان رہتی ہیں، برا مت، ماننا، میں تمہارے ذاتی معاملے میں دخل دے رہا ہوں لیکن ایسا کرنے کو مجھے ابو جان نے یعنی تمہارے ماموں نے کہا تھا، وہ خود جنہیں کہنے کا حق

چھوٹے سے گھر میں کتنی خاموشی رہ سکتی تھی۔ اس کی نیند تو یوں بھی کچی تھی۔ رشک اسے مونی پاتا جو واقعی چھٹی کا دن منایا کرتی۔ بارہ بجے سے پہلے کبھی اس کی صبح نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت بھی ابراہیم تانے کے بعد کرنا گھر جانے کی چٹکیاں لیتا ہوا صحن میں بیٹھا عاکف سے گپ شپ کر رہا تھا کہ مونی کی ہانے والے نے دلا کر دیا، پہلے تو وہ یہی سمجھا کہ شاید صدف سے پڑھنے کے لیے آئے بچوں میں سے کسی کے ساتھ معرکہ ہوا ہے لیکن اگر ایسا ہوتا تو آواز مونی کے بجائے ان میں سے کسی ایک کی آتی کہ ہمیشہ زیادتی مونی کی طرف سے ہی ہوتی تھی۔

”کیا ہوا؟“ صدف بھی بولکلا کے اندر بھاگی۔ ابھی کچھ لمحے پہلے تو وہ کسل میں بکل مار کے لیٹے مونی کو بلا بلا کر ڈگانے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد کمرے سے نکلی تھی۔ ابراہیم بھی چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ کے اندر دیکھنے لگا۔ عاکف البتہ بوے اطمینان سے اخبار کے پیچھے گمن ہو گیا۔

”ہائے میرا سر۔۔۔ ہائے میرا بچہ۔“

”کیا ہوا؟“ سر پہ لگی یا پھر یہ اور یہ تم گریں کیسے؟“

”آئی! دیکھ نہیں رہی ہیں میرا بندھا ہوا بچہ۔۔۔ اٹھ کے ابھی وہی قدم چلی تھی کہ دھڑام سے گر گئی۔ نہ جانے کس نے دوپٹے سے میرا بچہ باندھ کے دوپٹے کا دوسرا کونٹ پٹنگ کے سر سے باندھ دیا۔ جیر بھی مڑ گیا اور یہی سر بھی اٹھنے سے زور سے سامنے کرسی پہ لگا۔“

اس کے رونے چلانے سے ابراہیم نے سامنے بیٹھے عاکف کے چہرے سے اخبار ہٹایا۔ وہ مسکرائے چلا رہا تھا، راز رکھنے پہ کلکھلا کے ہنس پڑا۔ ابراہیم نے جلدی سے ہونٹ بھیج کر بے ساختہ وارد ہوئی مسکراہٹ پہ قابو پایا اور اسے تسلیی نظروں سے گھورنے کی کوشش کی لیکن اندر ہونے والے سین کے تصوراتی مزے نے ایسی گدگدی کی کہ نظروں سے بھی گدگداہٹ اٹھنے لگی جاری تھی، ایسے لے عاکف نے ذرا برابر پروا نہ لی بلکہ اسے اور اکسایا۔

”جسنے والی بات ہے بھائی! نہیں ناں۔۔۔“

اور وہ بھی اکو کے قہقہہ میں شریک ہو گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی وہ عاکف کو اس کی غیر ذمہ داری اور لاپرواہی نوٹے ہوئے اپنے پُر مغز نیچر سے مستفید کر رہا تھا۔ کئی دن کے بعد آج ایسا موقع ہاتھ لگا تھا، سوائس نے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا سوچا۔ عاکف کے موقف کا بھی پتا چلا۔

”ابراہیم بھائی! میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں کوئی بہت ذہین و فطین یا کتابی کیزا تو تھا جنہیں کہ

رکتے ہیں مگر ان کے خیال میں تم میرے سامنے زیادہ ایزی ہو کے بات کر سکو گے، اب کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا کرنا چاہتے ہو؟

”میں نے کیا کہنا ہے بھائی! اور کیا کرنا ہے۔ ہر سوا ل پر امانتے کا تو ایسا میں کیوں کروں گا۔ آپ میرے بڑے بھائی ہیں۔ باز پرس کا پورا حق رکھتے ہیں مجھے تو اچھا لگا آپ کا اتنی اپنائیت سے یہ بات کرنا لیکن کیا کروں آپ کی ساری باتیں درست لیکن میرے سامنے کوئی راستہ بھی تو نہیں۔ اباجی کوئی لبا چوڑا کارو بار تو چھوڑ نہیں گئے تھے جو میں وہ آگے بڑھا لوں، ایک معمولی سی کریانے کی دکان تھی جو ان کے بعد انی نے کرائے پر چڑھا دی۔ اب میں کم از کم وہاں بیٹھ کے ساری عمر تیل اور مسالے تو نہیں بیچ سکتا مجھے معمولی کام کرنے سے انکار نہیں مگر ترقی کا کوئی چانس بھی تو ہو۔ اباجی میرے منے سے پہلے تو اس دکان سے نہ نکل سکے تھے۔ دوسرا کوئی کاروبار شروع کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ کہاں سے لاؤں سرمایہ۔“

ابراہیم کو اس کے سوال پر ابو جان کی وہ بات یاد آئی کہ وہ عاکف کو اپنے کاروبار کی ذمہ داریاں سونپنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ بظاہر اسے بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ اگر وہ برنس مائنڈ نہیں ہے اور اپنی فیملی میں اس کی ترقی کے روشن امکانات اسے نظر آ رہے ہیں تو اسے کیا حق ہے ابو کے محنت سے بنائے برنس انشس کو ملیا میٹ کرنے کا۔ برسوں بعد انہوں نے یہ مقام حاصل کیا ہے۔ اگر عاکف جیسا گھر کا بندہ ان کا بازو دین جائے تو ان کی ماوی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور بہن کے کام آئے ان کی خود ساختہ پٹیمانی بھی مٹ جائے گی ابھی وہ عاکف کو اس طرف لانے کے لیے بات کرنے کی تمہید باندھ ہی ہے والا تھا کہ موتی بیچ بیچ ٹپک پڑی۔ ماحول کی ساری سنجیدگی قہقہوں میں اڑ گئی۔ موتی لنگڑاتی ہوئی پل میں ان کے سامنے موجود تھی۔ عاکف کے بندو باگ قہقہہ اسے سمجھا گئے تھے، یہ حرکت کس کی تھی۔ اب وہ تقریباً اس پہ پل پڑی تھی۔

”تم..... ذلیل انسان..... کیسے..... پتا نہیں کیوں میرے پیچھے پڑے رہتے ہو، اگر میری ٹانگ ٹوٹ جاتی؟ اگر میری آنکھ چھوٹ جاتی؟“

”تو رسی کئی کبھی پوری ہو جاتی..... چار چاند لگ جاتے تمہاری بے مثال شخصیت میں۔“ وہ دھیسوں کی طرح ہنستا رہا۔

”آنے دو چچی کہو تمہاری ٹانگیں ترواتی ہوں۔“ اس نے ”تڑی“ لٹائی۔

”توڑنے تروانے کے علاوہ کوئی کام آتا ہے تمہیں۔ کبھی کبھ جوڑنے کی، کبھ ملانے کی باتیں بھی کر لیا کرو۔“

وہ بڑبڑایا تو موتی ڈھیلے ڈھیلے قدم اٹھاتی خاموشی سے پلٹ گئی۔ ابراہیم نے اس کی پسپائی کو شہت سے محسوس کرتے ہوئے سامنے دیکھا تو عاکف بھی ہارا ہوا سا لگ رہا تھا، اسے متوجہ دیکھ کر خواہ مخواہ دانت نکالنے لگا۔

”عجب قماش ہے یہ بھی۔ پل میں تو لہلہ میں ماشہ۔“

”کیوں اتنا ستاتے ہوے جاری کو؟“ اس نے کریدنا چاہا۔

”کیونکہ اس سے زیادہ میں ستای نہیں سکتا۔“ فوراً جواب ملا۔

”ستاسکتے ہو..... اگر اس سے تمہاری شادی کروادی جائے۔“

یہ جملہ اتنا اچانک تھا کہ عاکف اپنے تاثرات پر قابو نہ نہ پاسکا حالانکہ اس فن میں اسے کمال حاصل تھا اور اس کمال کے مظاہرے ابراہیم کی ہی بار دیکھ چکا تھا۔ اس کی حیرت بھری خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

”بچپن کی بھیتیں بڑی زوردار اور شدت پسند ہوتی ہیں..... یہ تم ہی نے کہا تھا۔“

”وہ تو میں نے اپنی اور راجی کی محبت کے بارے میں کہا تھا۔“ وہ صاف مکر گیا۔

”جو اس مت کرو، میں سب جانتا ہوں۔ ایک طرف اپنائیت اور دوستی کے دعوے کرتے ہو، دوسری جانب خود کو سینت سینت کے رکھتے ہو۔“

”پھر کیا کروں، عیاں کرنے کو اور ہے ہی کیا۔ یہ نامکمل، ناکام وجود۔“

”عجب انسان ہو تم۔ یہ ناکامیاں کوئی تم مقدر میں لکھوا کے نہیں لائے اور وہ کون سا کوئی کہیں کی شہزادی ہے یا رئیس زادی گھر کی ہی بات ہے، اچھا ہے گھر میں مٹ جائے۔“

”آپ نہیں جانتے، امی نے اس کے بارے میں کیسے کیسے خواب دیکھ رکھے ہیں۔ وہ اس سے محبت کرتی ہیں ناں اور..... اور میں بھی.....“

اس نے سر جھکا کے اعتراف کیا۔

”ہم سب اسے چاہتے ہیں، اسے سنبھال کے رکھتے ہیں امی کیسے میری یہ خواہش مان لیں گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ ساری عمر لاڈ پیار سے پالا اور اپنے نکلے لڑکے کے چلے باندھ دیا۔ انہوں نے ماموں جان سے بات کی ہے کہ وہاں لاہور میں اگر کوئی رشتہ ہو تو بتائیں اور انہوں نے امی سے وعدہ بھی کیا ہے وہ بہت خوش ہیں کہ موتی کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہنستا ہنستا دیکھ سکیں گی۔ میں اپنی خواہش کا اظہار کر کے کیسے انہیں امتحان میں ڈالوں۔ ساری عمر انہوں نے پلڑا برابر رکھا ہے، کہیں میری محبت حاوی ہو کے ان سے بے ایمانی نہ کروالے۔ میں انہیں اللہ کے سامنے شرمندہ نہیں کرانا چاہتا۔“

ابراہیم ششدر بیٹھا، اس بے پرواہ سے نظر آنے والے ناتجربہ کار لڑکے کی باتیں سنتا رہا۔ یہ فلسفہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

”لیکن اگر تم چاہو تو بہت کر کے... میرا مطلب ہے حالات سدا ایک سے نہیں رہتے۔ ہو سکتا ہے اللہ نے تمہارے حصے کی خوشیاں اس کے مقدر سے باندھ رکھی ہوں۔“

”ہاں ہو سکتا ہے... مکمل مایوس تو میں بھی نہیں۔ اللہ کے در سے امید تو ہے لیکن اس امید کے سہارے کسی معصوم کی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ امی جان ندرت کا دکھ دیکھ رہی ہیں، صدف کا معاملہ بھی سالوں سے لٹکا ہوا ہے۔ ایسے میں اگر موتی..... اور وہ کتنی قیمتی ہے۔ وہ سے اگر کچھ غلط ہوا تو وہ مجھے تو بھلے معاف کر دیں۔ خود کو کبھی نہ کر سکیں گی۔ میں تو اللہ سے یہی دعا کرتا ہوں کہ جو اس کے اور میرے حق میں بہتر ہو سکی کرے۔ ہو سکتا ہے، جلد ہی ماموں جان کی وساطت سے کوئی بہترین شخص اس کا مقدر بن جائے۔ یقین کریں مجھے بھی اتنی ہی خوشی ہوگی جتنی کہ امی جان کو۔“

وہ تم ٹیکس تیزی سے چمپکن ابراہیم کو بڑا اور انچا نچا سالگا۔

”اور اگر قسمت کی طرف سے ہی دیر ہوگئی اور اس کی شادی ہونے سے پہلے پہلے میں اپنے بیروں پہ کھڑا ہو گیا تو میں کبھ جاؤں گا۔ اللہ نے اسے میرے لیے منتخب کر رکھا ہے لیکن اس سے پہلے نہیں..... ہرگز نہیں..... رنہ ہر محرومی پہ ہر کسک پہ یہ بھربانہ احساس بچو کے لگائے گا کہ شاید وہ اس سے بہتر کی مستحق تھی اور میں نے جلد بازی میں مداخلت کر دی۔“

ابراہیم اتنا متاثر ہوا کہ اس سے ابو جان اور ان کے برٹس والا ذکر کرنا بھی بھول گیا۔ صدف کی آواز نے بھی توجہ نہ پائی۔

”کو! رضیہ خالہ۔ پھیل سے گھر آگئی ہوں گی؟“

”چائیں، لیکن یہ اخیال ہے آئی۔ دن کی۔ کل جب میں انہیں دیکھنے ہا پھل گیا تو ذکر ہو رہا تھا کہ آج صبح ڈیڑھ بجار ہو جائیں گی۔“

”اچھا۔ میں انہیں دیکھ کے آئی ہوں۔ امی ہوئیں تو اب تک کئی چکر لگا لیے ہوتے۔“

اس نے بڑا سادہ پنہا اچھی طرح لپیٹنے کے بعد نوکری اٹھائی جس میں کیڑا اور سبب سلیقے سے لگے ہوئے تھے۔

”کیس دور جاتا ہے؟“ ابراہیم نے اس کے گرد متوجہ سی لیے دوپٹے کو دیکھ کے یونی پوجھا۔ سکول جاتے ہوئے وہ اس دوپٹے سے بڑی چادر اوڑھا کر کٹی تھی اور اس سے بھی پچھلے سر پہ ایک سیاہ اسکارف باندھ لیا کرتی تھی جس سے اس کے سر کے بال تک چھپ جایا

کرتے۔ یہ اہتمام غالباً اس لیے ہوتا تھا کہ بس اور وگین پہ اترتے چڑھتے ہوئے چادر سرک جانے سے وہ بے پردہ نہ ہو۔

”نہیں..... یہ برابر والے گھربک جاتا ہے۔ خال کا گردے کا آپریشن ہوا ہے۔“

وہ چلی گئی اور ابراہیم کو کچھ دیر پہلے خالک کا صدف کے بارے میں کہا گیا جملہ یاد آیا۔

”تم کیا کہہ رہے تھے صدف کے متعلق کہ اس کا معاملہ سالوں سے لٹکا ہوا ہے۔

پھو بھی اماں نے تو ابو جان کو کبھی بتا رکھا ہے کہ وہ اپنے بچنے سے منسوب ہے۔“

”نہیں جی۔ نہ جانے امی جان کس آس یہ اب تک“ تھی“ کو بے کہنے پہ بھند ہیں۔

شیراز کینیڈا گیا تھا اور جاتے ہی اس کی شادی کی خبر بھی آگئی، چچا جان نے شرمندگی مٹانے کو اس وقت تو کہہ دی کہ شیراز کی سہیلی وہی ہے، صدف میرے ہی گھر جائے گی۔ امی جان نے آسو پونچھ لیے اور یہی وہ چاہتے تھے کہ بات آگے نہ بڑھے اور خاندان بھران کے خلاف نہ ہو جائے۔ وہ دن اور آج کا دن، پلٹ کے انہوں نے یہ ذکر نہیں چھیڑا۔ امی جان منتظر ہیں اور اپنے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے خود یہ ذکر پھینچ بھی نہیں سکتیں کہ لوگ کیا کہیں گے۔ لڑکی اتنی بھاری ہے جو خود آگے بڑھ کے پیش کر رہے ہیں۔ صدف نے بھی اس سلسلے میں امی پہ مدد نافذ کر رکھی ہے۔“

”ایسا کہ اب تک بچلے گا؟ پھو بھی اماں کو موتی کی فکر کرنے کے بجائے صدف کے لیے پیش رفت کرنی چاہیے۔ تمہارے چچا سے آس رکھنا فضول ہے، انہوں نے کچھ کرنا ہوتا تو کر چکے ہوتے۔“

ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی آیا کہ آخر پھو بھی اماں نے اپنے بھائی کی توجہ موتی کی طرف کرنے کے بجائے صدف کی طرف کیوں نہ دلائی، ابو جان تو ہی جان سے راضی ہو جاتے۔

”صدف آپنی نے ہی منع کر رکھا ہے۔ وہ چاہتی ہیں۔ موتی کی شادی تک سب میں یہ بات پھیلی رہے کہ وہ منسوب ہیں، تاکہ آنے والے ہر اچھے پروپوزل کے بارے میں موتی کے حوالے سے سوچا جائے۔ اس کے علاوہ گھریلو حالات بھی انہیں پاندھے ہوئے ہیں۔ میں کڑھتا رہتا ہوں یہ سوچ سوچ کر کہ اگر میں کسی قابل ہوتا تو میری بہن ساری خردوں سے آزاد آج اپنے گھربان بن جاتی۔“

وہ روٹا ہوا گیا تو ابراہیم نے نہ لاسا دینے کے لیے اس کے شانوں پہ پازد دراز کیا۔

”تم آج ابھی، اس وقت سمجھ رہے ہو کہ دارک مظارہ کرنے کا وعدہ کرو۔ میں تمہیں اپنی پشیمانوں سے کھینچنے لگے گا وعدہ کرتا ہوں۔“

”کیسے؟“

تھا۔ شاید اس کے اندر یہ یقین بھرا خوف پہلے سے موجود تھا کہ نیرا بے شک اتنی حسین ہے، اتنی پرکشش ہے کہ کوئی بھی مرد اس کی قربت چاہے گا، اسے اپنا نا چاہے گا لیکن اس میں ایسی کوئی خوبی نہیں کہ کوئی مرد اسے فخر سے اپنی ماں کے سامنے لے جائے کھڑا کر سکے۔ اسے اپنے والدین کی مخالفت پہلے ہی سے نظر آ رہی تھی۔

”تو تمہیں پہلے نظر نہیں آیا تھا کہ وہ لڑکی تمہارے فعلی سیٹ آپ سے بالکل بھی بچ نہیں کرتی۔“ اندر پھر سے سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔

”عشق بھی بھلا دیکھ بھال کے کیا جاتا ہے۔“ اس نے۔ ربڑی سے سوچا۔

”اوہو..... عشق؟“ پہلے یہ فیصلہ تو لو کہ یہ عشق ہے یا کچھ اور..... ایک خوبصورت ماڈرن سی لڑکی کسی پہ مال بہ کرم ہو اور وہ کی کترا جائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا اور جوانی میں کس کے قدم نہیں ڈگمگاتے، رنگینیاں کے نہیں بھاتیں۔ تمہیں بھی اپنی شامیں برف لطف لگنے لگیں، ایک قاتل ادا حید کو ساتھ لے بھرنے میں تمہیں بھی مزہ آنے لگا اور پھر اپنے میں اگر نہ رک نوک ہو نہ بکڑے جانے اور سر زین کا خوف ہو تو معاملات یونہی تیزی سے آگے بڑھتے ہیں چونکہ فلرٹ بازی اور دھوکہ دہی تمہاری عادت ہے نہ ہی ایسا کوئی تجربہ ہے۔ اس لیے تم نے بھی اگلا قدم شادی کا سوچا۔ یہ ایک سیدھی سادی سی سائنٹیفک سی اسٹوری ہے۔ تم اسے خواہ مخواہ رومانی رنگ دینے پہ نکلے ہوئے ہو۔ اگر ایسا ہی طوفانی عشق اور غما میں مارتی محبت ہے تو فخر سے سر اٹھا کے باپ کے سامنے اس کا نام کیوں نہیں لے لینے۔ آخر موتی کے لیے بھی تو تم نے فوراً انکار کر دیا تھا ناں..... اس لیے کہ تم خود کو اس میں حق بجانب سمجھتے تھے اس لیے بات کرنے سے بچکے تھے اور نہ جھجکے پھر آخر خیرا کے بارے میں آگاہ کرنے سے پہلے تمہارے قدم کیوں لڑکھڑا جاتے۔ اس لیے کہ تمہارے اندر کا وہی روائی شاہنشاہ شریف سا مذہب خود ہی اسے بطور بیوی تسلیم کرنے سے کترا رہا ہے۔“

”واٹ ریش..... کیا برائی ہے اس میں؟“ اس نے اپنے ہی خیالات کو رد کیا۔ ”اچھی بھلی لڑکی ہے بس ذرا اس کے اور ہمارے گھرانے کے لائف اسٹائل میں فرق ہے۔“

”ذرا؟“ وہ جھینپا لیکن پھر بھی آئینہ دیکھنے سے کترا تا رہا۔ باور کی گریز اسے کئی روز تک دکھلا د جانے سے روکتا رہا۔ نیرا کے سوالات اور بھی زنج رک ڈالتے تھے، اس کے پاس بھی تو آج کل بس یہی ایک موضوع رہ گیا تھا اور یہی ایک سوال۔

”آخر تم اپنے پیرنس سے کب بات کرو گے؟“

لیکن کل نوں یہ وہ کچھ اتنے اکڑے انداز میں بولی کہ ابراہیم کو اندازہ ہو گیا۔ اب کے

”بس کچھ دو اور کچھ لو..... کچھ مدد تم میری کرو۔ کچھ میں تمہارے کام آتا ہوں۔ تم جانتے ہو، یہ بزنس وغیرہ میرے بس کا روگ نہیں۔ میں کیریئر ایسٹابلیشمنٹ (تحلیقی ذہن کا آدمی) ہوں۔ اس فیلڈ سے وابستہ ہونے کے بعد مجھے حقیقی معنوں میں طرانت نصیب ہوئی ہے لیکن ابو جان چاہتے ہیں کہ وہاں بھی بھائی کے جانے کے بعد میں ان کا بزنس سنبھالوں، وہ اب اتنے بوجھ سے جھٹنے لگے ہیں۔ بات ان کی بھی ٹھیک ہے..... سالوں کی محنت کے بعد انہیں بھی سہارا چاہیے لیکن غلط میں بھی نہیں جو کام میرے بس کا ہے نہ نہیں، اس میں ہاتھ ڈال کے کیوں جتنے جمائے بزنس کا اور خود اپنا بھی پیرا غرق کر لوں۔“ آخر تم اس مسئلے کا حل کیوں نہیں بن جاتے۔ ابو جان کہہ، غبر یہ مجھ و سر کرنے کو تیار نہیں اس لیے یہ ذمہ داری مجھے سونپنا چاہتے ہیں لیکن تم تو ان کے اپنے ہو۔ تم ایسا کر کے نہ صرف ان کی مشکل آسان کرو گے بلکہ مجھ پہ بھی ایک بڑا احسان کرو گے میں ذرا کیسٹی۔“ اسے اپنا کام کر سکوں گا۔ پھر کیا خیال ہے؟“

”میں..... میں بھائی..... مگر کیسے؟ وہ ماموں جان..... وہ بہ بھئی کے عالم میں تھا۔“

”اے وہ تو شکر ادا کریں گے، تم ہائی تو بھرو۔“ اور..... نہ ہائی کیا بھرنی تھی، اٹھ کے ابراہیم کو بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ اس ایک محبت بھرے مظاہرے پہ بڑ بڑا گیا۔ سینے کے اندر تک انہری عجیب سی ٹھنڈی ٹھنڈی روٹی پڑ سکون کرنے لگا تھا۔

☆=====☆

اسے نیرا سے ملنے کی روز ہو چکے تھے، اس گریز کی وجہ، اب چون اور جھجکا ہٹ تھی جس نے ابراہیم کے دل و دماغ میں ڈیرے ڈال رکھے تھے، فطرتاً وہ ابالی تھا اور عادتاً ذرا زور دکھا مابھی لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ نیرا کی چند روز کی رفاقت اسے، سراسر اپنی بدل ڈالتی۔ اس میں ابھی اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ ابو جان کے فیصلے کو رد کرنے کے بعد مطمئن پھر تار بتا۔ جب سے وہ گئے تھے۔ ایک بے چینی اور غلش اس کے لیے چھوڑ دی۔ یہ..... وہ اکثر سوچتا۔

”کیا اپنی پسند سے شادی کرنا یا کسی تاپہ نہ یہ ہستی سے شادی..... نے سے انکار کرنا اتنا بڑا جرم ہے جس کی پاداش میں میرا خیر مجھے کچھ کے لگا تار بتا ہے۔“

جواب ہمیشگی میں آتا۔

”پھر کیا ہے..... کیا ہے جو میں خود اپنے آپ سے منہ چھپائے پھر..... کیوں نہیں ان کے آگے نیرا کا نام لے پاتا۔“

اور سبکوں آگے وہ بار بار جاتا نہ جانے کیوں نیرا کا نام ان کے سامنے لینے سے وہ بچکاتا

”عظیم قربانی تو اس بیٹے کی تھی جس نے باپ سے ایک سوال تک نہ کیا اور خاموشی سے سر جھکا کر خود کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ جو قربانی کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ انہیں محبت کا دعوٰی کرنے کا حق نہیں.....“

وہ چونکا، اندھیرے میں جیسے کسی جگنو نے چمک کے راستہ دکھایا تھا، وہی جگنو سے چند الفاظ پھر دئے۔

”ایک عزیز شے کو دوسری عزیز ہستی پر قربان کرنا ہی اصل محبت ہے۔“

عزیز تر بیٹے اور کون عزیز..... عزیز تر وہ ہستیاں تھیں جن کے اتنے دور ہونے کے باوجود وہ جن کی دعاؤں کے سامنے خود یہ ہر لمحہ محسوس کرتا تھا، جن کا دل دکھا دینے کی کمک اسے دن

رات بے چین کیے دے رہی تھی اور نہ اسے عزیز تر تو کیا وہ تو شاید عزیز بھی نہ تھی محض ایک دل بھانے والا خال جو اس کے اندر کھجوعے بغیر سرسری سا گزر گیا۔

”نیر! یہ نہیں ہو سکتا، کبھی نہیں۔“

اس کے الفاظ میں اتنی سختی تھی کہ خود نیر خاموش رہ گئی، اس کے سارے دلائل جو اس

نے اسے قائل کرنے کے لیے رٹ رکھے تھے، دم سادھ گئے۔ دہرخ موڑ کے کھڑی ہو گئی تو پہلا بار ابراہیم کے دل کو کچھ کچھ ہوا۔ گزرے کی خوشگوار ایل انی ماس لہانے لگے، اس نے

☆=====☆=====☆

نہ جانے کیا وجہ تھی، نیراکو صاف صاف جواب دے دینے کے باوجود وہ مطمئن نہ ہو پا رہا تھا۔

والدین کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتا لیکن اپنے دل کو تسلی نہ دے پا رہا تھا کہ ابو جان کے

عاکف والا مسئلہ تو سمجھ لیا تھا، اب شاید موتی کے سلسلے میں پونپھی اماں کو ادھر

وہ بہن کا یہ بوجھ بھی بامثنا چاہیں گے اور اس میں اب نیزہ کو مزید ناراض کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔

مطمئن کرنے کے لیے ابو جان کو یہ ذہنی و جذباتی صدمہ دینا گوارا نہ کیا تھا کہ وہ ان کی اعلیٰ

حرکت سے پہلے ہی نوٹے نوٹے سے تھے، بالکل ہی ڈھے جاتے۔

لیکن صدف..... کم از کم اس کے آگے تو میرا کی اہمیت زیادہ تھی۔ جو بھی تھا، وہ اس لڑکی کے دل میں یہ خیال لانے کا باعث بنا۔ ”آخر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔“ اس نے پورے دو تھو سے سوچا۔ ”اب اگر اس کا انداز ہی بولڈ ہے تو ظاہر ہے وہ محبت بھی اپنے ہی انداز میں کرے گی، صرف اتنی ہی بات پر اسے مستر ذکر تادست نہیں۔“ اس کا دل پھر ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ وہ گھبرا گیا۔

”آف آخر میں کوئی فیصلہ کر کیوں نہیں لیتا۔“

اس نے گھبرا کے راجیل کے کہیں کا رخ کیا۔ پنڈی پوسٹنگ کے بعد اس کی راجیل سے اچھی خاصی چھٹنے لگی تھی جس میں کافی عرصے سے رخسار آ گیا تھا۔ وہ خوش مزاج، یار بارش سا بندہ تھا، اس کی معرفت وہ پہلی بار ساڑھ آئی سے ملتا تھا اور ان ہی کے مشورے سے اس نے خود میں اور راجیل میں ڈرافٹ رکھنا شروع کر دیا تھا لاکھ اس پابندی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی لیکن جب وہ نیا ساڑھ آئی کے اثر میں آیا ہو، تو اور ان کی ہر بات آنکھ بند کر کے مان لیا کرتا تھا۔ اس کے خیال میں آئی کے گریز کی وجہ کوئی خاندانی تنازعہ ہوگا اور اس نے ان کی ناپسندیدگی کا لحاظ کرتے ہوئے خود بخود راجیل سے کم ربط رکھنا شروع کر دیا لیکن اس کو گو کیفیت میں اسے شدت سے کسی سہارے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

انگلی تھام کے چلنا سکھانے والا باب بھی ہزاروں میل دور تھا اور وہ انیس پڑھ پڑھ پھوٹنے والی مہربان ماں بھی..... جس سے دل کا رشتہ جوڑنا چاہا وہ خود انہیں بڑھانے باعث بن رہی تھی۔ ایسے میں اسے اپنی زندگی میں کسی بڑے غلط دوست..... ہمیشہ سے بڑے کے محسوس ہوئی۔ وہ بے اختیار راجیل کی طرف بڑھ گیا لیکن کافی دیر تک اجڑا حیرت یا تیر کرنے کے باوجود وہ اس سے ساڑھ آئی کا ذکر نہ چھیڑ سکا وہ تو صحیح طرح سے یہ بھی نہ جانتا تو کہ راجیل کا ان سے رشتہ کیا ہے۔ اتفاقاً اس نے خود ہی اپنے چھوٹے بھائی کی مفتی کا ذکر شروع کر دیا۔

”ہمارے ہاں خاندان میں ہی رشتے کرنے کا رواج ہے۔ میری شاد۔ اپنے چچا کی بٹی سے ہوئی اور اب سبیل کی مفتی چھو چھو کے ہاں کر رہے ہیں۔ تم ضرور آنا۔“ کہیں آتے جاتے ہی نہیں ہو۔“

”تمہاری چھو چھو..... شاید میں ان سے ملا ہوں۔ ایک بار تمہارے کہیں مل، ملاقات ہوئی تھی۔ ہاں یاد آیا ساڑھ..... شاید یہ ساڑھ آئی کہہ کے تعارف کر لیا تھا تم نے۔“ اس نے

سرسری کر سکتے ہوئے اگھانا چاہا۔

”کون؟“ وہ ساڑھ آئی۔ تو یہ کرو۔ اور وہ میری چھو چھو..... وہ اچھل کے بیٹھ گیا اور کانوں کو ہاتھ لگاتے لگا۔ ابراہیم تخت منسوب ہوا۔

”تم خود ہی تو انہیں آئی کہہ رہے تھے، آخر کس رشتے سے وہ تمہاری آئی لگتی ہیں؟“

”ارے گھما، تجھے اسے دیکھ کے بھی اندازہ نہیں ہوا کیا؟ وہ خالہ، چچی، ممانی اور چھو بھی ٹائپ آئی نہیں بلکہ..... وہ والہ آئی ہے..... آیا کچھ سمجھ میں؟“

”وہ والہ!“ وہ کچھ سمجھنے سمجھنے کے انداز میں بڑبڑا کر رہ گیا۔

”ہاں یار!“ وہ والہ آئی جو ہر سراسر خوبی بصورت لڑکیوں کی آئی ہونے کی وجہ سے خود بخود سب کی آئی بلکہ آئی جان بن جاتی ہے۔“

”واٹ؟“ اسے ہزار واٹ کا کرنت لگا۔ یہ تیغ حقیقت تو اس کے گمان سے بھی باہر تھی۔ نیرا کا معصوم و دلکش چہرہ پھر سے تصویر میرا آگے سے بھانکے لگا اور دل راجیل کی باتوں پر ایمان لانے سے انکاری ہو گیا۔

”تم تو ایسے اچھل رہے ہو، جیسے پہلی بار ایسی بات سنی ہو۔ ارے اس پروفیشن میں آنے کے بعد تو ایسے ایسے تماشے دیکھنے کو ملے ہیں کہ گویا پوری سوسائٹی مریاں ہو کے سامنے آ جاتی ہے۔ عجیب صحافی ہو، کم پہلی نظر میں اس عورت کی اصلیت نہ بھانپ سکے۔“

”میں نے اسے صحافی کی نظر سے دیکھا ہی تھا کہ۔ تم نے آئی کہہ کے تعارف کروایا اور میں بس اس سے آگے احترام کی وجہ سے کچھ سوچ بھی نہ سکا۔“

وہ آہستگی سے بولا۔ اور حقیقت بھی یہ تھی اپنے پروفیشن کے لحاظ سے وہ واقعی ایک جینس بندہ تھا لیکن عام زندگی میں ہر بات کو ہر چیز کو سلی انداز میں لینے والا۔ تہہ تک پہنچنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ آئی اور تیرا کہہ کے کھلے ڈالے لائے۔ اسٹائل اور سفری پہناؤں کو ان کی سوسائٹی کے تقاضے سمجھا۔ اب خیال آ رہا تھا کہ وہ کوئی اتنے ابر کلاس سے بھی تعلق نہ رکھتے تھے۔ بلکہ کئی لحاظ سے مل کلاس ہی کہلائے جاسکتے تھے پھر یہ فارن ریٹرن اور ہائی کلاس سوسائٹی جیسے طور طریقے رکھنے کا مطلب؟

”تم بھی بس بھولے بادشاہ ہی ہو یار۔ نہ جانے اتنے سال لاہور میں کیا کرتے رہے۔ وہاں تو ایسی آئیناں دھڑلے سے شریفوں کے محلے میں رہتی ہیں۔ اب ان شہروں میں بھی یہ رواج ہو گیا ہے۔ بدنام بازاروں کی رہائش اس لیے ترک کر دی ہے کہ وہاں خرقہ کلا ہے اور اوپاش لوگ آتے ہیں۔ کوٹھوں کے بجائے کوٹھیوں میں آنے کا یہ فائدہ ہے کہ

صاف سحرے، کریم کلاس کے برنس میں آتے ہیں۔ لوگوں میں آزادی سے اٹھ بیٹھ بھی سکتے ہیں۔ اب اس آئی کو ہی دیکھ لو۔ پہلی شادی کسی زمین دار سے کی طلاق اور دو بچوں کو لے کر پھر اس محلے میں گئی۔ ایک شریف بندہ پچاسیا، کلاچ کا ٹیگ لگایا اور جانے والوں کی مدد سے یہ کام ڈرا لگ ڈھنگ سے شروع کر دیا، وہ بچے محفلیں، غمخیاں سب گئے دور کی باتیں ہیں میری جان! آج کے امیر زادے کچھ اور مانگتے ہیں انہیں امراؤ جان ادا نہیں بلکہ "ماؤں روخ" چاہیے۔ اس نے بھی بیٹیاں بھلے اپنے دھندے سے ہی لگائیں لیکن کالج بھیجنے کے بعد یعنی بر طرح کے کیل کا سننے سے یس کر کے۔"

"بیٹیاں؟ اپنی بیٹیاں بھی؟ تم کبہ رہے تھے، جانے والیاں؟"

اس نے بڑی آس سے پوچھا۔ یہ خیال ہی تکلیف دہ تھا کہ اتنا عرصہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شملک رہا اور پھر خود پہنازاں بھی رہا۔

"ہاں، اپنی اولاد کے معاملے میں ڈرا اصول الگ رکھے ان میڈم نے۔ انہیں ایسے کسی کام سے نہیں لگایا جس میں رکب اور بدنامی زیادہ ہو، اور تو اور اس نے بیٹے کے دام بھی کھ بے کیے۔ ماضی کی مقبول ماڈل گرل اور اب کی نامور فیشن ڈیزائنر کا Pet ہے یہ۔۔۔۔۔ Pet بانتے ہو۔ پالتو شیر۔ بڑی جینی میز الملک کے پائے کے سیاستدان سے بیاہ دی اب پاور چاہے اس کے پاس ہو نہ ہو، عہدہ ہو نہ ہو۔۔۔۔۔ پیسہ تو بہت ہے، یہ لکھی جس میں اب رہ رہے ہیں، اسی خاں صاحب کی عنایت کردہ ہے۔ ابھی کافی کچھ سے بڑھے کے پاس اس لیے گھر بسا ہوا ہے ورنہ چھوٹی لڑکی تیرا تو آٹھ ماہ میں سب سیٹ کے آگئی تھی۔"

"کیا؟" وہ لڑز گیا۔

"ہاں اور آئی صاحبہ بھی اس روز اسی سلسلے میں وہاں موجود تھیں۔ نواز لائق کو جانتے ہو۔۔۔۔۔ پچھلے مال اسی سے نکاح ہوا تھا تو تم نے ان کا، اصلیت جلد لگی گئی۔ اس لیے زیادہ عرصہ نبھ نہ سکی، بے جاری بنتا ہو۔ سکی اسی پہ اکتفا کرتے ہوئے بھاگ گئی، نواز نے کہیں پریس کانفرنس کے ذریعے کچھ چھو لےنے کی کوشش کی تو آئی صاحبہ پہنچ گئیں یہیں اسی آفس میں تعینہ ہوا تھا۔"

"تو وہ شادی شدہ۔۔۔۔۔ وہ پوچھتے پوچھتے رک گیا۔ اپنا ہی مجرم ٹھہرے گا ورنہ۔۔۔۔۔ اسے نیر اور آئی کے وہ تمام رنگ ڈھنگ اور ناز و انداز یاد آئے گئے جن کی بدصورتیوں سے اس نے اب تک آنکھیں چر، رکھی تھیں۔ وہ اکثر رات کو جب گھر پہنچتا تو ہمانت بھانٹ کی لڑکیاں نیچے جمع ہوتیں، بجز کیلے پولیسات اور شرع میک اپ کے ساتھ۔ اس کے ایک بار کے

استفسار کرنے پر آئی نے وضاحت کی تھی کہ وہ فارغ وقت میں لڑکیوں کو مختلف علوم کی ٹریننگ وغیرہ دیتی ہیں۔ وہ اس ٹریننگ کو کوکلنگ، جینک، ڈریس ڈیزائننگ، پینٹنگ اور میک اپ وغیرہ کے کورسز ہی سمجھتا رہا، اپنی دھن میں یہ تک غور نہ کیا کہ آنے والی لڑکیاں ماٹا۔ اللہ سے خود خاصی "ٹرینڈ" گئی ہیں۔

اور وہ اکثر و بیشتر یہی کہتا تھا کہ اس سے بے تکلفی سے رقم مانگ لینا۔۔۔۔۔ نیرا کا آئے دن اس سے شاپنگ کروانا۔ سب اس پہ واضح ہو گئے۔

وہ خاموشی سے رائل کے پاس سے اٹھ آیا۔ اسے خود پہ غصہ آ رہا تھا اور شرم بھی محسوس ہو رہی تھی کہ کیسے وہ ایک بازاری عورت کے ہاتھوں بے وقوف بن گیا۔ یہ بات ابھی تک اس کی سمجھ سے باہر تھی کہ آخر آئی اور ان کی بیٹی کی نظریات اس پہ یہ کیوں ٹھہری۔ شہر کے رئیس اور سیٹھ کیا سب ختم ہو گئے تھے یا سب کے سب نیرا کے آزمائے ہوئے تھے یا پھر اس کی حماقت، سادہ لوحی یا صاف لفظوں میں گھماڑ پن اتنا ہی ان دونوں کو بھایا تھا کہ وہ اس عام سے درجے کے صحافی کو کونے کے لیے منتخب کر بیٹھیں۔ بہت سوچ سوچ کر یہی بات دماغ میں آئی کہ ایک شادی کے بعد نیرا کا بھادگر گیا ہوگا اور شہر میں نیا نیا آنے کی وجہ سے اس کا ان کی اصلیت جان لینے کا اندیشہ کم سے کم ہوگا اس لیے۔۔۔۔۔ اس نے سچائی سے اپنا احتساب کیا۔

"جی جی تو سوچا تھا نیرا نے، واقعی مجھ سے زیادہ حق اسے اور کوئی کیا ملتا جو دیکھتے بھالتے، جانتے ہو جیسے انجان بتا رہا۔ میں تو خاموشی سے اپنا آپ پر بادر لے جا رہا تھا، اتنا مجھ کو ہو چکا تھا اس کی ذات کی ظاہری رنگینوں میں کہ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت ہی ماؤف ہو کر رہ گئی تھی، چکا چونڈ نے آنکھیں اتنی چڑھایا دیں کہ کوئی روشنی بھائی نہ دے رہی تھی۔ وہ تو اگر ابو جان آکر دھماکا نہ کرتے تو میں یوں ہی مگن رہتا، ان کی بات نے ایسا چونکا دیا کہ میں ارد گرد پہ غور کرنے پہ مجبور ہو گیا۔

اور پھر۔۔۔۔۔ پھر صدف کے وہ الفاظ۔۔۔۔۔ جی تو یہ ہے کہ ان الفاظ نے ہی مجھے سمجھوڑ ڈالا تھا۔ اگر وہ الفاظ۔۔۔۔۔ قربانی اور آپ بے کی محبت کا وہ لازوال فلسفہ میرے اندر سننے سے معنی نہ دے جاتا تو نیرا کی تجویز مجھے اتنی ناقابل عمل نہ لگتی اور شاید میں بھی ابو جان کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھانے کا سوچے ہوئے اس دلفریب جال میں پھنس چکا ہوتا لیکن وہ جب کی بات تھی۔ تب کی۔۔۔۔۔ جب میں سر سے حیرتک نئے میں مدھوش تھا، اب میں ایسا کیوں سوچ رہا ہوں۔ مجھے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے کسی نہ کسی وسیلے سے مجھے سمجھنے کا موقع دیا۔"

”عاکف! تم یہ مہندی کا پیالہ پکڑو..... میں ذرا یہ ”الاجہ“ کے گلے میں ڈالتا ہوں۔“

ابراہیم نے رنگین پھندوں اور فزنی گھنٹیوں سے سجا ہار بکرے کے بیٹگوں سے پھنسا کر گزارنے کی کوشش دی۔

”بھائی! یہ مہندی نہیں لگوار ہا، بھنڈی ہے ناں اس لیے ہاتھ لگا تے ہی جک جاتا ہے۔ ذرا اس ہی نہیں بن رہا۔“ عاکف نے دہائی دی۔

”تو تم یہ جلیبیاں مت بناؤ یا رہا، بس چاند بنا دو اور ستارہ۔“

”ہاں..... وہ تو جیسے بہت آسان ہے۔“ وہ چڑ کے بولا۔

”آئی! مجھے یقین ہو گیا، وہ جو افسانوں میں لکھتے ہیں تاکہ محبت خود بخود اپنا رستہ بنا لیتی ہے اور وہ جو گانے ہوتے ہیں، پیارا کیا نہیں جاتا، ہو جاتا ہے، دل دیا نہیں جاتا، کھو جاتا ہے، سب سچ ہوتے ہیں۔“

موتی کے کبر الہرا کے گنگٹانے پہ سب چونک کے اسے دیکھنے لگے۔ عاکف کے چہرے پہ خوش فہمی تھی تو صدف اسے ایسے دیکھ رہی تھی جیسے موتی کا دماغ چل گیا ہو جبکہ ابراہیم اس خوف سے حیرت زدہ ہو گیا کہ کہیں اسے اصل بات کا پتا تو نہیں چل گیا۔

”دیکھیں نا آئی! ابراہیم بھائی تو راجہ سے اتنا چڑتے تھے۔ اب کیسے ایک دم اس سے اتنا پیار کرنے لگ گئے۔ کبھی اس کے آگے ”پچھے“ ڈال رہے ہیں۔ کبھی دانہ کھلا رہے ہیں، صبح خود بھلایا اور اب میک اپ بھی کر رہے ہیں۔“

اس کی بات پہ عاکف کے چہرے کی خوش فہمی نے منہ بنایا تو ابراہیم نے بھی شکر ادا کیا کہ موتی محبت تک تو پہنچی مگر صرف راجہ کی۔

”بات یہ ہے موتی! کبھی پیار واقعی کیا نہیں جاتا ہو جاتا ہے لیکن بلا وجہ کبھی نہیں ہوتا۔ کوئی نہ کوئی وجہ، کوئی نہ کوئی حرکت اس جذبے کو بیدار کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ کبھی انہیت، کبھی قربت، کبھی کشش، کبھی خوبصورتی، کبھی دوستی اور کبھی کبھی احسان مندی..... کبھی کوئی ہستی بغیر جنائے آپ پہ اتنا بڑا احسان کر جاتی ہے کہ آپ کا بس نہیں چلتا، شکرگزاری کے احساس سے مغلوب ہو کے اپنی جیسی ترین متاع اس پہ وار دیں اور دل سے زیادہ قیمتی چیز اور کون سی ہے۔“

”تو آپ نے بکرے کو اپنا دل دے دیا ہے؟“ موتی کے حیرت سے چلانے پہ وہ سر

جھٹک کے خنس پڑا۔ عاکف اور صدف بھی حیرت سے اسے تکر رہے تھے۔

”لیکن یہ راجہ آپ کا خنسن کیسے ہوا؟“ عاکف کے سوال پہ اس نے لب دبا کے کچھ سوچا پھر صدف کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”بس کسی نے بنادیا، نہ نہ..... اب یہ مت پوچھنا، کسی کون؟“ اس نے بار راجہ کے گلے میں پہنائی دی۔

”واہ راجہ کے کیسے لاڈ لاڈلے جا رہے ہیں، کل عید ہے، چچی جان نہیں ہیں تو کسی نے نہ تک نہیں پوچھا۔ موتی تمہیں چوڑیاں اور مہندی پا چاہے، عید کا جوڑا سلوا لیا؟“ اسے بہانا مل گیا پھر بھی اماں کو یاد کر کے روئے گا۔ صدف نے اسے گلے لگا لیا۔

”پاگل، امی کبھی تم سے یہ پوچھتی تھیں، بس عید والے دن تمہارا جوڑا، تمہاری پسند کی سب چیزوں کے ساتھ تمہیں دے دیتی تھیں۔ میں نے بھی یہی سوچ رکھا تھا، تمہارا خوبصورت ماسوٹ تیار ہے۔ جاؤ اکو کے ساتھ جا کے میچنگ کی چوڑیاں لے آؤ۔“

”اور بندے بھی..... بچر کی یازیب بھی..... اور ہاں، وہ نئے شید کی نیل پالش۔“ دونوں تھیلیوں سے آنسو پوچھتے ہوئے وہ لٹ گوانے لگی۔

”یہ تمہاری نہیں راجہ کی عید ہے قربانی اس کی ہو رہی ہے تمہاری نہیں۔ اس عید کا اصل ہیرو بکرا ہوتا ہے، جسے سنور نے کا حق صرف اسے ہے۔“ اکو نے چڑایا۔ وہ اس سے الجھنے لگی۔

ابراہیم نے کن اکیوں سے چا دل چھتی صدف کو دیکھا۔ موتی اور عاکف کے کھٹ مٹھے جیسے سننے ہوئے اس کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”اصل محسن تو تم ہو میری۔“ اس کے دل نے سرگوشی کی۔

”میں جان گیا ہوں کہ مجھے سنبھال دینے میں سب سے اہم کردار تمہارے ان الفاظ نے کیا تھا۔ تم تو شاید جانتی بھی نہ ہو گی تمہاری اس دن کی کبھی عام کی بات نے کس کس طرح مجھے سہارا دیا۔ ورنہ میں تو بالکل بے دست و پا ہو چکا تھا۔ ظاہری کشش اور وقتی پسندیدگی کو عشق سمجھ بیٹھا تھا۔

عشق تو اکو نے کیا تھا، موتی کو برسوں سے بے انتہا جاننے کے باوجود اس کا دل خود غرضی پہ آمادہ نہ ہوا، خود کو نامر اظہر اے جانا منظور تھا اسے لیکن اس کے لیے ہمیشہ بہتر سے بہتر بین کی آرزو کی۔

پھر بھی اماں کی محبت کتنی سچی اور بے غرض تھی، اپنی اولاد کے لیے خود داری سے کام لینا

تو گوارا تھا لیکن پرائی امانت کو کس عقیدت سے سنبھالا کہ ساری عمر بھائی سے کچھ نہ لینے والی بہن اس کے لیے دودھا لگ ہی بیٹھی۔

اور صدف..... قربانی تو وہ ہے جو اس نے دی، اپنی ذات پہ اس نام نہاد مفقعی کا ٹیگ لگائے رکھنا صرف اس لیے گوارا کیا کہ کہیں موتی کے لیے آنے والا کوئی رشتہ اس کا طلب گار نہ ہو جائے..... اس محبتوں سے گندھے گھر نے، اس بھئی فضا نے میرے اندر سے سارے اندھیرے دور کر دیے۔

کیا مجھے اس روشنی سے دور جانا چاہیے۔“ اس نے خود سے سوال کیا اور جواب ملا۔
”نہیں ہرگز نہیں بلکہ اس جگنو کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا ہم سفر کر لو تا کہ بھٹکنے کا بھونے کا کوئی ڈر ہی نہ رہے۔“

اس نے فیصلہ کر لیا اور سرشار سا ہو کے ابو جان کا انتظار کرنے لگا جو جاتے جاتے اس پہ ایک بار ڈال گئے تھے یہ کہتے ہوئے۔

”ایک فرض میں ادا کرنے جا رہا ہوں۔ دوسرے فرض کی ادائیگی تم پر فرض ہے۔“
اور وہ یہ فرض بعد سو دن نہیں لوٹانے کا شدت سے شہر تھا۔

☆=====☆

یہ خواب جو کوئیل ہے

احساس کتری ایک ایسا مرض ہے جو انسان کو زندہ درگور کر دیتا ہے اور انسان کی صلاحیتوں کو دیکھ کر طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیتا ہے..... ایک ایسے ہی کوتاہ قامت شخص کا قصہ جو احساس کتری کا شکار ہو کر اللہ کی رحمت کو بھلا بیٹھا تھا۔

اس نے ایک ہی سانس میں کئی احتیاطی تدابیر گنوا دیں۔

”اور آپ لی بی!“ اب کے وہ میرے برابر میں بیٹھی نینب کی جانب متوجہ ہوئی تو مجھے بھی اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے گردن موڑ کے اسے دیکھنا چاہا۔ سیاہ چادر کے بالے میں کسٹی ہوئی، کچھ گھرائی، زیادہ شرابی کی نینب میری بہ نسبت نہ تو حیران تھی نہ پریشان، میرے لیے تو یہ جزا چاک اور غیر متوقع تھی لیکن شاید اسے کچھ کچھ اندازہ تھا اپنی بدلتی حالت کا۔ اسی لیے تو خود زور دے کر مجھے کسی لیڈی ڈاکٹر کے پاس طے کو کہا تھا۔ میں تب بھی اس کا مقصد نہ سمجھا ہاں البتہ اس بات پر حیرت ضرور ہوئی تھی کہ کسی تکلیف اور بیماری کو خاطر میں نہ لانے والی نینب خود ڈاکٹر کے پاس جانے کا کہہ رہی ہے ورنہ شدید فلو، تیز بخار یا گلے کے انفیکشن میں بھی وہ بجائے ڈاکٹر کے پاس جانے کے گھریلو ٹونکوں اور جوشاندے وغیرہ سے کام چلایا کرتی اور اب صرف ٹھکن، چکڑے اور دل گھرائے جیسی علامات سے گھبرا کر ڈاکٹر کے پاس جانے کا کہہ رہی ہے۔

شاید میں کچھ اور دن ناکار ہوتا مگر کل جب وہ کپڑے استری کرتے کرتے ایک باجے ہوش ہو کر گر پڑی تو مجھے اسے یہاں لانا ہی پڑا اور جب ڈاکٹر نے کئی ایک ٹیسٹ ایک ساتھ لکھ کر دیئے تو مجھے بھی تشویش سی ہوئی کہ اسے ایسی کیا بیماری لگ گئی اور آج ان ٹیسٹوں کی رپورٹ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس پہ میں سن کے بھی یقین نہ کر پا رہا تھا۔

میں نے ایک بار پھر نینب کے چہرے کو کھوجا۔

وہ بہت مطمئن، شادی لگ رہی تھی۔ خوشی سے دکتے چہرے کے ساتھ وہ سر ہلا بلا کے ڈاکٹر کی ہدایات سن رہی تھی۔

”اس وقت جسے سب سے زیادہ تمہارا خیال رکھنا چاہئے وہ تم خود ہو نینب کم از کم یہ پہلے تین مہینے تمہارے لیے حد سے زیادہ محتاط ہو کر گزارنے والے دن ہیں۔ نہ دو کا نافعہ ہو نہ غذا کی کمی۔ دل چاہے یا نہ چاہے تمہیں دن میں کم از کم چار باجے بار خوراک لینا ہے۔ ضروری نہیں کہ بھاری اور ٹھیک غذا کھانی جائے۔ روٹی، سالن کے بجائے زیادہ زور زد ہنسن مگر طاقت بخش غذا پر دو۔ پھل کھاؤ جو پیو، رات سونے سے قبل دودھ ضرور لو، ناشتے میں دلیہ، انڈے وغیرہ لو۔ ایک وقت گوشت بھی کھاؤ، آرام کا دھیان رکھنا۔ سیز جیوں چڑھنا اڑنا، بھاری سامان اٹھانا، مانی بی بی زیادہ جانا سب بالکل ترک کر دو ٹھیک ہے؟“

اس نے تابعداری سے سر ہلایا۔ حالانکہ اس کی امید کم تھی۔ کھانے پینے سے اس کی جان جاتی تھی یہ تو اس کو دیکھ کر بھی کونٹیل کو اندازہ لگا سکتا تھا۔

”آپ کی بیوی امید سے ہے، مبارک ہو۔“

لیڈی ڈاکٹر کے یہ الفاظ میرے لیے غیر متوقع تھے۔ میں الجھن بھرے انداز میں اس کی مسکراہٹ کھونٹنے لگا۔

کہیں اس پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے پیچھے کوئی تسخرف تو نہیں؟ ہم دونوں کا مذاق تو نہیں اڑایا جا رہا۔

”کیا ہوا؟ آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟ پہلا بے بی ہے یا یہ آپ کا؟“ اس نے میری حیرت بلکہ بے پناہ حیرت کو نوٹ کر کے سوال کیا۔

”خوشی؟“ میں نے اس سے نہیں خود سے سوال کیا۔

”آپ کو پورا یقین ہے ڈاکٹر صاحب؟“

”یہ رپورٹس تو یہی کہہ رہی ہیں مسٹر رضا۔“ اس کی پیشہ ورانہ خوش خلقی ذرا خفیف سی ہو گئی، قدرے سخت لہجہ اپناتے ہوئے اس نے اگلے مریض کو اندر بلوانے کے لیے تیل بجا دی۔

”ضروری نہیں کہ ہر بار ہر خاتون کے ساتھ ایک جیسی علامات نمایاں ہوں۔ آپ کی مسز خاصی کمزور ہیں۔ نازل حالات میں شاید ان کی علامات بھی نازل ہوتیں یعنی سبلی، چکڑے آنا وغیرہ، لیکن ایک تو یہ یقیناً ہیں، ان میں ہیوگلوبن بہت کم ہے، دوسرا ان کا لی بی، بے بی کنسیو کر رہی ہے خطرناک حد تک لوہہ نہ لگے اس لیے پیکٹس کی نازل علامات پان کی کمزوری غالب آگئی۔ یہ کچھ وٹامنز لکھ دیئے ہیں میں نے..... ان کا باقاعدگی سے استعمال کرائیے۔ غذا کا خاص خیال رکھیے، پھل، دودھ اور جوس وغیرہ روزانہ کی خوراک میں شامل رکھیں، آرام کا دھیان رکھیے اور انہیں زیادہ سے زیادہ ذہنی سکون دینے کی کوشش کریں۔“

اگلی مرلیضہ اندرا جی تھی میں نے فیس نبیل پر رکھی اور زینب کو لے کر باہر نکل آیا۔

☆=====☆

میں سہام رضا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد پر یہ ہوں۔ چار بہنوں کا چھوٹا، اکلوتا اور لاڈلا بھائی۔

یوں تو ہمارے معاشرے میں اولاد پرینڈ کو دیے بھی کافی اہمیت حاصل ہے، لیکن مڈل کلاس میں شاید اس کی اہمیت زندگی اور موت سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ میرے والدین کا تعلق بھی لوئر مڈل کلاس سے تھا۔ ابوی کا چھوٹا موزن جلال اسٹور تھا، ایک درمیانے درجے کے محلے میں مختصر سا اپنا ذاتی مکان بھی تھا۔ وہ معمولی تعلیم یافتہ تھے۔ جبکہ میری سیدھی سادی گاؤں سے تعلق رکھنے والی امی اتنا بھی پڑھ نہ پاتی تھیں۔ ان کی زندگی کا محور ان کا گھر، شوہر، اولاد اور ان سے متعلق مسائل کے گرد گھومتا تھا۔ ان مسائل میں کیے بعد دیکرے لڑکیوں کی پیدائش اور سرسرا والوں کے طعنے بھی شامل تھے۔ (۱) ج. ابوی کی زندگی کا محور تھا، ماں کا اسٹور، اس کی کبھی بڑھتی اور کبھی گھٹتی، مڈنی، گھریلو اخراجات، بیوی اور گھر والوں کے درمیان مفاہمت کرنے، رہنے کی سلسل مگر نا کافی پوششیں اور دونوں اپنے اپنے اس مخصوص محور میں ایک محور کو خواہش لیے جی رہے تھے اور یہ خواہش تھی، بیٹے کی۔

اس خواہش کی تکمیل میں امی نے اوپر تلے چھ بیٹیاں پیدا کیں، جن میں سے دو تو چند مہینے بھی نہ جی پائیں البتہ باقی چار قاطعہ، مریم، حفیظہ اور صالحہ ماں باپ کی اس خواہش میں اپنا ہنہار کاردار ادا کرنے کے لیے موجود رہیں۔ اب وہ بھائی کے انتظار میں شامل تھیں۔ بارہ سال کے انتظار کے بعد میں ان کے آنکھن میں آیا، میرا تو جو بھی استقبال ہوتا وہ کم تھا۔ ابوی نے اس خوشی میں اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ کیا۔ پوری برادری اور محلے میں خالص دینی گھی کے لٹو دیا پلٹ بھر بھر کے ہانے گئے۔ امی جی نے دانی کو اپنا سونے کا کڑا اتار کے دے دیا جو انہیں کم عز پر نہ تھا۔ سونے سے دیے بھی عورت کو کھبت ہوتی ہے اور نچلے طبقے کی عورت جس نے سونا بنانے کے لیے کئی سال گھریلو جوت میں کوتاہیاں کی ہوں، کمینیاں ڈالی ہوں۔ یہ فراخ دل امی ان کی بے پایاں سرت کا والہانہ اظہار تھی۔ میری دادی جو پورے خاندان میں کنجوس مشہور تھیں انہوں نے برسہا برس سے لوہے کے بڑے ٹرک میں سنبالے قیمتی ریشمی سوٹ ساری بیٹیوں اور بہنوں میں مارے خوشی کے تقسیم کردیے اور تو اور جب سوا ہفتے بعد میرا عقیقہ ہوا تو باقاعدہ ڈھولک رگی گئی۔ دو پرے کے سارے رشتے دار مدعو کیے گئے۔ پلاؤ، زردہ اور تومرہ کی دھلیں پکائی گئیں، یہ سب ظاہر ہے کہ میری یادداشت کا حصہ

نہیں۔ ماں یہ دادی سے سنے ہوئے وہ قہسے ہیں جواب تک ذہن میں زندہ ہیں۔ اس یادگار حقیقت کی تمام تفصیلات وہ اکثر مجھے گود میں بٹھا کے سناتی تھیں، جب تک وہ زندہ رہیں۔

”تیری چھوٹی چاچی، دیوے تو تیری ماں سے کبھی نہیں بنی اس کی لیکن تیرے عقیقے پہ اپنے ہاتھ سے بروکینڈ کی چمکلی سنہری شیروانی اور ٹوٹی سی کے لائی، بڑے شوق سے تجھے پہنایا۔

تیری مکی ماسی، کوڑا..... جب دیا ہی نہیں لگی تھی، بوی شوخی ہوتی تھی۔ لک (کر) پہ دوپٹہ باندھ کے ناچی تھی ڈھولک پہ۔ وہیں میری چچیری بہن نے اسے اپنے منڈے کے لیے پسند کیا تھا۔ اتنا کرسموں والا ثابت ہوا تھا تو اپنے ناگوں (نصیال) کے لیے۔ خوش تو تیری نانی بھی بڑی تھی۔ تیری مامی نے اس دن چٹکی سے عزتی کر دانی میرے ہاتھوں۔ منہ لگا کر کے کہنے لگی۔

”ہائے، یہ منڈا تو ست ماہا (سات مہینے کا) لگتا ہے نہ حدی، نہ بوٹی۔“ مجھے تو لگ گئی آگ چار کڑی باتیں ضرور سنائیں۔ وہ بوٹی کون تھی۔“ لیکن اس وقت اپنے کزور، نازک کے پوتے کو آنکھوں سے لگا لگا کے چومنے والی میری دادی کو بھی جلد ہی میری صحت کے بارے میں تشویش رہنے لگی۔ کبھی وہ میری ہاتھ پر بکرتی۔

”نامراد کا دودھ ہے کہ پانی کچھ لگتا ہی نہیں لڑکے کو، چھ مہینے کا ہو گیا ہے۔ گود میں پڑا جھٹکے کا بچہ ہی لگتا ہے۔ تو بہ، ہاتھ میں لینے دو لگتا ہے، تلی سے پتلی ٹانگیں اور ہازو۔“ وہ نہ جانے کون سے حکیموں اور دانیوں سے رنگ برنگے تیل لا کے میری ناگوں اور سینے کی مالش کرتیں۔ کبھی ابو سے تشویش کا اظہار کیا جاتا۔

”دس نے کہا تھا شیخی ماں، تو اللہ نے کرم کیا تھا تو اللہ کا ہی شکر ادا کر لینے یوں سارا شہر اکٹھا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ لوگ تو کھانسی کے ڈکار لینے والے ہوتے ہیں۔ کوئی شہدہ نظر لگا گیا ہے۔ دیکھ تو، اس عمر میں بچے بیٹھنا شروع کر دیتے ہیں، یہ نانا گردن تک سیدھی نہیں رکھ سکتا۔“

میں نے اپنی ابتدائی عمر کی تصاویر بھی دیکھی ہیں۔ واقعی ان کی تشویش بجا تھی۔ ان تصاویر میں موجود بالشت بھر کے سات آٹھ مہینے کے بچے کو کچھ کے میں خود ڈر گیا تھا جس کے مختصر سے وجود پہ صرف آنکھیں نمایاں تھیں۔ میں نے اپنی پہلی سالگرہ کی تصویر بھی دیکھی تھی جس میں میں بڑا خوب صورت بابا سوٹ پہنے امی اور ابو کے درمیان دادی کی گود میں بیٹھا

ہوں۔ اس میں بھی میں بمشکل چند ماہ کا لگ رہا تھا اور پھر اس کے بعد آنے والی سالگرہا ہوں کی تصاویر، ہر تصویر میں صالحہ بائی، خدیجہ بائی..... مریم اور فاطمہ جیسے ایک سال میں کئی برسوں کی جست لگا کے آگے بڑھتی ہوئی تھیں اور میں نہ جانے کس طرح رینگ کے ایک سال گزرتا۔

اور یہ میری پانچویں سالگرہ کی تصویر..... کسی دو ڈھائی سال کے بچے کے برابر میں ایک بار پھر دادی کی گود میں تھا۔ یہ دادی کے ساتھ میری آخری تصویر تھی..... میری چھٹی سالگرہ سے پہلے وہ گزر گئیں۔ میری صحت اور افزائش کے متعلق اپنی ساری فکریں ساری تدابیر میری ماں کو سوپ کے باجیوں کو کوسنے باجیوں کی دادی کے بجائے امی دیتے لگیں۔

”نامرادیں تیری کی تیل کی طرح بڑھتی جا رہی ہیں۔ باپ کا سارا رزق ان ہی پر اٹھ رہا ہے۔ جہاں لڑکیاں اتنی جھٹلتے پھولتے والی ہوں وہاں لڑکے سوکھ کے کاٹنا بنتے جاتے ہیں، اللہ بخشے ہے بے ٹھیک کبھی تھی۔“

اب اس تشویش کا اظہار ماں کے علاوہ اور رشتے دار عورتوں اور آس پر دس کی جانب سے بھی ہونے لگا۔ طرح طرح کے مشوروں سے نواز جاتا۔ کسی قسم کے ٹوٹنے بتائے جاتے۔ کسی بزرگ عورت کی تحقیق کے مطابق میں ”سوکھے“ کا شکار تھا یا غلطی سے کسی نے مجھے جھاڑو سے جھنڈ دیا تھا اس کے سد باب کے لیے میرے ابو کو بلانا تھا۔ منہ اندھیرے مسجد میں جھاڑو دینے کا مشورہ دیا گیا۔ کسی دور پرے کی تالی کے خیال میں میں نظر بد کا شکار تھا، فلاں جیر کی دھوئی سے ٹھیک ہو سکتا تھا۔ کوئی مقتول خاتون کسی ایسے معالج سے معائنہ کا مشورہ بھی دیتی۔

میں اپنا دل نہیں تھا کم از کم ذہنی طور پر..... بلکہ دیکھا جائے تو جسمانی طور پر بھی اللہ کے فضل سے کوئی عیب نہیں تھا۔ میری نظر ٹھیک تھی۔ عام بچوں کی بہ نسبت دیر سے بولنا شروع کیا، انک انک کے بولنا سیکھا، لیکن اب پانچ چھ سال کی عمر تک روانی سے اور صاف لہجے میں بولنا سیکھ چکا تھا۔ تقریباً دو سال کی عمر کے بعد پہلا قدم اٹھایا مگر میری کمزور سوکھی پانگیں پو لیکا شکار نہیں تھیں، اب میں نہ صرف، چل سکتا تھا بلکہ دوسرے بچوں کے ساتھ بھاگ دوڑ کے کھیل بھی سکتا تھا۔ جسمانی لحاظ سے میں کچھ سنست روی کا شکار ضرور تھا یعنی نازل بچوں کی نسبت میں نے ہر کام دیر سے شروع کیا۔

مکی وجہ ہے کہ پانچ سال کی عمر میں ابو نے مجھے اسکول میں داخل کرنے کا ارادہ کیا۔ اب میں امی کی گود سے دور..... بہنوں کے لاڈ سے نکل کر ایک نئی دنیا میں جانے کے لیے

پر تول رہا تھا۔ خود آگہی کی جانب پہلا قدم..... اور ہر آنے والا سال مجھے خود سے شناسا ہونے کا بھرپور موقع دیتے لگا۔ بھرپور اور سفاک موقع۔

☆=====☆=====☆

وہ میری زندگی کا جیسا سال تھا۔ پچھلے سال جب ابو مجھے اسکول میں داخل کرانا چاہتے تھے تو اس فیصلے کی سب سے زیادہ مخالفت دادی نے کی تھی۔ انہوں نے چچا اور چھوٹے بھائیوں کو بلا کے باقاعدہ پنچایت بٹھائی تھی اور دورو کے دادیلا کیا تھا کہ مجھ پر..... یعنی ان کے معصوم، بے چارے پوتے پر کیا ظلم ہونے جا رہا ہے۔

یوں میرا اسکول جانا ٹل گیا۔ دادی کے گزرنے کے بعد اور میری چھٹی سالگرہ کے اگلے مہینے ابو مجھے علاقے کے نزدیکی پر ایویٹ انکش میڈیم اسکول میں لے گئے۔ ہر مل کلاس کے شخص کی طرح انہوں نے بھی اپنی اولاد کے لیے کچھ خواب دیکھ رکھے تھے۔ بڑے اونچے، بڑے اعلیٰ خواب..... اور اولاد بھی پھر وہ..... اگلی نہ، زینہ اولاد۔ ابو نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلا کے بڑاافر، ڈاکٹر یا وکیل بنانے کا خواب دیکھ رکھا تھا۔ خود ان کی ساری زندگی کریانے کی دکان میں دالیں، مسالے اور کچی تول تول کے گزر گئی تھی انہوں نے تو بیٹیوں کو بھی پڑھایا تھا۔

”نرسری میں چھ سال کا بچہ؟ ہم نرسری میں تین سے چار سال تک کا بچہ لیتے ہیں۔“

”چار سال کی عمر میں تو جی میرا رضامیرا مطلب ہے کہ وہ تو ب بہت چھوٹا تھا۔“ ابو پہلے ہی اسکول کے ماحول، فرمانے سے انکش بولتے پر نکل کو کچھ کے مرعوب سے تھے۔ اس نئے اعتراض نے ان کی رہی رہی خود اعتمادی بھی شتم کر دی۔

”آپ خود سوچیں کہ ایک بچہ چھ سال کی عمر میں پڑھائی شروع کرے گا، آٹھ سال کی عمر میں تعلیمی دور کا باقاعدہ آغاز کرے گا تو اسکول سے نکلنے نکلنے ہی اٹھارہ انیس سال کا ہو جائے گا۔ جبکہ تک عمو مانے بچے گریجویٹن کر لیا کرتے ہیں۔ آپ کی سستی نے آپ کے بچے کو بہت پیچھے لاکھڑا کیا ہے۔“

”تو پھر اب کیا ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے میں تو بڑے شوق سے یہاں آیا تھا۔ آپ کا اسکول ہمارے علاقے کا سب سے اچھا اسکول ہے۔“

”میں آپ کے جذبے کی قدر کرتا ہوں حسین صاحب! لیکن سب بچے تین ساڑھے تین سال کے ہیں ایسے میں آپ کا بچہ کلاس میں سب سے الگ ہو گا۔ ویسے اگر آپ کو ہمارا اسکول اتنا پسند ہے تو میں آپ کے چھوٹے بیٹے کو داخلہ دینے پر تیار ہوں۔“

”چھوٹا بیٹا؟“

”اوہ میس۔ یہی درست وقت ہے اسے داخل کرانے کا۔“ وہ میری طرف پیار سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے میں ان کی توجہ پہ ذرا سا مسکرایا۔
”کیا عمر ہے اس کی؟“

”چھ سال۔“ ذرا توقف کے بعد ابو جواب دینے کے قابل ہوئے مگر اس جواب کے بعد پرنسل دیر تک اگلا سوال کرنے کے قابل نہ ہو سکے۔

”میں اسی کا ایلمینٹیشن کرانے آیا تھا۔ یہی میرا اگلا بیٹا ہوا۔“
پرنسل کبھی مجھے، کبھی ابو کو دیکھ کر ہتھے رہے۔ ابو نے ان کی حیرت مکمل طور پر رفع کرنے کی کوشش کی۔

”یہ بچپن میں خاصا پیار رہا ہے جناب، اسی وجہ سے داخلہ کئی بار ہوتے ہوتے رہ گیا۔ آپ دیکھیں اب بھی کتنا کمزور ہے۔ آپ یقین کریں، نرسری کلاس کے بچوں میں مکمل مل جائے گا۔“

”ہوں۔ یوں آؤ رازنٹ۔۔۔۔۔ پھر بھی میرا مشورہ ہے آپ اس کی عمر دو سال کم لکھوائیں۔ آگے چل کر اس بچے کے لیے آسانی رہے گی۔ ویسے اتنا بتا دوں، مجھے اس کا ٹیسٹ اور انٹرویو لینا پڑے گا۔“

شاید انکس یقین نہیں ہوگا کہ میں ذہنی طور پر اس قابل ہوں بھی یا نہیں کہ ان کے اسکول میں چل سکوں، لیکن میں نے انٹرویو میں پوچھے گئے سوالوں کے جوابات خود اعتمادی سے دیئے۔ یوں میرا ایلمینٹیشن چھ سال کی عمر میں نرسری کلاس میں ہو گیا۔

☆ ===== ☆

اور یہ میری عمر کا نوواں سال تھا۔ نہیں، نہیں گیارہواں یا ساٹواں نہیں بلکہ حقیقتاً نوواں سال۔ جب سے ہوش سنبھالا تبھیوں اور امی کو نوالے ہاتھوں میں بنانا کے اپنے پیچھے بھاگتے دیکھا، مجھے کھانے پینے والی ہر چیز سے بیزاری سی ہو گئی تھی، لیکن اب میں نے گھبرا کے امی کی باتوں کو تنبیہ کی سے لیتا شروع کر دیا۔

ان کا کہنا تھا کہ کبھی کھانے سے خون بنتا ہے اسی لیے وہ گوشت بھونے ہوئے گرم گرم کھینچتی مجھے زبردستی کھلایا کرتیں۔ پہلے میں رو دھو کے ایک آدھون لالہ کرتا، اب چاہے کھینچی میرے طلق میں پھنستی جاتی، مگر میں خانا خون بنانے کے شوق میں چپائے جاتا، ننگے کی کوشش کیے جاتا۔

دودھ دیکھتے ہی میرا موز آف ہو جاتا تھا، اب طوباً اگر بائیں رات کو دودھ بھی پینے لگا۔

بھل میں مجھے صرف آم بھاتے تھے جو باہر سے سارا سال تو نہیں ہوتے تھے لیکن اب میں امی کے کاٹ کر دیئے گئے بر پھل کو کھانے کی کوشش کرتا۔

ابو نے رسی کو دے کے لیے رسلار کر دیا، لٹکنے کے لیے بھی برآمدے میں جنگلا گلوایا کہ شاید لٹکنے سے قد بڑھا جائے، لیکن فی الحال تو کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔

میں نے اپنے احساس کمتری کو اپنی ذہانت کی وجہ سے کم کرنا چاہا۔ پہلے سے دگنی محنت شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ میری خند و شصت پوچھا، کھانے پینے سے ایک بار پھر میرا جی اچاٹ ہو گیا۔ کیونکہ امی کے بتائے سارے بھلاؤں سے نرے بھلاؤ ہی ثابت ہوئے، انا ایک دم سے معدے پہ پوچھ پڑنے سے میرا پیٹ خراب ہو گیا۔ امی نے گھبرا کے ساری قوت بخش مجھ کو، طلوے اور مردھ سے بند کر دیئے۔

دن رات کی پڑھائی سے میں اور بھی سوکھ کے کاٹنا ہو چکا تھا، لیکن مجھے اب اس کی پرواہ نہ تھی۔ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا یہی تو ایک راستہ تھا میرے پاس۔

ان ہی دنوں اسکول میں سالانہ تقسیم اعلائیات کی تقریب کا انعقاد ہوا۔ اس فنکشن میں تقریری مقابلے اور فنیسی ڈریس شو، ٹیلو وغیرہ بھی ہوتے تھے۔ میں نے بڑے شوق سے اپنا نام لکھوایا۔ میرا ارادہ تھا۔ ایکڑا مزے کے رزلٹ کے ساتھ ساتھ میں تقریری مقابلوں اور دوسری غیر نصابی سرگرمیوں میں بھی انعام حاصل کروں گا۔

لیکن مجھے اندازہ نہ تھا کہ تقریری مقابلوں اور ٹیلو کے لیے مجھے بھی اُن فنٹ قرار دیا جائے گا۔ پناہ رستہ تیر رہا تھا۔

اردو کی نیچر کی مدد سے میں نے نہ بڑی اچھی تقریر بھی لکھ لی تھی، تیار ہی بھی بہترین تھی۔ نمبر مرے اندازہ، تلفظ اور انداز کی ادائیگی سے مطمئن تھیں۔ ریپرسل کے دوران ایک بار واس پرسل ہال میں آئیں۔

”نرسری اور پریپ کے بچے تو صرف فنیسی ڈریس شو میں حصہ لے سکتے ہیں۔ ڈیوٹ اور اپنیج کے لیے کلاس تھری سے کلاس فائیونک کے بچے لیے جائیں گے۔ کیا یہی ہے ہوا تھا مس رشیدہ؟“ انہوں نے کڑے طور پر اردو کی نیچر سے سوال کیا۔

”میں میڈم اسہام رضا کلاس تھری کا ہی اسٹوڈنٹ ہے۔ اینڈ ہی از آؤری بریلیٹ ہوائے۔“ میڈم ابھی حال ہی میں تعینات ہوئی تھیں اس لیے ہوا واقف تھیں ورنہ کسی نہ کسی اچھے یا برے حوالے سے، میں اس اسکول میں خاصا مشہور و معروف تھا۔

”اوہ، ڈیل پر موشن۔“ پلی بھر کے لیے ان کی آنکھوں میں سٹائش کی چمک لہرائی، شاید

یہ سوچ کر کہ ایک پانچ سالہ بچہ کس طرح ذہانت کے بل بوتے پہنچی جنت لگا تا ابھی سے اس کلاس میں پہنچ گیا۔

”نومیزم، رضائے دو سال پہلے ذہل پر دوشن ضروری تھی، لیکن کلاس تھری میں وہ پراپر طریقے سے ہی آیا ہے۔ ہی ازانن انیر زاولڈ۔“ کچھ دیر تک میڈم بغور میرا چہرہ دیکھتی رہیں۔ میں نے بہم کے نظریں جھکا لیں۔ کچھ دیر قبل جس اعتماد کے ساتھ میں واکس پہ کھڑا تھا، وہ اعتماد ان تنقیدی نظروں کے باعث کب کا رخصت ہو چکا تھا۔ میری منہمی میں ہتھیائیاں پہنچ رہی تھیں اور میرے قدم لڑکھار رہے تھے۔

”میرے خیال میں یہ مناسب نہیں۔“ بالآخر انہوں نے فیصلہ کن انداز میں سر ہلایا۔

”اس بچے کو تقریری مقابلے میں رکھنا درست نہیں ہوگا۔“

”بٹ میڈم، یہ بہت اچھی طرح.....“ مس رخشندہ نے کہنا چاہا لیکن انہوں نے بات کاٹ دی۔

”وہ سب ٹھیک ہے لیکن اور بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ کلاس تھری سے دو اور بچے بھی حصہ لے رہے ہیں، آپ انہیں دیکھیں اور اس بچے کو دیکھیں بہت نمایاں فرق ہے۔ اس بچے کو واکس پہ آتا دیکھ کے ہو سکتا ہے کہ بہت سے چیزیں اعتراض کریں کہ ان کے کلاس دن اور کلاس ٹو کے بچے شامل کیوں نہیں گئے ہیں۔“

”لیکن ہم بتا دیں گے کہ سہام کلاس تھری کا ہے اس ذرا اس کی ہائیٹ.....“

”فرائی نو اے رائیٹنڈ۔“ میڈم نے حسب عادت ایک بار بھڑکا کر کافی۔

”اگر یہ ذہل پر دوشن ہو کے آیا ہوتا تو ہم کوگ خاص طور پر واکس کرتے کہ ہمارے پاس غیر معمولی اسٹوڈنٹس ہیں لیکن یہ کہنا کہ یہ بچہ نازل نہیں ہے، اسکول کی ریپرٹیشن کے لیے ٹھیک نہیں۔“

”لیکن سہام رضا ایک نازل بچہ ہے۔“ مس رخشندہ نے مضبوط لہجے میں زور دے کر کہا۔

”بٹ ناٹ فریڈلکی۔“ انہوں نے اس سے بھی مضبوط لہجے میں حتمی رائے دی اور یہ فقرہ میرے نو عمر ذہن پہ ثبت ہو گیا۔

نازل کیا ہوتا ہے..... اور اعتماد ہوتا کسے کہتے ہیں، اس کی گہرائی سے تو میں اب تک واقف نہیں تھا، صرف اتنا احساس ضرور ہو گیا کہ میں باقی بچوں سے الگ ہوں، ان سے مختلف ہوں اور یہ الگ ہونا مختلف نظر آتا ہو کر ایسا نہیں جس پہ فخر کیا جاسکے، بلکہ میرا ان سے الگ

ہونا میرے لیے سراسر شرمندگی اور نقصان کی بات تھی۔ اس احساس کو پہلے میں نے کئی بار ہلکا سا محسوس کیا تھا لیکن پوری طرح سے اسے اجاگر کرنے میں واکس پریس کا سبب رہی تھیں۔

میں تھکے تھکے قدموں سے وہاں سے نکل آیا تھا اور گراؤنڈ میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کے فریڈلک انسٹرکٹر کو بچوں کو ٹینک دیتے اور پریکٹس کراتے دیکھنے لگا۔ لمبے تو کنگے صحت مند لڑکے باسکٹ بال کھیل رہے تھے۔ میں ان کی اچھلی کودتی ناگھیں دیکھنے لگا۔

”کیا سوچ رہے ہیں سہام رضا؟“ میرے شانے پہ کسی کے نرم ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا۔ مس رخشندہ کی شفیق آواز پہ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ اپنے نرم خوشو سادہ سے نقوش والے سانولے چہرے پہ ایک مہربان سی مسکراہٹ لیے مجھے ہی دیکھ رہی تھیں۔ آنسوؤں سے بھری آنکھیں اس ذرا سی بھر دئی کو پا کر چمک چمک گئیں۔

”اوم آں سہام رضا! آپ ایک بہادر بچے ہیں۔ ذرا سی بات بہت پتہ تو نہیں ہارنی چاہئے۔“

”لیکن ٹیچر میں۔“ زندھے ہوئے گلے کے ساتھ میں نے کہا چاہا۔

”آئی نو، کیا ہوا جو اس مقابلے میں آپ ٹھیک نہیں لے رہے۔ آپ اتنے ٹیلنٹڈ ہیں اور کسی مقابلے میں حصہ لے سکتے ہیں۔“

”نو ٹیچر! میں باسکٹ بال نہیں کھیل سکتا۔ میں ریس میں بھاگ نہیں سکتا، بھاگ تو سکتا ہوں لیکن جیتوں گا تو نہیں، میں تو شاید سب سے لاسٹ میں رہوں گا۔ میں مارچ پاست میں بھی شامل نہیں ہوں۔ وہاں بھی سب لمبے لمبے اور Healthy لڑکے ہیں، میں تو Healthy نہیں ہوں۔“

”کیوں نہیں ہیں؟ اگر آپ صحت مند نہ ہوتے تو اتنا اچھا کیسے پڑھ پاتے، پتا ہے جب تک کوئی فریڈلکی اسٹوڈنٹ نہ ہو، دیکھنی بھی دیک ہی ہوتا ہے جبکہ آپ اپنی کلاس کے سب سے ڈیزین بچے ہیں۔ ہر بات سب سے پہلے چک کرتے ہیں۔“

”میڈم نے کہا ہے میں نازل نہیں ہوں۔ میں فریڈلکی فٹ نہیں ہوں۔ میں ان بچوں جیسا نہیں ہوں۔“

میں بار بار میری گہرا کرتا گیا۔ مس رخشندہ نے مجھے بھلانے کی خاصی کوشش کی لیکن بے کار۔ میری ڈائری میں لکھ کے انہوں نے ابوی کو اسکول بلوایا اور ان سے نہ جانے کیا کچھ کہا کہ گھر واپسی پہ وہ بے حد عجیبہ تھے۔

امی نے میرے لیے دو کچی میاں گوندہ کے سوئی کے پیٹھے پراٹھے بنائے تھے۔ دو چار

لئے تو میں نے شوق سے کھانے مگر اب رسی ترانے کی فکر میں تھا۔ امی مجھے گود میں تقریباً دو بچے ہوئے تھیں اور ایک کہانی میں ابجھا کے میرا دھیان بٹاری تھیں جبکہ صالحہ باجی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پراختے کے چھوٹے چھوٹے لقمے توڑ کے میرے منہ میں ڈال رہی تھیں۔ ابوماز بڑھ کے واپس آئے تو ایک لمحہ رک کے یہ منظر دیکھنے لگے۔ امی کی کہانی ایک دلچسپ موڑ پہنچی، میرے انتہاک کو موقع غنیمت جان کر باجی ایک اور لقمہ میرے منہ میں دے لگی تھیں اور میں بے دھیانی میں کھانے چلا جا رہا تھا۔

”رضاب! گود میں بیٹھے کی عمر سے نکل آیا ہے صالحہ کی ماں۔“ یک دم ابو کی ناگوار تاثر لیے آواز ابھری۔

”اسے خود سے کھانے کی عادت ڈالو صالحہ! کیا اب یہ ساری عمر تہارے ہاتھ سے ہی نوالے کھا رہا ہے گا۔“ اب انہوں نے باجی کو ڈنٹا۔

”کیا کروں، کچھ کھا پیتا ہی نہیں۔ سو سو جنرک کے دو وقت کھلا پاتی ہوں، وہ بھی چڑیا جتنا، بڑھنے کی عمر میں ہے اور خوراک نہ ہونے کے برابر۔“ امی نے عذر پیش کیا۔

”بچے کو بھوک لگے گی تو کھالے گا اور بھوک لگتی ہے بھانگے دوڑنے کھیلنے کو نہ سے۔“

سارا دن تو اسے لڑکی کی طرح گھر میں بٹھائے رکھتی ہو۔ گود میں دیکر رہنے سے یہ خاک بڑھے گا۔“

”دیکسی باتیں کرتے ہیں آپ، ان بچوں کو دیکھیں، اور میرے رضا کو دیکھیں۔ میرا نازک سا شہزادے جیسا بچہ اور وہ۔“

”چلو بیٹا، آپ باہر سائیکل چلاؤ۔“ ابو نے انہیں درمیان میں ٹوک کے مجھے کہا۔

میرے لیے یہ سہری موقع تھا۔ میں نے اپنی سائیکل اٹھائی اور گلی میں نکل گیا۔

”اتنی سخت دھوپ ہے۔ ابھی تو شام تک نہیں ہوئی اور آپ نے اسے باہر جانے دیا۔ لوگ گئی تو.....؟“

”سب بچے باہر کھیل رہے ہیں یہ اکیلا اندر ماں کی گود میں بیٹھا بہن کے ہاتھ سے نوالے کھا رہا ہے۔“

”توبہ! آپ تو سچی بات چھہ رہی ہے اس وقت سے۔ کون سی ماں بچے کو گود میں لیتی، کون بہن دلا رہیں کرتی۔ کیسے باپ ہیں آپ! اکلوتے بچے کو ملنے والی توجہ اور محبت بری لگ گئی، لے کے بے چارے کو باہر بھیج دیا اور میرے سامنے دوسرے بچوں کا ذکر تو نہ ہی کیا کریں۔ وہ عادی ہیں ان سب کے مگر رضا کا خون ہلکا ہے کچھ بھی ہو، سب سے پہلے اثر اسے

ہی ہوتا ہے۔ سردی آتی نہیں کہ زلزلہ کام سب سے پہلے اسے پکڑے ہیں، اسی طرح گرمی بھی۔“

”یہ سب تمہاری حد سے بڑھی ہوئی احتیاط پسندی کا نتیجہ ہے۔ آج گیا تھا میں اس کے اسکول۔ اس کی استانی نے مجھے بتایا کہ کس طرح وہ اس سلوک اور غیر معمولی توجہ کی وجہ سے خود کو سب سے الگ سمجھنے لگا ہے۔“

”ہاں تو میرا بیٹا ہے ہی سب سے الگ، سب سے اچھا سب سے پیارا۔“ وہ ممتا سے پوچر لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”تم سمجھ نہیں رہیں۔ وہ خود کو باقی بچوں سے کم تر سمجھتا ہے۔ تم نے اسے یہ کہہ کہہ کر بزدل اور کم ہمت بنادیا ہے کہ وہ باقی بچوں کی طرح صحت مند نہیں ہے، وہ ان کی طرح کھیل کو نہیں سکتا۔“

”تو اس میں غلط کیا ہے؟“ وہ حیران ہوئیں۔

”رضانے پچھلے نوسال میں کون سی بیماری چھوڑی ہے۔ پیدا ہوا تو چڑیا کے نوٹ (بچہ) جتنا تھا، ہاتھ میں لیٹے دوڑ لگتا تھا۔ تین ماہ کی عمر میں پہلی سردی آئی تو مھوٹے نے پکڑ لیا کتنے دن ہسپتال میں رہا۔ پھر سردی چلی گئی مگر مھوٹے کا اثر کتنے سینے نہ کیا، کھانسی گاڑ گئی، سینہ جکڑا گیا۔ پہلے ہی سال ایسا برا ہیضہ ہوا کہ دو ہسپتال میں داخل کرنا پڑا، سارے جسم کا پانی ختم ہو گیا تھا۔ چھ سال کی عمر میں ایجنڈا کس کا آپریشن بھی ہو گیا۔ ان کے علاوہ آئے دن موسمی اثرات کا شکار بھی سب سے پہلے یہ ہوتا ہے۔“

”مانتا ہوں، درست ہے، یہ سب، لیکن اسے صحت مندر رکھنے کے لیے ان سب ٹونکوں اور احتیاطوں کے بجائے وہ سب کرنا چاہئے جو اس کی استانی نے کہا ہے۔“

”کیوں اس نے کیا کرنا دینے؟“ امی کو اچھانہ لگا کہ انہیں میری حالت کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔

”انہوں نے کہا کہ رضا کو ہر وقت یہ احساس دلانا چھوڑ دیا جائے کہ وہ باقی بچوں کی نسبت کمزور ہے۔ اس کے قد اور جسامت کے لحاظ سے اس کے ساتھ ننھے بچوں والا برتاؤ ترک کر دیا جائے۔ اسے ہر وہ کام کرنے کی مکمل اجازت دی جائے جو اس کی عمر کے بچے کرتے ہیں۔“

استانی صاحبہ نے بتایا ہے کہ ابھی بھی وقت ہے، وہ بڑھنے کی عمر میں ہے اسے کسی قابل ڈاکٹر کو دکھایا جائے تو پتہ چلے گا کہ کس کی وجہ سے اس کا قد بڑھنا رک گیا ہے اور غذا اس پہ

پچھلے تین سال سے میرا علاج جاری رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ ان گزرے تین سالوں میں مہنگی دواؤں اور اچھی خوراک، مناسب ماحول کے باوجود قدرتی تین ایچ ٹی بی نہ بڑھ سکا۔ بارہ سال کی عمر میں میرا قدرت سال کے بچے کے برابر تھا۔

علاج سے اتنا فرق ضرور پڑا تھا کہ خاندان اور آس پڑوس میں پہلے میری کوتاہ قاستی اور دھان پان سے وجود کی وجہ کمزور صحت اور مختلف بیماریوں کو گردانا جاتا تھا لیکن اب سب یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ میں ٹھکنے پر ہی بیماری میں مبتلا تھا۔

علائے کے اسکول سے نکل کر میں ہائی اسکول میں آچکا تھا۔ بڑا اسکول، زیادہ بچے اور کہیں زیادہ طنز و تعنیک۔ یہاں بھی میرے پاس واحد ہتھیار ذہانت تھا جس کے بل بوتے پہ میں کچھ دیر کے لیے دوسروں کی توجہ منہ پر مہڈول کرالیا کرتا تھا۔ اب میری تعلیمی قابلیت سے بے حد مطمئن تھے۔ انہیں خوشی تھی کہ میں ان کے خوابوں میں رنگ بھر رہا ہوں۔

عمر کے اس بارہویں سال میں گھر میں پہلی بڑی تقریب ہوتے دیکھی یہ صالحہ باجی کی شادی کی تقریب تھی۔ وہ تین چار سال پہلے تایا جی کے بیٹے سے منسوب ہو چکی تھیں۔ سعید بھائی کویت سے چھٹی لے کے آئے تو فوراً شادی طے ہو گئی۔ میں ابھی ابھی چھٹی کلاس کے سالانہ امتحان دے کے فارغ ہوا تھا۔ میرے پیپر زبے حد اچھے ہوئے تھے۔ پرانے اسکول کے مقابلے میں یہاں طلبہ کی تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے مقابلہ سخت تھا مگر میں مطمئن تھا اور پوری فراغت کے ساتھ شادی کے بیچاموں میں بھر پور شرکت کے لیے تیار تھا۔ شادی سے کچھ دن قبل چند قریبی عزیز اور دوسرے شہروں میں رہنے والے لوگ پہلے ہی سے گھر میں رہنے کے لیے آگئے۔

اب زندگی میں پہلی بار اسنے رشتے داروں کو گھر پہ دیکھ رہا تھا۔ یہ بچل، یہ گہما گہمی میرے لیے نئی چیز تھی۔ مگر کاش یہ میرے لیے خوشگوار بھی ثابت ہوتی۔

خاندان کے کئی بچے میرے ہم عمر تھے۔ وہ رشتے دار جنہوں نے مجھے عرس بعد دیکھا تھا، وہ بڑھ چڑھ کے جیرائی کا اظہار کرتے کہ میں اب تک دلیے کا ویسا کیوں ہوں جبکہ فلاں فلاں تو اس کی عمر کا ہونے کے باوجود۔ تب جواباً وہ عزیز جو ذرا قریبی تھے ان کی معلومات میں اضافہ کرتے کہ میرا یہ نقص پیدا کی ہے اور ماں باپ کے علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑنے کے باوجود مجھ میں بھڑکی کے کوئی امکان اب تک پیدا نہ ہوئے تھے۔

”ہائے ہائے..... کیسے ماگ ماگ کے خدا سے پتالیا تھا، بے چارے حسین نے اور قدرت کے رنگ دیکھو اللہ نے پٹا نہ پا تو کسی مگر.....“

اثر کیوں نہیں کرتی۔ دواؤں اور کچھ ورزشوں کے ذریعے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔“

ابو مجھے شہر کے ایک ماٹھے ہوئے قابل پائلڈ اسپیشلسٹ کے پاس لے گئے۔ جس نے میرے بغور معائنے اور کیس، سسٹری جاننے کے بعد رائے دی۔

”آپ نے ابھی بھی بہت دیر کر دی بچے کو لانے میں۔ ابتدائی علامات کے بعد ہی آپ کو اس کے علاج کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا چاہیے تھا۔“

”ابتدائی علامات؟“

”جی ہاں، جب آپ کا بچہ پری پیچور نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے کہ قبل از وقت پیدا نہیں ہوا تھا تو کیا اس کے غیر معمولی کم وزن نے آپ کو حیران نہیں کیا؟ اس نے ہر کام نمایاں تاخیر سے شروع کیا، یہ بھی قابل توجہ بات تھی۔ مگر آئس کو آپ نے اس کے دیر سے پیٹنے، دیر سے چلنے اور دیر سے بولنا سکھنے کو اہمیت نہیں دی۔ آپ کا بچہ صرف جسمانی کمزوری کا شکار ہو کے یا ابتدائی عمر میں کے بعد دیگر مختلف بیماریوں میں مبتلا رہنے کی وجہ سے ایسا نہیں ہوا بلکہ یہ پیدا ہی طور پہ ایک ایسے مرض میں مبتلا ہے جسے آسان زبان میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دیگر لوگوں کی طرح اس کے جسم میں قدرتی طور پہ بڑھنے پھلنے پھولنے کی صلاحیت مفقود ہے۔ آپ صاحبہ حیثیت ہیں یقیناً اس کی خوراک پہ توجہ دی ہوگی شاید اسی لیے بغیر کسی علاج کے بھی اس نے نو برس کی عمر تک اتنا نہ نکال لیا۔“

”تو کیا اب یہ بالکل نہیں بڑھے گا؟“ ان کی آواز بالکل بے جانی تھی۔

”ایسا نہیں ہے۔ آپ نے تاخیر ضرور کی مگر وقت بہر حال ابھی ہمارے ہاتھ میں ہے۔ انسانی جسم کی نشو و نما اور قدرتی افزائش اٹھارہ سال کی عمر سے لے کر تین سال تک ممکن ہے۔ دواؤں کی مدد سے، مستقل حراجی سے علاج کرنے اور کچھ طبیعت پرانی کرانے سے ہم لوگ رضا کا قد اس عمر تک بڑھانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ پیدا ہی طور پہ اس میں جو کمی ہے اسے مکمل طور پر دور کرنا ناممکن ہے۔“

اس کے باوجود ابونے اللہ کی آس پہ میرا علاج مستقل حراجی سے کرانا شروع کر دیا۔ وہ ایک مہنگا ڈاکٹر تھا، دوا میں، اس کی فیس اور پھر طبیعت پرانی کے اخراجات اگلے ہی سال تک ابو مالی بحران کا شکار رہے۔ اسٹورا جیسا خاص پتا تھا مگر آمدنی کا ایک بڑا حصہ گریو اخراجات اور میرے علاج پہ لگ جاتا اور اداری جو چار بیٹیوں کی خاطر مجبور اور زور بنانے کی تنگ دود میں معروف تھیں، پریشان ہو کے رہ گئیں۔

اور یہ میری عمر کا بارہواں سال تھا۔

”بچ کہہ رہے ہو، اللہ کی کو اولاد کا دکھ نہ دے۔ کیا گزرتی ہوگی ماں بہنوں پہ کہ اکلوتا بھائی اور بیٹا..... چہ چہ.....“

مختلف لوگوں سے آتے جاتے یہ باتیں سنتے ہوئے ایک بار پھر میرا اپنی ذات پہ سے اعتماد اٹاؤ اول ہونے لگا۔ اسکول میں اپنی قابلیت اور ذہانت کے بدلے سستی گئی واہ واہ اور تعریف و توصیف نہ دے دھکولے گئے گئے۔ کانوں میں بس ان لوگوں کے فقرے ہی گونجتے رہے۔

”بے چارہ..... بد نصیب، اولاد کا دکھ، بڑھاپے کا سہارا وغیرہ وغیرہ.....“

”نہیں بے کار ہے یہ ساری محنت بالکل اسی طرح جیسے یہ علاج بے کار ہے۔ میں جتنا مرضی پڑھ لکھ باذن، کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ بن جاؤں، وہ کچھ مجھ ہی ہے..... اس ہونے پہ..... اس شکستے بیٹے پھر نہیں کر سکتے۔ میں اس دنیا میں اپنے ماں باپ کو صرف دکھ دینے کے لیے آیا ہوں۔“

پہلی بار میں نے یہ بات سوچی..... اور ایسا سوچتے ہوئے میں اس چمک کو بالکل فراموش کر گیا، جو میری کامیابی یا بے کس کے چہرے پہ نظر آتی تھی۔

ایسا سوچتے ہوئے مجھے وہ غصہ بھرا نور بھی یاد نہ رہا جو اب کی آنکھوں میں میری پیشانی چومتے ہوئے اتر آتا تھا۔

ایسا سوچتے ہوئے میرے ذہن سے وہ ٹھٹھک بھی نکل گئی جو میری بہنوں کے لہجہ میں تب بخ لگتی تھی جب وہ مجھے ”میرا رعبہ بھیا“ کہہ کر پکارتی تھیں۔

مجھے کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ میں بے کار ہوں..... ایک نامکمل عیب دار وجود لے کر اس دنیا میں آیا ہوں۔

☆=====☆=====☆

اور یہ میری عمر کا بیسواں سال ہے۔

نشین اناج سے نکل کر گچھو رانج کی جانب پہلا قدم۔

یہ الگ بات کہ میں شعور کی اس منزل پہ کئی سال پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ شعور سے آگہی تک کی کئی منزلیں میں نے وقت سے پہلے ہی طے کر لی تھیں۔

میری تمام تر ذہانت کے باوجود کبھی کبھار صرف میرے قدر کی وجہ سے ملنے والی ناقدری اب بھی میری آنکھیں غم کر دیتی مگر اب میں اسنو پہنچا گیا سمجھتا تھا۔ ویسے بھی کالج کا ماحول، اسکول اور محلے کی نسبت کم تکلیف دہ تھا۔ اکثر کلاس ٹیوٹر مجھ سے دوستی کرنے سے کتراتے

ضرور تھے مگر یہاں کوئی سرعام میرا مذاق اڑانے والا نہ تھا۔ اس کالج میں کواکجو کش تھی۔ ایک سے ایک شرخ و چٹیل لڑکی اور ایک سے بڑھ کے ایک ذہین اور بروڈ لڑکا۔ مگر اچھے گھرانوں سے تعلق رکھنے والے یہ تعلیم یافتہ سب سے بڑے نوجوان بھیلے دل سے مجھے اپنے جیسا تسلیم نہ کرتے ہوں، خود کو میری دوستی کے لیے آمادہ نہ کر پاتے ہوں مگر اس کے باوجود وہ حکم کھلا میری تھیک نہیں کرتے تھے۔ مجھ پہ پھبتیاں نہیں کہتے تھے۔ میرے لیے کم از کم یہی امر باعث اطمینان تھا اور یہ اطمینان مجھے یکسوئی سے تعلیم کی جانب توجہ دینے میں خاصا معاون ثابت ہوا تھا۔ ویسے بھی تعلیم کے علاوہ میری اور کوئی دلچسپی یا سرگرمی تھی بھی نہیں۔ کتابیں، کتابیں اور صرف کتابیں، بچپن کے تلخ واقعات کے بعد میں نے غیر انصافی سرگرمیوں میں حصہ لینے کی دوبارہ پھر کبھی کوشش تک نہیں کی۔ دوست بھی ایسے خاص نہ تھے، کالج میں بہت سے لڑکوں کی بہت سی لڑکیوں سے دوستی تھی۔ یونیورسٹی کے دوران دوست مل کے کسی نہ کسی نام سے جب کسی کو چھپرتے تو اس کے چہرے پہ جھینپا جھینپا سا خوشگوار اثر مجھے حیران کر جاتا۔ میں سوچتا کیا یہ جذبہ اتنا پُرکشش ہے؟ کسی لڑکے لڑکی کو درخت کے سائے تلے بیٹھ پہ بیٹھے سرگوشیوں میں گفتگو کرتے دیکھنا یا پھر کینٹین میں آنے سائے بیٹھے بولتی آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھنا مجھے اچھا لگتا تھا، پتہ نہیں کیوں؟

اپنی عمر کے حساب سے فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق میں بھی منصف مخالف میں ایک کشش محسوس کرنے لگا تھا۔ خوب صورت، شوخ لڑکیوں کی ادائیں مجھے اپنی جانب جھینپتی تھیں مگر میں اپنی اوقات جانتا تھا۔ کبھی اتنے حد حرارت ہی نہیں کی جس کے نتیجے میں سر عام گالیاں پڑتیں۔ مجھے ذہنی نہیں پورا یقین تھا کہ اگر میں کسی عام سی صورت..... یا بالکل گلی گزری شکل والی لڑکی سے بھی اظہار محبت یا دوستی کی خواہش کا اظہار کر بیٹھتا تو اس کا رد عمل کیا ہوگا۔ دل کی دل میں دباے رکھنا وہ ہنرتھا جس میں، میں اب طاق ہو چکا تھا۔

صالحہ باجی سالوں بعد کویت سے آئی تھیں۔ خدیجہ باجی تو خیر نہیں لاہور میں ہوتی تھیں۔ فاطمہ اور میری بھی تعلیم مکمل کر چکی تھیں۔ فاطمہ تیس سال کی اور مریم ایکس سال کی تھی۔ دونوں کے لیے رشتے تلاش کیے جا رہے تھے۔ ورنہ ہمارے ہاں خاندان میں ہی رشتے ناتے طے کرنے کو اویرت دی جاتی تھی۔ صالحہ باجی کے آنے کے بعد یہ ہم زیادہ زور و شور مچا گئی۔ وہ چاہتی تھی کہ ان کے پاکستان میں اس چارہ مار کے قیام کے دوران ہی دونوں بہنوں کی شادیاں ہو جائیں۔

”بار بار کویت سے آنا مشکل ہے۔ ماشاء اللہ بچے اب اسکول جاتے ہیں، پھر سعید کو

ابھی اکیلے رہنے سے مست ہوتا ہے اور سب سے بڑی بات نکلوں کا خرچہ کون سا کم ہے۔ میری تو پوری کوشش ہے دونوں کی شادی میرے رہتے ہوئے ہو جائے تاہم اگر کم ایک کی شادی، دوسری کی تکلیفی ہی ہو جائے اس کے بعد ان شاء اللہ پانچ سال بعد آؤں گی جب اپنے سونے بھیا کے سر پہ سہرا باندھ گا۔“

بیس سال کی عمر میں اپنی شادی کا تذکرہ سننا ایسی انتہائی بات نہیں تھی کہ میں اس بری طرح چونکتا..... میں نے یقینی سے انہیں دیکھنے لگا۔ یہ بات کسی اور نے کہی ہوئی تو میں سوچتا کہ میرا مذاق اڑایا گیا ہے مگر یہ بات کسی اور نے نہیں، میری پیاری باجی صالہ نے کہی تھی۔

میں نے ان کا چہرہ کھو جتا پایا۔ وہاں صرف ارمانوں کی الوہی چمک تھی اور وہی پیار وہی لاڈ جو بچپن سے مجھے ان سے ملتا رہا تھا۔

”پانچ سال بعد کیوں؟“ چار سالہ بیٹو نے سوال کیا۔

”ماموں کی شادی بھی ابھی کرتے ہیں ماما۔“

”نہیں پاپل، ابھی ماموں چھوٹے ہیں، ابھی ان کی شادی کیسے ہو سکتی ہے۔“ چھ سالہ ننھی نے اپنے تئیں بڑی سمجھداری سے بھائی کو سمجھانا چاہا۔ یقیناً اس کا مطلب وہ نہیں تھا جو مجھے لگا اور ایسا بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر میں پوچھیں کیوں اس کے منہ سے یہ فقرہ سن کے قہقہے ہو گیا۔ چپکے سے کمرے سے نکلے ہوئے میں نے ہنوکا سوال سنا۔ اب وہ پوچھ رہا تھا۔

”ماما! تو کیا پانچ سال بعد ماموں بڑے ہو جائیں گے۔ شان کے ماموں جیسے؟“

پتا نہیں باجی نے کیا جواب دیا ہوگا۔ نہ میں نے سنا نہ ہی میں سننا چاہتا تھا۔

☆=====☆

اس دن میں کالج سے واپس آیا تو صالہ باجی نے مجھے ایک لمبی لسٹ پکڑادی۔

”جاؤ نیکری سے یہ سب چیزیں لے کر آؤ۔ کباب، چائٹ اور حلوہ میں نے گھر پہ ہی تیار کر لیا ہے۔ خدیجہ بیچتی بیچتی سے آئی ہوئی ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ مریم یا فاطمہ کے رشتے کے لیے پھر سے کوئی آرہا ہے مگر غیر معمولی اہتمام نے مجھے چونکا دیا۔

”کیا کوئی خاص مہمان ہے؟“

”ہاں بھیل اتوار کو تم گھر نہیں تھے تب جو لوگ فاطمہ کو پسند کر گئے تھے، وہی دوبارہ آ رہے ہیں۔ پرسوں، میں بھی امی اور ابو کے ساتھ لاکھ لاکھ آئی تھی۔ اچھا خاصا ہے، دیکھنے میں بھی اور کماتا بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ لوگ بھی شریف اور خاندانی ہیں کل ہم نے بھی فون کر

کے پسندیدگی ظاہر کردی۔ آج باضابطہ ہاں ہوگی، تم سامان لا کر پھر سے کھسک نہ جانا۔ بچے نہیں رہے اب، اکلوتے بھائی ہو، اس موقع پہ تمہارا ہونا ضروری ہے۔“

میں نیکری سے تاشے کا سامان لا کر دینے کے بعد نہانے چلا گیا۔ باجی نے سختی سے تاکید نہ کی ہوتی تو میرا کوئی ارادہ نہ تھا انجانے مہمانوں کے سامنے جانے کا۔ میں تو رشتے داروں تک سے ملنے سے احتراز ہی کیا کرتا، اجنبی لوگوں کے سامنے تو ویسے بھی جلد گھبرا جاتا تھا۔ میں نے جان بوجھ کر نہانے اور تیار ہونے میں خاصی دیر لگائی۔ میں شیو کر رہا تھا کہ مہمان آگئے پھر مجھی میں اطمینان سے شیو کر رہا تھا۔ یہ واحد عمل تھا جسے میں پوری دلچسپی کے ساتھ کیا کرتا۔ شاید اس سے میری نفسیاتی تسکین ہوتی ہو۔

آخر شیو لگانے کے بعد میں نے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے اپنا جائزہ لیا نہانے دھونے اور رگڑ کے شیو کرنے کے بعد میری سانولی رنگت خاصی صاف لگ رہی تھی۔ پورے چہرے پہ پچھلی آنکھیں ہمیشہ کی طرح مجھے سخت بری لگیں۔ شاید آنکھیں اتنی بڑی نہیں تھیں، جتنا چہرہ ضرورت سے زیادہ چھوٹا ہونے کی وجہ سے بڑی لگتیں۔ چپکے ہوئے گال، نوکدار ہنھوڑی، و رخساروں کی نمایاں ہوتی بڈی، ابھری ہوئی کاربون اور چارفٹ ڈیزھانچ قد کے ساتھ میں ہرگز اتنا بااعتماد نہ تھا کہ مہمانوں کے سامنے جا سکتا مگر مجھے جانا پڑا کلف لگا کر کڑا تا سفید شلوار قمیض پہن کے، سیلف سے بال جما کے میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور مہمانوں کو موزڈ سلیمانہ کیا۔ وہ چند گھنٹوں میں چند مرد تھے..... میری آنکھیں ایک بار سرسری سامنے کے بعد جھک گئی تھیں۔ میں سامنے والوں کی نگاہوں میں پھیلے تاثرات سے انجان رہتا چاہتا تھا ان نگاہوں میں کیا تھا۔

حیرت، استعجاب۔

ترجم، بہمردی۔

”یہ میرا بیٹا ہے، سہام رضا سب سے چھوٹا اور اکلوتا۔“ ابو جی نے تعارف کرایا۔

”ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔“

نہ جانے کیوں آج مجھے ابو جی کے لہجے کا فخر اور مان بھی کھوکھلا اُٹھوس ہوا رہا تھا۔

”کون سی کلاس میں پڑھتے ہو بیٹا؟“

چند نہیں یہ سوال کس نے کیا تھا مگر جس نے بھی کیا تھا اپنی الجھن دور کرنے کے لیے کیا ہوگا۔ میرے بارہ سالہ سالہ بچے کے برابر قد، نحیف و نزار وجود پہ اسے کچھ اور گمان گزرا ہو گا مگر میرے چہرے نے اسے کسی اور شک میں مبتلا کیا ہوگا۔

کہ پہلے جس رشتے میں باہمی نے پنڈو ہونے کا عیب نہایتا تھا، اب اس نئے رشتے میں بھی وہی خوبی پائی جاتی تھی لیکن اب دیہاتی پس منظر رکھنے والے اس گھرانے کے پنڈو پن کو سادگی سے تعبیر کر کے مگن کا گنے چارے تھے۔ نوید بھائی کے والدین اگرچہ زمیندار تھے اور سیدھے سادے دیہاتی لوگ تھے لیکن وہ خود مناسب حد تک تعلیم یافتہ تھے، خاصے سلجھے ہوئے اور چلنے ہوئے کاروبار کے مالک تھے۔ حیرت انگیز طور پر ان لوگوں کے لیے میرا قد بھی کوئی مسئلہ نہ بنالکہ انہوں نے میری گر بجو بیٹ، سلیقہ مند سکھڑ اور خوب صورت بہن فاطمہ کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

اس کا گھر اچھی طرح بس جانے کی طمانیت نے مجھے اس سے نظریں ملانے کے قابل ضرور کر دیا، لیکن میں اپنے دل سے ذلت کا وہ احساس نہ نکال پایا جو اس ایک لمحے میں مجھے اپنے ہی گھر والوں کے سامنے کم مایہ کر گیا تھا۔

☆=====☆=====☆

اور یہ میری عمر کا پچیسواں سال ہے۔

ایم جی اے کرنے کے بعد پچھلے ایک سال سے میں اچھی ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہوں مگر اچھی تو کیا گزارے لائق چاہ بھی نہیں ملی۔ میں جانتا تھا یہ ایک سال تو کچھ بھی نہیں، لوگ ملازمت تلاش کرنے میں جو تیاں چٹائی ہی کرتے ہیں، کئی کئی سال ہاتھ میرا رتے ہیں لیکن میں ایک سال سے بھی کم عرصے میں بہت بار بیٹھا۔ بہت بندھائے رکھنے کے لیے میرے پاس کوئی وجہ بھی تو نہیں تھی۔ میری راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ میرا چارنٹ ڈیڑھ اونچ تھا۔ جس کے بڑھنے کا اب نہ کوئی امکان تھا نہ امید۔ میں جہاں بھی انٹرویو کے لیے گیا، کہیں مناسب الفاظ میں معقول جواز بتا کر اور کہیں صاف گوئی کی انتہا کرتے ہوئے واضح انداز میں میری کوتاہی قاضی کی وجہ سے مجھے ملازمت کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا۔

میں جب بھی کہیں انٹرویو دے کے واپس آتا، ابوجی کے چہرے پہ لاکھوں سوال، ہزاروں امیدیں ہوتیں، میں ان امیدوں، ان سوالوں کو دیکھ کر سر جھکا لیتا اور وہ میرے جھکے ہوئے سر اور نیچے ہوئے چہرے پہ پڑتے ہزاروں جوابوں اور لاتعداد ناامیدیوں کو دیکھ کے نظریں جھکا دیتے، ویسے بھی اب وہ بہت بیمار بنے چکے تھے۔ ان کی سانس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔ اب تو انہوں نے مجھ سے اپنے ان خوابوں کا تذکرہ تا بھی رفتہ رفتہ کم کر دیا تھا جو بچپن سے وہ ایک قوتِ اثر کے ساتھ کرتے آ رہے تھے مجھے زندگی میں کسی ایام اور اونچے مقام پہ فائز

”جی، جی، کام کر رہا ہوں۔“
میرے جواب سے یقیناً اس کا شک یقین میں بدل گیا۔ چند لمحوں کے لیے ہر طرف خاموشی چھا گئی۔

”آپ یہ سوسے لیجئے نا غصہ سے ہو رہے ہیں۔“
”یہ طوہ فاطمہ نے خود بتایا ہے۔ بڑا ذائقہ ہے اس کے ہاتھ میں۔“
”آپ کے لیے چائے اور ککالوں؟“
ان کی معنی خیز خاموشی کا تاثر زائل کرنے کے لیے دونوں باجیاں مہمان نوازی میں جست گئیں۔

”آپ کے خاندان میں ایسے اور بھی کیس ہیں؟“ کافی دیر بعد وہی آواز دوبارہ سنائی دی۔

”جی، کیا مطلب؟“ حالانکہ ابوجی مطلب تو سمجھ گئے تھے۔
”میرا مطلب ہے، یہ آپ کا خاندانی مرض ہے؟ کیونکہ آپ کا کہنا ہے کہ آپ کے ہاں زیادہ تر شادیاں خاندان میں ہی ہوتی ہیں۔“
”جی..... ایسی تو کوئی بات نہیں یہ مرض میرا مطلب۔“

میں خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ جانتا تھا میرے سامنے ابوجی اس مرض کو مرض کہنے میں دقت محسوس کر رہے تھے۔ میرے ہاں سے جانے کے بعد کیا ہوا یہ تو نہیں پتہ۔ مگر یہ رشتہ ہوتے ہوئے رہ گیا۔ باجی نے وجہ یہ بتائی۔

”بڑے لاپرواہی لوگ تھے، کا بھی معمولی سا تعلیم یافتہ تھا۔ خالی پیسے کو کیا کرتا ہے۔ چار لوگوں میں انھیں پیسے کے قابل تو ہو بندہ۔ ہونہر پنڈو و جاہل لوگ۔“
میں کہہ نہ سکا کہ کل تک جو لوگ خاندانی، شریف اور سلجھے ہوئے تھے، یکا یک جاہل پنڈو اور لاپرواہی کیسے ہو گئے۔ کیا صرف اس لیے کہ وہ ایسے گھر کی لڑکی کو بہو بنا کر اپنی نسل خراب نہیں کرنا چاہتے، جس کا سا بھائی بھٹنے پن کی بیماری میں مبتلا ہے۔

مجھے اپنا آپ بزم سا گنتے لگا۔ کئی روز تک میں فاطمہ کے سامنے جانے کی ہمت نہ کر سکا، حالانکہ اس نے اور باجی سب ہی نے مجھے کسی طور پر احساس دلانے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش نہیں کہ کر ان حالات کا ڈر مدار میں ہوں مگر میں اتنا ہی حس نہ تھا۔

شاہد میرا یہ احساس جرمِ جہودن اور ہتہا کر صالحی باجی کی بھگاد دوڑ رنگ لائی۔ فاطمہ کا رشتہ بہت اچھی جگہ طے ہو گیا۔ اب بار براہ راست شادی ہی مقرر ہوئی۔ حیرت کا مقام یہ تھا

دیکھنے کا خواب۔ مجھے ایک بڑا آدمی بتانے کا خواب۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھ سے اپنے خواب چمپاتے چمپاتے وہ خود بھی کہیں چھپ گئے، اپنے خوابوں کے ساتھ ہی یہ دنیا بھی چھوڑ گئے۔ باپ کے سامنے سے عروسی..... اور وہ بھی ایسے شفیق باپ کا سا۔ جو بچپن میں انگی پکڑ کے چلنا سکھانے کے بعد بھی بچپن کی سبک دہر قدم پہ مجھے حوصلہ دیتا رہا، میرے اندر مرنی ہوئی ہمت اور امید کو نئے نئے حروبوں سے زندہ کرنے کی اپنی سی کوششیں کرتا رہا، ایسے باپ کے سامنے سے محرم ہونا یک نکتہ خنڈے بادلوں کی چھاؤں سے پتے سورج کے نیچے آنے کے مترادف تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں بھرے کیلے میں تنہا ہو گیا ہوں، کسی چھوٹے سے بچے کی طرح ہراساں، وحشت زدہ.....

لیکن بعد میں گزرتے دنوں نے مجھے احساس دلایا کہ واقعی اللہ کا کوئی کام مصلحت سے عاری نہیں ہوتا۔ شاید ان کے جانے میں ہی بہتری تھی۔ وہ جب تک زندہ رہے، پھلے میں ان کے خواب پورے نہ کر سکا۔ ان خوابوں کو تو زمینی نہ پایا لیکن اگر وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو انہی خوابوں کی کوئی کرپاں انہیں بولہبان کر دیتیں۔ ساری عرول میں اسے اٹھاتے بیٹے کے حوالے سے اتنے بلند اور اونچے خواب دیکھنے والے میرے ابو جی کیسے برداشت کر پاتے کہ ان کا ہونہار، ذہین و فطین، لائق فائق، اسکول سے لے کر کالج اور یونیورسٹی تک میں پوزیشن لینے والا اور ایم بی اے کی ڈگری رکھنے والا بیٹا ان کے اسٹور پہ ان کی جگہ بیٹھ کر سودا تول تول کر بیچے گا۔

ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ ابو کی زندگی میں ہی ان کی بیماری کی وجہ سے گھر کے حالات پر اثر پڑنا شروع ہو گیا تھا کیونکہ ہفتے کے تین سے چار دن تو اسٹور بند ہی رہا کرتا، جو دو تین دن کھلتا بھی تو اب ابو جی باقاعدگی سے سامان لا کر ڈالنے کے قابل نہ رہے تھے۔

ابو جی نے دیانت داری کو ہمیشہ اولیت دی، معیار کا عمدہ ہونا اور قیمتیں مناسب ہونا بھی اس کے چلنے کی اہم وجہ تھی۔ اسی معمولی سے پان سکرپٹ کے کھوکے سے ترقی کرتے کرتے اچھے خاصے معیاری جنرل اسٹور کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کی آمدنی سے ابو جی نے یہ ذاتی کشادہ مکان تعمیر کیا۔ میری تعلیم مکمل کرانی، میری تین بہنیں باعزت طریقے سے بیاہیں، لیکن اب ان کی بیماری کی وجہ سے اسی رزق کی برکت میں کمی ہو گئی۔ آخری دنوں میں ان کے علاج پہ باقی جمع شدہ رقم بھی لگ گئی۔ چند دن سوگ میں ہی دکان بند رہی اور جب ابی نے مجھ سے کہا۔

”گھر کا راشن ختم ہو گیا ہے۔ آجاتا بھی لگا رہتا ہے۔ جب تک چالیسواں نہیں ہوتا،“

افسوس اور ترحیت کے لیے لوگ آتے ہی رہیں گے۔ ایسا کرو، دکان کی چابیاں لو، ایک گھی کا ڈبہ، آنے کا تھیلہ، ساری دالوں کا ایک ایک گلو کا پیکٹ اور کچھ صابن، صرف وغیرہ لے آؤ۔ گھر میں ضرورت ہے۔“

میں نے چابیاں ان کے ہاتھ سے لے لیں اور غائب و دماغی سے ان کی ہدایت پہ عمل کرتے ہوئے اسٹور کے تالے کو کھولے گا۔ شرٹھا کے اندواہل ہونے کے بعد جب میں نے ان کا مصلوبہ سامان اٹھا کر تاپا تو میری ساری غائب و دماغی ہیک سے اڑ گئی۔ اسٹور میں فقط اتنا سامان تھا جتنا کہ صرف ہمارے گھر کے راشن کے لیے تین چار یا زیادہ سچہ ماہ تک چل سکتا تھا، بچنے کی نوبت تو بہت دور کی بات تھی جبکہ ایک ارادہ تھا کہ میں ادھر ادھر سے دیکھ بھال کے کوئی قابل بھروسہ آدمی رکھ لوں، اسٹور چلانے کے لیے تاکہ وہ ایک گھی بندھی تنخواہ کے بدلے اس کا ردیوار چکاری رکھ سکے۔

میں نے تھیلے میں سب ہی دالوں، نمک، مرچ اور چاول وغیرہ کے پیکٹ ڈالے۔ گھی کا ڈبہ آئے کا تھیلہ مونڈ سائیکل کے پیچھے باندھا۔

”اس مینے کا گزرا تو ہوا جانے گا، اور اس سے اگلے مینے کا بھی..... شاید اس سے اگلے مینے کا بھی آسانی سے..... مگر کیا گھر کا خرچ صرف آئے گھی اور دالوں تک محدود ہے؟ بجلی، پانی اور گیس کے بل، امی کی دو تین اور سب سے بڑھ کر مریم، جس کی منگنی دیر ہوا سال پہلے سالہ باجی کے سرال میں ہو چکی تھی اور اگلے مینے اس کی شادی طے تھی۔ اگرچہ ابو جی کی وفات کی وجہ سے خود بخود یہ شادی کچھ عرصے کے لیے ملتوی ہو گئی تھی مگر کب تک؟ کچھ ماہ بعد وہ لوگ دوبارہ تاریخ مانگتے آئیں گے بے شک امی نے اس کے لیے زہر، کرکری اور ضروری الیکٹریک کا سامان جوڑ رکھا تھا، ابو جی نے ایڈوائس دے کر فرنیچر کا بھی آرڈر رکھا تھا لیکن شادی کی تقریب کے اور بھی خرچے ہوتے ہیں۔ ان چندہ چندہ انتظامات کے بعد بھی مجھے کم از کم ایک لاکھ تو چاہئے تھا اس کو رخصت کرنے کے لیے۔

گھر بچپنے میں ہی سے سودا امی کے حوالے کرتے ہوئے اپنا فیصلہ بھی سنا دیا، جو جلدی میں تو کیا گیا تھا مگر بروقت بھی تھا۔

”ابو جی کے اکاؤنٹ میں اندازاً کتنی رقم ہوگی؟“

”تمہیں بھرتا چا گو بیٹا! میں بھلا یہ سب کیا جانوں۔“ میں ان کی الماری سے چند کاغذات نکال لایا۔

”ایک لاکھ بچیں جڑا۔“ میں نے انہیں بتایا۔ ”مریم کی شادی کرنے کے بعد ان میں

سے شاید میں باتیں بزار بج جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کی شادی ہونے تک ہم گھر بیٹھے ان بیسوں میں سے آسے سے زیادہ خرچ کر ڈالیں۔“

”لیکن ہم کیوں خرچ کریں گے بھلا یہ تو مریم کا حق ہے۔ اس کی امانت ہے، اس کا باپ اس کے نام سے رکھ گیا ہے۔ اللہ بیٹھے جاتے جاتے اپنی اس آخری ذمہ داری سے بھی منہ موڑا۔ یہ سوالا کھڑے بھی پڑے نہیں کس مشکل سے بچایا ہوگا ورنہ پچھلے کچھ سالوں سے سارا جمع جھٹھا تو اس دکان کو خریدنے پہ لگا دیا۔“

”یہ بھی ابو بکی کی دوراندیشی تھی اسی! مگر بیٹھے تو خزانے ختم ہو جایا کرتے ہیں۔ اچھا کیا جو انہوں نے اپنی جمع شدہ رقم کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا۔ آج مکان کے ساتھ ساتھ وہ دکان بھی ہماری ذاتی ہے۔ ورنہ میں تو ناجر بے کار ہوں، نہ جانے اسٹور اچھی طرح چلا پاؤں یا نہیں؟ شروع شروع میں شاید اتنی آمدنی نہ ہو، ایسے میں اگر اسٹور کا ماہانہ کرایہ بھی بھرنا پڑتا تو کتنی مشکل ہوتی۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ انہوں نے سر ہلا کے تائید کی پھر جیسے بری طرح چونکیں۔

”تو اسٹور چلائے گا؟ وہاں بیٹھے گا؟..... مگر کس لیے؟ میں نے کہا تو ہے کسی بندے کا انتظام۔“

”قابل بھروسہ آدمی کہاں سے ڈھونڈوں۔“ میں نے ان کی بات کاٹی۔ ”اور پھر وہ آدمی قابل بھروسہ ہو یا بے اعتبار، تنخواہ تو مانگے گا۔ مکمل طور پہ کا دو بار کسی انجان شخص کے سپرد کر دینا اور بات ہے۔ میں کوئی لڑکا رکھ لوں گا اسی محلے کا اور پھر اسی میں فارغ بھی تو ہوتا ہوں۔“ آخری فقرہ کہتے کہتے میرا لہجہ پست ہو گیا۔ وہ کتنی دیر چپ رہیں۔ میں نے نظریں اٹھا کے دیکھا۔ وہ چادر کے پلو سے اپنی نم آنکھیں رگڑ رہی تھیں۔

”یہ بہت ضروری ہے امی! انی الحال ہمارے پاس آمدنی کا یہ واحد ذریعہ ہے اپنے ہاتھوں اسے کیسے برباد ہونے دوں۔ اسی اسٹور کی کمائی سے یہ گھر بنا، آپ کی اولاد پر بھی، کیا برائی ہے یہاں بیٹھے میں؟ آپ نگر نہ کریں، میں ساتھ ساتھ ملازمت کی تلاش جاری رکھوں گا۔“ میں نے شخص ان کو دل سادینے کی غرض سے کہا۔

”بس آپ اتنی اجازت دیں کہ ان دوپلوں میں سے میں پچاس ہزار نکال لوں اسٹور تقریباً خالی پڑا ہے مجھے سامان ڈالنا ہے۔ ابھی کم از کم چھ سات مہینے تک تو مریم کے سسرال والے تاریخ نہیں مانگیں گے۔ جب تک میں انشاء اللہ پچاس کے بجائے ستراسی ہزار روپوں بینک میں رکھ دوں گا۔“

میں واقعی نا تجرب کار تھا۔ ابو بکی کے قریبی دوست انکل غفار جو اس پیشے سے وابستہ تھے، ان کے ساتھ میں ہول سیل مارکیٹ خریداری کے لیے گیا تو سامان بے شک پورا ہو گیا لیکن پچاس ہزار چند ہی دن میں ہاتھ سے نکل گئے۔ جبکہ میں نے اسٹور کے لیے اور بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ امی سے تذکرہ کیا تو انہوں نے اپنا باقی ماندہ زور مجھے تھا دیا۔

☆☆=====☆☆

اس دن مریم کو رخصت ہوئے صرف تین دن گزرے تھے۔ خدیجہ باجی اور فاطمہ ابھی تکیں تھیں۔ سالہا باجی چونکہ چھ ماہ پہلے ہی ابو بکی کی وفات پہ آئی تھیں اس لیے مریم کی شادی میں شرکت نہ کر سکیں۔ ویسے بھی مریم کچھ بیٹھے بعد شوہر کے ساتھ کویت ہی جانے والی تھی۔ خدیجہ باجی اور فاطمہ بھی جانے کی تیاری میں تھیں، جب امی نے ایک عجیب سی بات کی جو شاید اتنی عجیب برکزرت تھی جتنی کہ مجھے لگی۔

”اسنے آرام سے نہ بیٹھو ساری کی ساری۔“ انہوں نے بیٹیوں کو ڈپٹے ہوئے کہا جس میں پیار کے ساتھ ساتھ ایک فرمائش کی تمہید بھی تھی۔

”چتا بھی سے کراب میں کتنی اکیلی رہ گئی ہوں۔ ساری ساری چیزیاں اڑ گئیں اس آنگن سے۔ ایک تو پہلے ہی پردہ سن بھی اب دوسری کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔ کچھ میرے بارے میں بھی سوچا۔“

”تو امی! اہم دونوں تو ہیں نا آتی جاتی رہتی ہیں آپ کے پاس بلکہ مریم کے جانے کے بعد اب خیال رکھوں گی کہ ہر دفعہ کم از کم ایک رات ضرور رہنے کے لیے آؤں۔“ فاطمہ نے ان کے ہاتھ تھام کے وعدہ کیا۔

”اللہ تم دونوں کو اپنے اپنے گھر اور بال بچوں کے ساتھ بے انتہا سبابت آباد رکھے۔ کب تک اپنے گھر کے کام دھندے سے چھوڑ کے مجھے دیکھنے آئی رہو گی۔“

”ہاں فاطمہ کو مسئلہ ہو سکتا ہے مگر مجھے تو نہیں۔“

صالہ باجی نے کھول کھلی ہی بتائی جس کے کہا۔ شادی کے اتنے سال بعد بھی وہ ہنوز اولاد کی نعمت سے محروم تھیں۔ پھر اپنی ادا اس آنکھوں کے نم گوشے بے دردی سے رگڑتے ہوئے انہوں نے ایک تباہی شورہ دیا۔

”یا پھر مستقل بندوبست تو آپ کی تنہائی کا بھی ہو سکتا ہے کہ آپ اب بھولے ہی آئیں۔ یہ والی بیٹی مستقل بنیادوں پہ آئے گی یعنی اس کے اُڑ کے جانے کا بھی کوئی خطرہ یا امکان نہیں رہے گا۔ کیوں سہام! تمہارا کیا خیال ہے؟“

ان کے براہ راست مجھ سے پوچھنے میں بڑا گیا۔ امی البتہ نہال ہو گئیں۔
 ”یہ کی تا میرے دل کی بات۔ یہی تو میں چاہتی ہوں۔ بجائے میرے گھر کے پکر لگانے کے، میرا خیال رکھنے والی اور اس سونے گھر کو آباد کرنے والی کی تلاش کرو۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی۔“

”ارے کہاں امی! ابھی سہام کی عمر ہی کیا ہے۔ اب تو لڑکے تیس تیس سال کی عمر تک شادی کا سوچتے تک نہیں۔ وہ ابھی کچھ ماہ پہلے تو بچپن کا ہوا ہے۔ آپ فکر نہ کریں، ہم ابھی سے تلاش شروع کر دیتے ہیں۔“
 ”کہہیں نہ کہیں سے کوئی عقل کی اندھی مل جائے۔“ میں نے جل کے ان کی بات مکمل کی۔

”یا پھر کوئی ایسے لاچار قسم کے ماں باپ جن کے سر پہ ان کی بیٹی اتنی بھاری ہو کہ وہ اسے اتار کے کہیں بھی بھیج دیتے ہوں۔“
 ”کیوں کرتے ہو ایسی باتیں؟“ باجی جھگڑ گئیں۔

”اچھا چھوڑی باجی!“ فاطمہ نے موضوع کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی۔
 ”گلتا ہے سہام کو پسند نہیں کہ ہم اس کے لیے لڑکی تلاش کریں ہو سکتا ہے وہ یہ کام خود انجام دینا چاہتا ہو یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسا ہو کر چکا ہو، کیوں؟“ اس نے شرارت سے مجھے دیکھا۔ میں اور میری گڑبڑا سا گیا۔ امی نے لاڈ سے میرا سر اپنے سینے سے لگالیا۔
 ”جمل ہل شریف، مذاق نہ کر۔ میرا ایسا نہیں، اتنا شریف بچہ ہے میرا۔ بچال ہے جو کبھی آنکھ اٹھا کے کسی لڑکی کی جانب دیکھا ہو۔“

”اوہو، کسی کو پسند کرنے سے شرافت پہ بھلا کون سار فہ آجاتا ہے۔ اگر اس کی کوئی پسند ہے تو اس میں حرج کیا ہے امی۔“

”مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جیسے میرا بیٹا راضی، میں اسی پر خوش۔“ امی نے مجھے کرید لیا۔ ”بول رہا شریف! اتنی نظر میں سے کوئی؟“

”نظر میں؟“ اچانک بلا ارادہ بن بلائے ہی ایک چہرہ نظر میں آ گیا۔ میں نے گھبرا کے سر جھٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

”نہیں۔“ میں سختی سے کہتا اپنے کمرے میں چلا گیا مگر نہیں، جنس کی ٹکرا رہی نظروں سے اس چہرے کو ہٹا نہ سکی۔ تنگ آ کے میں نے آنکھیں موند لیں مگر اب وہ چہرہ پوری طرح مجھ پہ حاوی ہو گیا۔

یہ چہرہ ندا کا تھا۔

ندا ہمارے گھر سے صرف چار گھر چھوڑ کے اوپر والے پورشن میں آئے نئے کرائے دار ملک صاحب کے سات بچوں میں سے ایک تھی، یہ علاقہ متوسط طبقے کے رہائشی لوگوں پر مشتمل تھا۔ جن میں چند خوشحال کھاتے پیٹے گھرانے بھی تھے اور چند سفید پوش بھی، لیکن ایک بات جو کبھی گھرانوں کے رہن سہن میں مشترک تھی وہ سادگی اور درویشی طرز زندگی تھا۔ ملک صاحب کو اس محلے میں آئے سال سے اوپر نہ ہوا تھا۔ وہ کسی نیم سرکاری ادارے میں ملازم تھے، ایک پرانی سی اسکول پر آتے جاتے تھے۔ سات بچوں کے ساتھ اس مہنگائی کے دور میں کرائے کے مکان میں کیسے گزارا کرتے تھے اس کا اندازہ ان کو اور ان کے بچوں کو دیکھ کے بخوبی ہو جاتا تھا۔ ندا سب سے بڑی تھی، عمر بچی کوئی اٹھارہ انیس برس رہی ہوگی، اس کے بعد اوپر تلے کے چار لڑکے تھے جن میں سب سے بڑا پندرہ سال لڑکا تو کسی فرینج اور اسی کی سروں کرنے والے درکشاپ میں کام کرتا تھا جبکہ چھوٹے تینوں اسکول جاتے تھے۔ ان سے چھوٹی دو بچیاں، جن میں سے ایک کی انگلی تھامے اور دوسری کو گود میں اٹھائے ندا میرے اسٹور پہ سودا سلف لینے آیا کرتی۔

وہ واحد لڑکی نہ تھی جو اسٹور پہ خریداری کرنے آتی تھی۔ میری محلے دار خواتین میں سے زیادہ تر شادی شدہ گھریلو یا پھر بڑی عمر کی عورتیں ہوتیں۔ ایسے میں ندا بھی تو عمر، شوخ، بے تکلف اور حسین لڑکی کا بلا ناغہ اور تواتر کے ساتھ یہاں آتا خود بخود مجھے اس کی جانب متوجہ کر گیا۔

وہ بہت عام سی چیزیں لینے آتی اور نہایت کم مقدار میں۔ کبھی ایک گلو آٹا، کبھی آدھ پاؤ مسوری دال، کبھی پاؤ بھر گھی، میں نے اس سے معذرت کی۔

”بی بی! آنے کا سب سے چھوٹا تھیلایا کلو کلا ہے اور دال کے بیکٹ بنا کے رکھے ہیں، سب سے کم وزن کا ایک پاؤ کا ہے ہاں گھی کا پاؤ والا بیکٹ ہے۔“ میں نے اس کے آگے بیکٹ رکھا۔

”مگر میں تو حساب سے پیسے گن کے لائی ہوں۔“

اس نے بے چارگی سے کہا۔ میں نے ایک نظر اس کے پریشان چہرے کو دیکھا اور دوسری نظر اس کا پلہ سمجھتے ہوئے ٹائیوں والے جار کی جانب اسے متوجہ کرتی تین سالہ بیٹی کو دیکھا۔

”کوئی بات نہیں۔ میں لکھ کے رکھ لیٹی ہوں، آپ سامان لے جائیں، باقی پیسے کل

پرسوں آجائیں گے۔ آپ نوید صاحب کے نئے کرائے دار ملک صاحب کے ہاں سے آئی ہیں نا؟“

یہ اس سے گفتگو کا میرا پہلا موقع تھا۔

”ہاں جی، میں ان کی بڑی بیٹی ہوں۔“ اس نے خودی تعارف کرایا۔ ”آپ کا نام کیا ہے؟“

”جی؟“ میں اس سوال پر حیران ہوا۔ میرے لیے اس کی بے تکلفی غیر متوقع تھی۔

”ابو نے پوچھا تو انہیں کیا بتاؤں گی کہ کن صاحب سے ادھار لے کر آئی ہوں۔“

”میرا نام سہام رضا ہے۔ آپ بہت دینے کا گھر رضا پر اسٹور سے کھاتے میں سامان لیا ہے۔ میری آپ کے والد سے ابھی علیک ملے ہوئے ہیں۔“

”چلیں پھر تو مسئلہ نہیں۔“ اس نے بے فکری سے چیکس شاپر میں ڈالنا شروع کیے۔

میں نے جار میں ہاتھ ڈال کے دو ٹائیاں نکالیں اور دونوں بیچوں کو تھما کر۔

”نہیں، یہ رہتے دیں۔“ اس کے منع کرنے پر میں نے زبردستی بچوں کے ہاتھ میں تھما دیں۔

”میں اسٹور پر آنے والے بچوں کو سونپیں دیتا ہی رہتا ہوں۔ یوں سمجھیں یہ میری اسپیشل کسٹمر ڈیپنگ ہے۔“

”آپ اسے تو حساب میں نہیں لکھیں گے؟“ میں نے مسکراہٹ دباتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

”تو پھر مجھے بھی ایک دیں۔“ اس نے اسی بے تکلفی سے اپنی پھٹی آگے کی جوشاید اس کی طبیعت کا خاصہ تھی۔ میں نے سمجھتے ہوئے اس کی گھائی اور شفاف پھٹی پر ایک ٹائی رکھی۔

”تھینک یو۔“ وہ بچوں کی طرح خوش ہوتی واپس پلٹ گئی۔ اس کے بعد یہ اس کا معمول بن گیا۔ وہ جب آتی، پانچ سات منٹ رک کے ادھر اُدھر کی بے مقصد مگر بے ضرری باتیں ضرور کیا کرتی۔ یہ خاصا خشک مزاج اور لیے دیے رہنے والی شخص تھا مگر نہ جانے کیوں اس کی لایا بیانی ہی قدر سے شوق گفتگو مجھے بھانے لگی۔ اس کی کھلی ہوئی مسکراہٹ کی مصومیت مجھے اچھی لگنے لگی۔ اس نے مجھے باتوں ہی باتوں میں اپنے گھر کے کئی چھوٹے بڑے معاملات سے آگاہ کر دیا تھا۔

اس کے والد ایک بھاری قرضے کے جو بھروسے دے ہوئے تھے۔ اس کی والدہ کئی ایک بیمار یوں کا شکار تھیں اور سب سے چھوٹی بیٹی کی پیدائش کے بعد تقریباً دو سال سے بستر پہ تھیں۔

اور گھر کا سارا کام کاج، چھ چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری اس اکیلی چچی۔ پڑھنے کی خواہش رکھنے کے باوجود وہ مشکل میٹرک ہی کر سکی، کیونکہ نہ تو گھر کے حالات نے اجازت دی اور نہ ہی ذمہ داریوں نے۔ بے حد شریر بھائیوں کو سنبھالنے کے ساتھ ساتھ وہ اکیلی سارے گھر کے کام بھی نٹاتی تھی۔ یہ سب جاننے کے بعد مجھے اس کے چہرے پر ہمیشہ کھلی رہنے والی مسکراہٹ اور بھی حیران کن لگی۔

”سین، آپ دوپہر کے وقت یوں اکیلی باہر مت نکلا کریں۔“

ایک روز میں نے اسے ٹوکا۔ گرمیوں کی دوپہر تھی، پونے تین کا وقت تھا، اگلی تقریباً سنان تھی، صرف سامنے دیوے گسٹری کی دکان میں چند ادواہاں اور کچلے لڑکے جمع تھے۔ میں نے دور سے ندا کو آتے دیکھ کے ان لڑکوں کی حرکتیں نوٹ کر لی تھیں۔ وہ یقیناً اس کے اعلاز وجود سے آنکھیں سینکے کے ساتھ ساتھ آواز بھی کسی رہے تھے جو میں فاصلہ ہونے کی وجہ سے سن نہ سکا، البتہ انہیں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے ٹھٹھاٹھاتے اور ندا کی جانب اشارے کرتا ضرور دیکھ سکتا تھا۔ ندا یا تو واقعی بے خبر تھی یا اپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی وہی لاہر واہ چال تھی، اسی بے فکرے انداز میں اس نے سبھی کو کمر پہ نکا رکھا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے بھٹکھاتے ہوئے وہ اسٹور کی جانب بڑھ رہی تھی۔

”وہ کیوں؟ اب ضرورت دوپہر کو پڑے گی تو دوپہر کو پڑے گی۔ دودھ چاہئے شام کی چائے کے لیے، امی اٹھنے ہی والی ہوں گی اور اٹھنے ہی انہیں چائے چاہیے ہوتی ہے۔“

”صبح تم بن لینے آئی تھیں تب دودھ بھی لے لیتیں۔“

”دودھ تو صبح صبح گولا دے جاتا ہے، آدھا کلو دو وقت کی چائے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ یہ پیکٹ والا دودھ اتنا مہنگا..... یہ ہم بھلا کب لے سکتے ہیں۔ گرمی اتنی ہے نا، جوڈیڑھ کپ شام کی چائے کے لیے بچا کر رکھا تھا وہ سارا خراب ہو گیا۔ دودھ والے سے کہوں گی، پاؤد دودھ منج دے جایا کرے، پاؤ شام کو، کیا کریں، ہمارے گھر میں فروغ جو نہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن کسی چھوٹے بھائی کو بیچ کریں۔ اس وقت تو گھر پہ ہی ہوتے ہوں گے۔“

”کہاں جی، بڑا احسان کرتے ہیں چار کھنے اسکول میں وقت ضائع کر کے آتے ہی بیگ پھینکا ہر دوئی کھاٹی اور کھینے کے لیے نکل گئے ملیں میں۔“ وہ حسب عادت خود ہی جار کھول کے ایک ٹائی سبھی کو تھمانے کے بعد اب سو ف چھائی کی پڑیا کھول کے کھارہی تھی۔

”اور فرض کریں وہ گھر پہ ہوں بھی..... تو ان سے سودا مگانا نرا کھائے کا سودا ہے۔“

یہ خواب جو کوئیل ہے O 224

لینے نکلیں گے دودھ اور تلقین کھا کے آجائیں گے آپ نہیں جانتے کیے بد معاش ہیں۔“

”لیکن پھر بھی احتیاط کیا کیجئے اس وقت راستہ خاصا سناں ہوتا ہے۔“

”راستہ؟“ وہ مکھلا کے فیس پڑی۔

”ایک گلی کے فاصلے کو آپ راستہ کہہ رہے ہیں؟ اور پھر مجھے کوئی کھا تھوڑا ہی جائے

گا۔ چلیں چھوڑیں ساری باتیں، ٹھنڈا پانی تو پا دیں، مگلا سوکھ رہا ہے۔“

”آج صبح نہیں آیا۔“ میں نے اپنے پیلر لڑکے کا نام لیا۔

”میں صبح گھر سے جو کمر بھر کے لایا تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے۔“ میں نے یہ بتاتے ہوئے

خاصی شرمندگی محسوس کی۔

”ہائے، ادھر بھی ٹھنڈا پانی نہیں۔“ وہ بھی بھر کے مایوس ہوئی۔

”آج ہمیں بھی آس پڑوس سے کہیں سے بھی برف نہیں ملی۔ اس قدر کہیں لوگ ہیں

اس محلے کے۔ ہر گھر میں فریج ہے پھر بھی..... میں تو ترس کے رہ گئی ہوں ٹھنڈے پانی کو۔

اتنی گرمی میں کہاں حلق سے اترتا ہے گرم پانی۔“ اس کی بات مکمل ہوتے ہوئے میں ٹھنڈی

ٹھار پیٹی فریزر سے نکال کر اس کے سامنے کھول کر رکھ چکا تھا۔

”نہیں، نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا..... ویسے بھی ہم لوگ ان غروں کے عادی نہیں،

ایسے خرچے۔“

”فکر مت کرو، یہ حساب میں نہیں لکھا جائے گا۔ یوں سمجھیں میں آپ کی میزبانی کا

شرف حاصل کر رہا ہوں، آخر اتنی گرم جتنی دوپہر میں کون کسی کا مہمان بنتا ہے۔“ میں نے

خلاف فطرت شوقی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

اور پھر یہ معمول بن گیا۔ میں بھی اس کی توضیح کو لڈ ڈرنک سے کرتا، کبھی آئس کینیڈی

پیش کرتا۔ پھر جب میں نے بیکری آئلز رکھنا شروع کیے تو وہ بلا تکلف خود ہی بھی پیسٹری اور

کبھی کریم رول نکال لیتی۔ مجھے اس کی ان بے تکلفاؤں اور اداؤں سے کبھی کوئی غلط گمان نہ گزرا۔

میرا شرافت پر اسے اعتماد تھا، میرے غلوں کا اندازہ ہو گیا ہو گا کہ میں نے بھی تو کبھی

اسے غلط انداز نظروں سے نہیں دیکھا نہ ہی تنہا پا کے کوئی بدتمیزی یا جھجیر جھاکڑ کرنے کی کوشش

کی۔ اس لیے شاید وہ میرے ساتھ دوستی کی سطح پر آگئی ہے۔

میں نے سوچا اور دل سے اس دوستی کو تسلیم کر لیا۔ مگر بات ابھی اس بے ضرورت دوستی تک

ہی محدود تھی اس سے آگے بڑھ کر نہ میں نے ارادہ سوچا نہ ہی بلا ارادہ یہ خیال بھی ذہن میں

آیا۔ پھر ایسا کیوں ہو کہ اُمی کے سوال پہ اس کا معصوم بھولا بھالا چہرہ یک دم نظروں کے

یہ خواب جو کوئیل ہے O 225

سامنے آگیا اور اب بٹنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

”کیا ایسا ہو سکتا ہے؟“ میں نے خود سے سوال کیا۔

”کیا مجھے باجی کوئلا کے بارے میں بتانا چاہئے؟ یا پھر کچھ دیر اور انتظار کرنا چاہئے۔

پہلے نڈا کے دل کا حال جانتا چاہئے، وہ مجھے اس حوالے سے پسند بھی کرتی ہے یا نہیں۔“

گوگو کی حالت میں، میں ساری رات الجھا رہا۔ اگلے دن میں بے چینی سے اس کا

انتظار کر رہا تھا، جب شام ساڑھے چار بجے کے قریب وہ آئی تو خاصی تھکی تھی اور نڈا ہلک

رہی تھی۔

”کیا بات ہے، خیریت تو ہے؟ آج سارا دن ہی کیا کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑی جو

چکر نہیں لگا؟“ میں نے بے تابی سے سوال کیا۔

”ہونہ، ضرورت..... ہماری زندگی میں وہ دن نہ جانے کب آئے گا جب ہمیں کسی چیز

کی ضرورت نہ ہوگی۔ صبح سے رات تک ہمارے گھر میں اسی ایک لفظ کی تکرار تو رہتی ہے

ضرورت، ضرورت، ضرورت۔“ وہ آج آگئی تھی جی لگ رہی تھی۔ اتنا تلخ میں نے اسے

کبھی نہ دیکھا تھا، وہ تو ہمیشہ ہنسی مسکراتی رہا کرتی۔

”آج موڈ اتنا خراب کیوں ہے تمہارا؟“ میں نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے

اسے آپ کی بجائے تم کہہ کر مخاطب کیا اور ایسا میں نے جان بوجھ کے کیا تھا، لیکن شاید اس

نے محسوس ہی نہ کیا۔

”موڈ تو کیا، قسمت خراب ہے میری۔ بالکل ویسے ہی جیسے امی کی طبیعت ہمیشہ خراب

رہتی ہے۔ کل رات سے مجھے بھی بخار ہے لیکن میرا احساس کسی کوئیل نہیں۔ سارے کام روٹین

کے مطابق مجھے ہی انجام دینے ہیں، چاہے بخار سے جسم دھپک رہا ہو۔ سارے گھر کی صفائی

کی، ڈھیر پکڑوں کا دھوا، ناشتہ اور پھر کھانا پکانا، اب رات کے لیے چاول لینے آئی تھی۔“

”کوئی دوائی کی؟“ میں نے فکر مندگی سے پوچھا۔

”چھوڑ دیں دو اک۔“ اس نے ہنکرتے ہوئے بالوں میں سے جھپٹتی ایک لٹ کو دوپٹے

کے پیچھے آڑٹے ہوئے بے پرواہی سے کہا۔ ”آپ بس آدھا کلو چاول دے دیں۔“

”یہ دو بخاری گولیاں بھی لو۔ اگر رات تک بخار نہ اترے تو ڈاکٹر کے پاس ضرور

جانا۔“ چاولوں کے پیکیٹ کے ساتھ میں نے دو گولیاں بھی رکھ دیں۔

”تھیک یو ہام۔ آپ آتے خیال رکھتے ہیں سب کا۔“ وہ کٹھنی سے مسکرائی۔ اس کے

لبوں سے پہلی بار اپنا نام اتنی اچانکیت کے ساتھ سنا مجھے بے صدا چھا لگا۔

”سب کا تو نہیں۔“ میں نے ادھوری سی بات کی۔

”خیر یہ تو آپ یونہی کہہ رہے ہیں۔ آپ میں ہی اتنے اچھے۔“ وہ کبر کے چلتی بنی اور میں اس مبہم سے نفرت میں اقرار کے سنے سے سختی ڈھونڈتا رہ گیا۔

فاطمہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ گھر جا چکی تھی۔ البتہ خدیجہ باجی ابھی یہیں تھیں۔ مریم کی شادی کی مصروفیات نے اسی کو تھکا ڈالا تھا اور کچھ وہ تنہائی کے خیال سے بھی افسردہ ہو رہی تھیں، اس لیے ان کا ارادہ ابھی کچھ روز اور قیام کا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ اب اگر انہوں نے دوبارہ یہ ذکر چھیڑا تو میں بلا تو قہقہہ اندا کا نام لے لوں گا۔

اگلے دن وہ سختی لینے کے لیے پھر سے موجود تھی۔

”حساب میں لکھ لیں۔“ اس نے چائے کی تہی کا چھوٹا پکٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ میں پوچھنے پوچھتے رہ گیا کہ اسے ماں میں کبھی اس کے والد ملک صاحب اس حساب کے بارے میں ادا ہوئی تو درکنار پوچھنے تک نہیں آئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ مگر فی الحال میں اس کے حوالے سے جو خواب دیکھنے لگا تھا، ان کے پیش نظر ایسے کاروباری سوال نامناسب اور بے محل تھے۔

”اب تمہاری طبیعت کسی ہے؟“ وہ کاؤنٹر پر رکھے رسائل کی ورق گردانی کر رہی تھی جب میں نے پوچھا۔ پہلے تو وہ پندرہ پندرہ میں منت تک نہیں کھڑی پرستی رہا کرتی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ”تمہیں رسالے پڑھنے کا بہت شوق ہے؟“ تو اس نے انہات میں سر ہلایا۔

”ہاں بہت مگر میں نے نہیں سکتی۔ ہمارے گھر میں ایسے شوق عیاشیوں میں شمار ہوتے ہیں۔“

”تو یہاں سے لے جایا کرو۔ احتیاط سے ایک آدھ دن میں پڑھ کے واپس کر دیا کرتا۔“

”تو کیا آپ میگزینز اور ڈائجسٹ کرائے پر بھی دیتے ہیں؟“

”نہیں، یہ رعایت صرف تمہارے لیے ہے اور تمہیں بھی کرائے پر نہیں دے رہا۔“

تب سے یہ اس کا معمول بن گیا۔ کبھی تو رسالے واقعی جوں کے توں آتے اور میں دوبارہ کاؤنٹر پر دکھ دیتا تو وہ بک جاتے مگر کبھی بکھار خاصے اجترعات میں ہوتے۔ اشعار پہ نشان لگے ہوتے، فیشن کے صفحات میں کاٹ چھانٹ تک ہوئی ہوتی مگر میں مارے مروت کے باز پُرس نہ کر پاتا۔ یہ احساس تو اب جا کے ہوا تھا کہ وہ صرف مروت اور لحاظ نہ

تھا، پسندیدگی کے جذبات تھے، اس حسن و دلکشی کے آگے میری مرعوبیت تھی۔

”میں نے اپنی باجی سے ذکر کیا تھا تمہارا۔“ اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں، میں نے کہا۔

”وہ..... میں نے انہیں تمہاری طبیعت کی خرابی کے بارے میں بتایا تھا۔“ جلدی سے میں نے بات بدلائی۔

”کہہ رہی تھیں کہ تمہاری خیریت دریافت کرنے تمہارے گھر آئیں گی۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے۔“ وہ کچھ پریشان سی نظر آئی۔ ”ویسے بھی آپ کے گھر سے کبھی کوئی ہمارے ہاں نہیں آیا نہ ہی میں آپ کی باجی کو جانتی ہوں۔“

”مجھے تو جانتی ہوتا۔“ میں اس کی گھبراہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔

”ویسے بھی محلے داری میں ایسے تعلقات بنانے کے لیے کسی بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

”لیکن میں اتنی بیار تو نہیں۔ بلکہ اب تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ پلیز انہیں منع کر دیجئے۔“ وہ صاف منع کر رہی تھی تو میں نے بھی صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

”تمہاری خیریت دریافت کرنا تو بہانہ تھا۔ اگر تم اپنے گھر والوں کی وجہ سے گھبراہی ہو تو بے فکر رہو۔ میں انہیں منع کر دوں گا کہ یہ وہ ایسا کوئی ذکر نہ کریں جس سے تمہارے گھر والوں کو اندازہ نہ ہو کہ میرے کہنے پر وہ..... وہ ویسے ہی آئیں گی جیسے کسی بھی لڑکی والے گھر میں کسی لڑکے کی بہن آتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ وہ تمہارے والدین سے میرے لیے تمہارا ہاتھ مانگتے آ رہی ہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ واضح انداز میں زور دے کر کہا۔ اس کے چہرے سے الجھن ہو رہی تھی۔

”بات کیا ہے خدا کیا تمہیں اس پر اعتراض ہے؟“ وہ میرے سوال پر صرف مجھے دیکھ کے رہ گئی ان ہی الجھن بھری نظروں سے۔ اس کی چپ پر میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

”یہ کریم اور فیس واٹ میں لے آیا ہوں جس کے بارے میں تم اس دن پوچھ رہی تھیں۔“ میں نے ایک اچھوڑا براؤن کافیس واٹ اور سن بٹاک کریم نکال کے سامنے رکھی جن کا اشتہار ایک فیشن میگزین میں دیکھنے کے بعد اس نے مجھ سے ان کی قیمت پوچھی تھی۔ جس طرح وہ دیر تک اس پر کشش اشتہار پر نظر میں جمائے رہی، اس پہ میں نے اسے یہ دونوں چیزیں تجھے میں لاکر دینے کا سوچ لیا تھا۔

”لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ اسنور میں صرف وہ چیزیں رکھتے ہیں جو اس علاقے میں آسانی سے فروخت ہو سکیں اور یہ کاسمپلکس خاصی مہنگی ہیں، اسی لیے آپ نہیں لائیں گے۔“

”ہاں تو میں سیل کرنے کے لیے تھوڑا ہی لایا ہوں۔ تمہارے لیے صرف اور صرف تمہارے لیے خریدے ہیں۔“

”نہیں، یہ میں نہیں لے سکتی۔“ وہ کچھ چٹکیاں لے شاید یہ ہچکچاہٹ ان کی قیمت کی وجہ سے تھی۔

”رکھ لو، تمہارے لیے لایا ہوں اور تم ہو کر خیرے کر رہی ہو۔“ کچھ پس و پیش کے بعد وہ مان گئی۔ اپنی لائیو مٹھنی ٹیکس پٹ چلاتے ہوئے اس نے کچھ اس ادا سے میرا شکر یہ ادا کیا کہ میں گویا فدا ہی ہو گیا۔

ابھی میں ہواؤں میں اُڑ رہی تھا کہ انکل غفار کا بیٹا اور دیں وہاں چلا آیا۔ اس کے گرد بوشی کے کیے سلام کا جواب میں سرسری سے انداز میں اس لیے دے پایا کہ میری نظریں تو اب تک گلی کے اس کونے میں لگی تھیں جہاں وہ واپس جاتے ہوئے نظر آ رہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا وہ کبھی نظروں سے اوجھل نہ ہو۔ اور دیں نے میری نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا۔

”ارے یہ تو وہی مفت خوروں کی لڑکی ہے، ہاں لگتی تو وہی ہے۔ اب اس محلے میں آچکا ہے ملک۔“ اس کی بات پہ میں ٹھنک کر غور کرنے لگا کہ آخر وہ یہ کیا بکواس کر رہا ہے جبکہ وہ اپنی کہہ چکنے کے بعد اب مجھے اسے اسنور کی آمدنی وغیرہ کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔

”کیا..... کیا کہہ رہے تھے تم ابھی؟“

”میں نے پوچھا ہے یا کہ یہ اینٹیشری وغیرہ سے کتنا برا فٹ ہو جایا کرتا ہے؟ اگر منافع بخش ہے تو میں بھی اردو بازار کا ایک پتھر لگوں۔ کچھ پٹلسیں، کاپیاں، رجسٹر لاکے رکھ لوں۔“

”نہیں، وہ جو تم پہلے کہہ رہے تھے، ملک صاحب کی بیٹی..... میرا مطلب ہے ملک صاحب کے بارے میں تم نے کیا کہا؟“

”ہاں یار یہ ملک پہلے ہمارے ہی محلے میں رہتا تھا۔ بڑا ذلیل کر کے نکالا اس کو مالک مکانوں نے، کئی مہینے کارایہ کھا گیا، وہ بھی بوڑھے کے تھے، نہ خیر فٹ لگائے دیا نہ ہی چھت سے پھینکے اتارنے دینے تاکہ کچھ تو کر لیں۔ پھر اس پر دس سے کئی ہزار ادھار لگے رکھا تھا، وہ بھی دینے سے صاف مر گیا۔ بڑا لیر انسان ہے بھی، بلکہ ڈھیٹ اور بے غیرت پیسے

لے کر صاف مکر جاتا ہے۔ اوپر سے اس محلے کے تقریباً سبھی دکانداروں سے ادھار سودا لے رکھا تھا۔ میری اپنی دکان پر اس کا چھ سات ہزار کا حساب باقی ہے۔ کہیں تم نے بھی تو کھاتہ نہیں کھول لیا؟“

”آں..... ہاں مگر میرے پاس تو بہت سے لوگوں کے کھاتے ہیں۔ اکثر مستقل گاہک ادھار سامان لیتے رہے ہیں۔“

”مگر وہ مہینے کے مہینے حساب چکا بھی تو دیتے ہوں گے۔ تم کا پی کھول کے بتاؤ، کب کھاتہ کھلا اور اب تک کتنی ادا ہوئی ہوئی۔“ مگر میں ایسا نہ کر سکا کیونکہ اب تک میرے اسنور سے اس گھر تک جانے والے کسی سامان کی ادا ہوئی نہ ہوئی تھی۔

”یہ ہیں ہی ایسے بھوکے بنگلے لوگ۔ بچوں کی تربیت بھی ایسے ہی کی ہے۔ بڑا جہاں ملازم ہوتا ہے، ہاتھ کی صفائی دکھا کے بھاگ جاتا ہے۔ پھوٹے اسکول جانے کے بجائے چوراہوں پر کھڑے ہو کے اکثر چندہ اکٹھا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جوان لڑکی کو دکان دکان سے سودا جمع کر کے لانے پر لگا رکھا ہے۔“

”مجھ میں کوئی غلط فہمی تو.....“ صدے کی شدت سے میں جملہ تکمیل نہ کر پایا تھا۔

”نہیں یار! خود میری دکان میں بڑا مسکرا مسکرا کے آتی رہی۔ مجھے لڑکیوں سے کوئی پرہیز تو نہیں لیکن دکاندار کے معاملے میں، میں استاد ہوں۔ میرے ابا تو اکثر کہتے ہیں تجھ میں کسی ہندو پیسے کی روح ہے۔ اس لیے جہاں بات لینے دینے تک آئی میں نے صاف ہری جھنڈی دکھا دی کھاتہ بھی اسی وقت بند کر دیا جب ڈیڑھ مہینے بعد بھی اس کا باپ دکان میں جملہ کتنے تک نہ آیا۔“

البتہ فیاری والا برا پھنسا، آلو بنا کے خوب سامان اکٹھا کرتی رہی۔ تو جب اس کے باپ نے خبر لی تو ابھی پتھر لگ چکی تھی۔ جو نقصان ہوتا تھا وہ وہاں چکا گم رہے چارے کے زخمی دل سے ناکام مٹھتی آئیں اب بھی لگتی ہیں۔“

اور دیں نے قہقہہ لگایا۔ میرے گھم گھم انداز کو اس نے میری غیر دلچسپی پر محمول کیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا، جو میں نے اسی غائب دماغی سے سیں، میری ساری حسیات تو ابھی تک اس کی پہلے والی ہرزہ سرانی میں اٹکی تھیں۔ میری ہوں، ہاں سے تنک آکر وہ جلد ہی چلا گیا۔ مجھ سے بھی اب مزید وقت یہاں گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے خلاف معمول سر شام ہی اسنور کے شکر گارے اور گھر واپس آ گیا۔ باقی ادرا می نے پوچھا تو میں نے اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا۔

”ہائے، ہائے اللہ خیر کرے۔ اسے تو پاک ساز کام بھی ہوتا ہے لگ جاتے ہیں ٹھیک ہوتے ہوتے۔“ امی نے سننے ہی ویلا چادیا۔ مجھے اکابر ہی ہوئی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے امی! ذرا سار میں درد ہے اور کوئی خاص بات نہیں۔“

اس سے پہلے کہ وہ سردرد کے لیے کچھ اور ٹونکے آزماتیں، میں نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ بند دروازے کے پیچھے سے باہر کی آواز سنا رہی تھی۔

”ابو بھی آپ کو ساری عمر یہی سمجھاتے رہے امی! کہ رضا کو ننھے بچوں کی طرح سمجھنا چھوڑ دیں، وہ چڑھتا ہے اس برتاؤ سے۔“

”چڑھتا تو وہ ہر چیز سے ہے، دن بدن چڑھتا چڑھتا ہوتا جا رہا ہے۔“

”اس کی شادی اب کروانی دیں امی! مجھے یقین ہے یہ ٹھیک ہو جائے گا بلکہ یوں کہیں، سدھر جائے گا۔“

صبح تک میں نے سوچا تھا کہ وہ بارہ یہ ذکر چھپڑنے پہ میں ان سے ندا کا تذکرہ کر دوں گا، لیکن اب ادريس کی باتوں نے مجھے اس بری طرح الجھایا کہ میں ایسا کرنے کا سوچتے ہوئے بھی ہنچا رہا تھا۔ ایک طرف یہ خیال آتا کہ ادريس کو کون سا ملک صاحب یا نندا سے ذاتی پُر خاش ہے جو وہ بے بنیاد بہتان باندھے گا۔ دوسری طرف ندا کی معصومیت ان الزامات پہ یقین کرنے سے روک رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر ادريس سے مل کر تفصیلی گفتگو کے ذریعے تصدیق کرنے کا سوچا۔

اگلے دن محمود کو اسٹور پر بٹھا کے میں پیدل ہی ادريس کی دکان کی جانب چل پڑا۔ جب بازار میں ایک درزی کی دکان سے میں نے ندا کو نکلنے دیکھا، اس کے ساتھ ایک اور نوجوان لڑکی اور گود میں ننھی ننھی۔ میں اسے چاہنے کے باوجود متوجہ نہ کر پایا کہ اس طرح سر راہ اسے مخاطب کرنا خاصا عجیب لگا۔ میں اپنے رستے پہ جانے ہی والا تھا کہ وہ دونوں ایک ہی بڑے، چاروں ملکہ ٹھیک والی چھوٹی سی دکان کے اندر داخل ہو گئیں۔ مجھے جانے کیا خیال آیا کہ میں بھی پیچھے پیچھے چل پڑا۔

”اندرا بھٹہ کے بات کرنا اتنا بھی مناسب نہیں لگے گا، لیکن یہ نہیں ہے لڑکی کون ہے۔ اس کی کوئی کزن وغیرہ اور یہ نہیں ندا اس کے سامنے مجھ سے بات کرتا گوارا کرتی ہے یا نہیں۔ چلو اندر تو چلتا ہوں۔“

میں یہ سوچتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ وہ تین لکڑی کے بیچ رکھے تھے۔ ایک جانب پردہ کھینچ کے لیڈیز کے لیے جگہ بنائی گئی تھی۔ وہ یقیناً پردے کے پیچھے رکھے بیٹھے کسی خاص

اب مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی میں پردے کے بالکل نزدیک والے بیچ پہ بیٹھ گیا تاکہ جیسے ہی وہ باہر نکلے، اس کی پہلی نظر مجھ پہ پڑے۔

”کیا لے گی ندا؟ ٹیکو ملک ٹیک، مٹھنڈی پتیسی یا چاٹ۔“

”جو بھی تو کھلا دے۔ میں تو تیری مہمان ہوں۔“

”ارے میں تو خود مہمان ہوں۔“ وہ لڑکی کھل کر کہی۔ ”میری طرف سے سب کچھ منگوا لے۔ صدیق انکا تھوڑا ہی کرے گا۔ میری پہلی بھی اس کی مہمان ہی ہوئی۔“

”اچھا، پھر دو پلیٹ چاٹ کے ساتھ تین منگوا۔ بعد میں ملک ٹیک بھی پتیسی کے گھر جا کے وہ چلے مونگ کی دال تو نہ کھانا پڑے گی۔“ اس کی بے تکلفا نہ فرمائش پہ میں ہنک گیا۔

”ٹو کبے تو چاٹ کے ساتھ دو برگر بھی منگواؤں۔ صدیق ٹکڑو والی برگر کی دکان سے منگوا دے گا۔“

”جج تیرے تو عیش ہیں بہلی۔ بڑی واقفیت پیدا کی ہے۔ پہلے اس درزی سے مفت کا جوزا سلوایا، اب اس بوئل والے سے پیٹ پوجا۔“ اس کے لیے میں رشک و حسد نمایاں تھا۔

”صرف سلاخی ہی مفت نہیں ہوئی، اچھرے کی دکان سے یہ لان کا ڈھائی سو والا جوزا ملا بھی مفت ہی ہے۔ وہ بابا تو تلو ہے مجھ پہ۔ یہ ٹو ہی بدھو ہے۔“

”یاریا کروں، ہمارے منھے میں ایسی دکانیں ہیں نہیں۔ دے لے کر چند کرپا نے کی دکانیں ہیں ان میں بھی بدھے کھوسٹ۔ ہاں ایک بوٹا ہے، وہ رضا سپرا سٹور والا۔۔۔۔۔“

میرا روائوں سلب تھا۔

”وہ بھی اوقات سے بڑھ کے خواب دیکھنے لگا۔ جھٹی ذرا بس بول لیا، مسکرا کے دیکھ لیا، اسی چکر کرے۔۔۔۔۔ ورنہ کون لڑکی اس کو ڈو کے پاس دو گھنٹی کھڑے ہونا گوارا کرے۔۔۔۔۔ لیکن ناں جی۔۔۔۔۔ چار تو تیں پلے پلے، دو ٹافیاں کھلا کے وہ تو گھر بسا نے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ بڑا دیدے منگوا منگوا کے کل کلہ رہا تھا۔“ میری باجی آپ کا ہاتھ مانگتے آئیں گی۔“ وہ لہجہ بگاڑ کے بولی مٹھنڈی میرے شرواب کا گھونٹ میرے حلق سے تیزاب کی طرح گزرا۔

”تو آنے دے اس کی باجی کو۔ کیا پتہ بات بن جائے۔ ویسے بھی تو خود تنگ ہے اپنے گھر کے حالات سے۔ اچھا ہے کسی بہانے یہاں سے نکل جائے گی جہاں ذرا ذرا سی چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے، نکلے نکلے کو لوں کہ منگوا نہ پڑتا ہے، اور اگر کسی طرح بغیر ہاتھ پیر مارے تجھے یہ کھڑکی کی زندگی مل رہی ہے تو کیا رہا ہے۔“

”تو پرک میں گھر کے حالات سے تنگ ضرور ہوں مگر قسمت سے اتنی مایوس بھی نہیں کی یہ

گھائے کا سودا کرلوں۔“

”گھائے کا سودا؟ اگلتا ہے، کاروبار چلتا ہوا ہے اور سنا ہے پڑھا لکھا بھی ہے ورنہ یہ دکاندار تو چند جماعتیں پاس ہوتے ہیں۔“

”اس کی پڑھائی کھائی کو چاٹنا ہے کیا مجھے۔“ ندا مجھ کے بولی۔

”ٹوٹے دیکھ تو رکھا ہے اس ڈھائی فٹے کو، پھر مجھے ایسے مشورے دے رہی ہے، یہ ہے تیری دوستی۔ اتنا مجھ کو تو خود شادی کر لے اس بونے کے ساتھ، دیدے دیکھے ہیں اس کے، مینڈک جیسے بچھے ہوئے، مجھے اپنا مذاق نہیں ہونا سزا کوڑوں کے۔“

”ٹوٹو ناراض ہی ہوگی یارا میں نے تو مذاق کیا تھا ورنہ اگر ذرا عقل سے کام لے تو اچھے اچھے تیرے گھر رشتہ جیتے پتار ہوں۔“ اس امید افزا پیش گوئی پر ندا کا کیا رد عمل تھا، یہ جاننے کی زحمت کیے بغیر میں تیری سے وہاں سے نکل گیا۔

☆ ===== ☆

اور یہ میری عمر کا اچھو اواس سال ہے۔

تیسری دہائی کا آخری سال۔

اس سال تک پہنچتے پہنچتے کچھ بدل گیا ہے۔ میری ذات میں بھی اور میری زندگی میں بھی۔ اگر کہیں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو وہ میرا سا رہا تھا۔ ابھی تک ویسے کا ویسا۔ دہلا، منحنی سا، چار فٹ ڈیڑھ انچ قد والا، چھوٹے چھوٹے ہاتھ پیر والا۔

ہمارا گھر ابھی بھی وہی ہے البتہ اسٹور اب وہ نہیں رہا۔ زندگی ڈرامیک میں بننے والے نئے شاپنگ پلازہ میں دو سال پہلے میں نے انٹھنی چارڈ کانٹینر گراؤنڈ فلور پر خرید لیں۔ یہ میرے اسٹور پر صرف تین سال محنت کے نتیجے میں جمع کئے گئے سرمائے کی بدولت ممکن ہوا۔ میرا کاروبار دن بدن ترقی کر رہا تھا اور اخراجات نہ ہونے کے برابر تھے۔ پھر مجھی ترقی کی دھن تھی جو سرے سو اچھی۔ آگے بڑھنے کا جنون تھا جو شاید ابوجی کی ادھوری خواہشات کے احترام میں میرے اندر پیدا ہوا۔ ان چار ڈکانوں کو میں نے ایک جدید شاپنگ سینٹر کی شکل دے دی۔ سات آٹھ درگزر پر مشتمل اسٹاف رکھا جس میں دیوینڈر گرا بھی شامل تھیں۔ کاذنر پر کمپیوٹرز موجود تھے۔ فل ایئر کنڈیشنڈ اسٹور جلد ہی علاقے بھر میں اپنی ساکھ قائم کر چکا تھا۔

صالح بائی کے ساتھ ساتھ اب مریم سے بھی واسطہ فون کا لڑتک محدود ہو کر رہ گیا، البتہ فاطمہ اور خدیجہ بائی آتی جاتی رتی تھیں۔ خصوصاً امی کی وفات کے بعد تو خدیجہ بائی ہفتے میں دو تین بار میری خاطر آئیں ہاں امی..... یہ جب کی بات ہے، ان ہی دنوں کی، جب ندا

کی جانب سے ملے زخم کو میں سب سے چھپانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ابوجی تو کتنا ہی عرصہ بیمار رہے تھے لیکن امی ایک چپ چاپ بغیر کسی وجہ کے مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد اب مجھے کی چیز میں دھچکی نہ رہی تھی، خود اپنے آپ تک میں نہیں۔ بس بچنے کو کوئی تو بہانہ چاہیے تھا، سو خود کو اس پراسٹور میں مصروف کر لیا۔ دو سال سے اب یہی مصروفیت ہے۔ اس کے لیے منت بنے آئیڈیا سوچنا، نئے نئے ڈھنگ سے اس کی آرائش کرنا ان سب کے ساتھ ساتھ خدیجہ بائی کا انصراب بھی جاری و ساری رہا۔

”شادی کرلو، گھر بسالو.....“

ہر بار ان کے مشورے پر مجھے ندا کے زہر خند لہجے میں ادا کیے وہ حقیر آمیز فقرے یاد آجاتے اور میں نرسے سے سلگ اٹھتا۔

”آپ خود خوشی کرنے کا حکم دے دیں، میں کرگزاروں گا لیکن خدا کا واسطہ ہے شادی کرنے کا نہ کہیں۔“ میں ہاتھ جوڑتا وہ تو یہ کہنے لگتیں۔

”خیر کی بات منہ سے نکالو رضا! جود میں اناسیدھا آتا ہے، یک دیتے ہو، میری توجہ جو آئندہ تمہیں شادی کا مشورہ دیا۔ کم از کم بھواس تو نہ سننا پڑے گی۔“ مگر ان کی تو یہ بس اتنے دن تک قائم رہتی جتنے دن وہ اپنے گھر میں رہیں، چار دن بعد جب دوبارہ آئیں، میرے پہلے کپڑے اسٹری کے الماری میں پینگ کرتے ہوئے، فرخ میں دو تین طرح کے کھانے بنا کر فر کرتے ہوئے وہ یہی بڑبڑاتی رہیں۔

”شاید خدا نے مجھے ایسے اولاد دینے دی ورنہ ان کو باپتی یا بچھے سنبھالتی، ٹوٹو لاوارث ہو کر رہ جاتا۔ اب ابھی وقت ہے، میری بات مان لو، کرلو شادی..... میری بھی پریشانی ختم ہوں۔ امی کی روح کو بھی سکون مل جائے۔ ایک جائز، محسن عمل بلکہ سنت نبوی ہے۔ تمہارے دین و دنیا دونوں سنور جائیں گے۔“

”ایک شادی..... اور اتنے فائدے۔“ میں مذاق اڑاتا۔ ”چلیں میری تو دنیا اور دین دونوں سنور جائیں گے اور وہ اس کا کیا ہوگا جسے آپ یہاں لائیں گی؟“

”ہونا کیا ہے، پیش کرے گی۔ لڑکیاں ترستی ہیں ایسے سرال کے لیے جہاں ایسی روک ٹوک سے آزاد بائیں بادشاہت والی زندگی ہو۔ رانی بن کے راج کرے گی آنے والی۔ ہم بھوں کا کیا ہے پہلے ہی سالوں بعد چکر لگی ہیں نہ سنا، نہ سنا اور آج کل کی لڑکیوں کو کیا چاہئے۔“

”بہت کچھ..... بلکہ سب کچھ۔“ مجھے بہت سی باتیں یاد آگئیں۔

”تو تم میں کیا کیا ہے؟“ انہوں نے انتہائی کردی۔ میں گھائل نظروں سے انہیں دیکھ کر رہ گیا تو وہ نظریں چرا گئیں۔

”ماشاء اللہ لاکھوں کاتے ہو، شریف ہو، اور اسے تعلیم یافتہ بھی۔“

”تعلیم کو چاہنا ہے کیا؟“ ایک تیز آواز تیزے کی طرح سامتوں کو پھیندی۔

”وہ یونان۔۔۔ کون لڑکی اس کوڈو کے پاس دو گھڑی کھڑے ہونا گوارا کرے۔“ وہ حقارت۔۔۔

”مجھے اپنا مذاق نہیں ہونا، اس ڈھائی فنے کی مسز کو ڈوبے گئے۔“

”مجھے اپنا مذاق نہیں ہونا۔“ ایک لخت میں چلا اٹھا۔ باجی نے حیرت سے مجھے دیکھا اور چپ ہو گئیں مگر یہ خدیجہ باجی تھیں، میرے ساتھ سر کھپانے والی، میرے لاڈ اٹھانے کے ساتھ ساتھ بچپن سے میری اونچی آواز اور لمبی پھلکی بد تیزیری بھی سبہ جانے والی، میری تندہ تیز باجی تھیں اور بحث سن کے پلے جانے والی۔۔۔ وہ چپ ہو گئی تھیں مگر صالطہ باجی نہیں۔ اس بار ان کے ساتھ مریم بھی آئی۔ اپنی شادی کے بعد وہ چلی بار آئی تھی اور اسی کے جانے کے بعد تو دونوں کا ہی پہلا پکڑ تھا پاکستان کا۔ کئی دن انہیں یاد کر کے روئی رہیں دونوں۔ ذرا سنبھلیں تو وہی خدیجہ باجی والا مطالبہ۔

”ایک نہ شدہ شد۔“ میں زچ ہو گیا۔

”وہ تو مجہوں کی تعداد بھی بھول گئے۔ ہم دو نہیں، چار ہیں۔“

”اور چار کی ایک ہی زبان ہے، ایک ہی ڈیمانڈ ہے۔“

”ارے یہ کیا تم لوگ اس کے منت ترلے کر رہے ہو۔“ صالطہ باجی نے تینوں کو ڈپٹا۔ ”یہ

کیا ہم سے اتنا بڑا ہو گیا؟“ میں اس کے کان پکڑ کے سیہ ہوا مولوی کے آگے بٹھاسکتی ہوں، اتنا حق ہے ہیرا۔“ میں بلایا اٹھنے کے باوجود ان کے استحقاق کو بھٹانے کی ہمت نہ کر سکا۔

”تو پھر دوسرے بات کی ہے باجی! “مریم نے انہیں مزید بڑھا دیا۔

”لڑکی ملنے کی، جیسے تو کوئی معقول لڑکی ملی بس سمجھو رضا کا بوا گیا۔“

میں نے بھی سوچا، انہیں اپنی سی کوشش کر لینے دو۔ کہاں سے دھوئیں گی ایسی لڑکی جو

مجھ سے شادی کرنے پر بھی تیار ہو، اور معقول بھی ہو۔ ان دنوں میں ندا کی وجہ سے حد سے بوجی خود ترسی کا شکار تھا۔ مجھے اپنی کوتاہ قاصی کا احساس بچپن سے تھا اور یہ احساس ہمیشہ ناخوشگوار ہی رہا۔ اس احساس نے ہمیشہ مجھے دکھ اور محرومی دی، مگر میں خود سے نفرت نہ کر سکا تھا۔ میری ذات خود اعتمادی سے محروم تھی مگر خود ترسی کا شکار اسے ندانے بنایا تھا۔ ایک بالکل

عام سی، سطحی سی لڑکی جو سستی خواہشات کے زیر اثر اپنی انا اور خود داری کو طاق پر رکھتے ہوئے، اپنے نسوانی وقار اور حیا کو پس پشت ڈالتے ہوئے ہر جائز، ناجائز قدم اٹھانے سے تیار تھی، اسے بھی میرا ساتھ گوارا نہ تھا پھر کسی اچھی اور معقول لڑکی کو کیا ضرورت تھی کہ وہ بغیر کسی مجبوری کے مجھے اپنائی۔ یہی سوچ کے میں نے انہیں خوشی پوری کرنے کی اجازت دے دی۔

”ہمارے رضا کو لڑکیوں کی کیا کمی؟“ خدیجہ باجی کے کہنے پہ صالطہ باجی نے انہیں ہلکی سی سرزنش کی۔

”فضول باتیں مت کرو خدیجہ؟ حقیقت پسند بنو۔“ میں اندر اپنے کمرے میں جا چکا تھا اس لیے باجی ”حقیقت پسندی۔“ یہ آتر آئیں یہ جانے بغیر کے میں ذرا سی کوشش کے بغیر کمرے میں بٹھا بھی ان کی باتیں سن سکتا ہوں۔

”وہ ہمارا بھائی ہے اس لیے ہمیں پیارا ہے مگر مت بھولو کہ وہ۔۔۔“ حقیقت پسندی کا دعویٰ کرنے کے باوجود وہ بات مکمل نہ کر سکیں۔

”بے شک اس میں ایک اچھا شاہرہ اور داماد بننے کی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ اس کا کردار بے داغ ہے، اخلاق و سیرت بے مثال ہے، صاحب جائیداد اور برسر روزگار ہے، تعلیم یافتہ بھی ہے لیکن ظاہری طور پر۔۔۔ میرا مطلب ہے جسمانی لحاظ سے اس میں جو کمی ہے اسے تم لوگ نظر انداز مت کرو۔ اس کی وجہ سے ہمیں رشتہ تلاش کرنے میں مشکل بھی ہو سکتی ہے اور وقت بھی لگ سکتا ہے۔“

”تو کیا ہم رضا کی شادی کے خواب کو دیکھنا چھوڑ دیں۔“ ناطم نے گھبرا کر کہا۔

”کیوں؟ کیوں نہیں ہو سکتی اس کی شادی۔ اللہ نے سب کا جوڑ بنا رکھا ہے۔ اس کے نصیب میں بھی یقیناً کوئی اچھی سی لڑکی ہوگی، اس نے زندگی میں کب کسی کے ساتھ بڑا کیا ہے جو اس کے ساتھ بڑا ہو۔ تم نے سنا نہیں نیوکو مار مردوں کے لیے اللہ پاک کہ نہ نیوکو کار نور نہیں منتخب کر سکی ہیں۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ بھائی منتخب کرتے ہوئے دھوکا نہیں کھانا اور نہ ہی کسی خوش فہمی کا شکار ہو کے اونچے اونچے خواب دیکھتے ہیں۔ شرافت اور سیرت ہماری ادویتیں ترجیح ہونی چاہیے اور یہ کہ آنے والی ہمارے بھائی کے لیے خوشی کا باعث ہو نہ کہ وہ اس سے دب کے احساس کسری یا محرومیت کا شکار ہو۔“

”یعنی آپ کہنا چاہتی ہیں کہ ہم خود سمجھ گھڑانے کی لڑکی لانے کے بجائے کوئی گلی گزری شکل کی بھائی اٹھالیں تاکہ ہم رضا کے سامنے وہ دھماکا نہ لگے۔ لیکن کیوں؟ ارے ایسے ایسے کم زور مردوں کو حوریں مل جاتی ہیں، آپ پتہ نہیں گس گس میں ہیں۔“ خدیجہ

باجی نے چمک کر کہا۔

یہ خواب جو کون ہے ○ 237

”اور میں؟“ میں نے سوال اٹھوا چھوڑ دیا۔

”تم بھی۔“ ان کا جواب البتہ مکمل تھا مگر میری تسفی کرانے میں ناکام۔ میں اور بھی حیران ہوا جب شام کو وہ لوگ آئے، مجھے پسند آیا اور وہیں بیٹھے بیٹھے سارے معاملات طے پا گئے۔ میں باجی کے سامنے کچھ کہہ نہ سکا۔ میں نے تو اس امید میں ان کے ہاتھ سارے اختیارات سوچتے تھے کہ وہ کون سا یہ مہر کر لیں گی مگر انہوں نے یہ مہر کبھی انجام دے ہی ڈالا۔ ناممکن کو ممکن بنادیا۔ میں کا کیا بیضا شادی کی تاریخ مقرر ہوتے دیکھتا رہا۔

”اب آپ کھل کے یہ بھی بتادیں کہ لڑکی کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟“ میں نے ان کے جانے کے بعد باجی سے کھل کر بات کرنا چاہی۔

”طلاق یافتہ ہے، بیوہ ہے یا بوجھ؟“

”خدا نخواستہ..... وہ باقاعدہ برہمنائے گئیں۔“

”اب وہ تمہارے نام سے منسوب ہے۔ شرم نہیں آئی اس کے بارے میں ایسے فضول انداز سے لگاتے ہوئے۔“

”تو پھر اندھی، گولگی یا بہری ہوگی؟“

”اللہ نہ کرے..... میں کیوں ایسی بھالی لانے لگی۔“

”تو پھر لنگڑی ہوگی، چمپک ہوگی اس کے چہرے پر، پھلکائی ہوگی یا بچھر.....“ میں سوچ سوچ کے سارے ”ممکنات“ گنوار تھا۔

”بندر کو یہ منہس باتیں۔“

”اتنی تو بھاری شکل ہے اور ایسی میٹھی آواز۔“ مریم نے بھی تصدیق کی۔

”کہو تو یہ تصور لا کے دکھاؤ؟“ خدیجہ باجی نے آفری۔

”اس کا کیا ہے خدیجہ! اس میں بھی نقص نکالے گا۔ کہے گا تصویر میں سے آواز نہیں آ رہی، چلتی ہوئی تو نظر نہیں آ رہی۔ کیا یہ چال میں نقص ہو، وغیرہ وغیرہ۔“ باجی کی بات پہ میں نے منہ بنا کر تصویر والی آفر قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا۔

شادی والے روز بھی میں استاد سے قلعی محرم تھا۔ اگرچہ وہاں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کے باوجود اس سادہ مگر باوقار تقریب کے دوران میں شعوری اور لاشعوری طور پر سہا ہوا کسی تلخ ساعت کا شہر تھا۔ صد شکر کہ مذہبی ماحول ہونے کی وجہ سے میرے سرسے عموئوں اور مردوں کے بیٹنے کا الگ الگ انتظام کیا تھا، اس لیے میں شوخ و شریر لڑکیوں کی شرارتوں سے بھی محفوظ رہا۔ نکاح کے بعد میرے بڑے بہنوئی نے مجھے صالحہ باجی کا پیغام

”ہاں جانتی ہوں دولت کی چمک دمک کے آگے بہت سی لڑکیاں لب گور بیٹھے بدھوں سے نکاح پہ بھی تیار ہو جاتی ہیں مگر ہم کسی لالچی لڑکی کو لا کر رضا کا گھر آباد کرنے کے بجائے برادرانہ کے کیوں سوچیں۔ کام مشکل ضرور ہے مگر ہمیں ان شاء اللہ تعالیٰ ایسا گھر اٹھانا اور ایسی لڑکی ضرور مل جائے گی جو پورے مخلص کے ساتھ رضا کو قبول کر لیں گے۔“

باجی کے ارادے جان کے میں اور بھی ہلکا چمکا ہو گیا۔ اب بھلا کہاں سے وہ ایسا ”مُتخلص“ گھرانا ڈھونڈ پائیں گی جو میرے جیسے لڑکے کے رشتے پر خوشی کے مارے پاگل ہو جائیں۔

”چلو، کر لینے دو انہیں اپنا شوق پورا۔“ میری بے فکری کو جب غصیں پیچھی جب ٹھیک بارہویں روز باجی نے مجھے اطلاع دی۔

”خدیجہ کی جھٹائی نے ایک رشتہ بنا دیا تھا، میں کل ہی لڑکی دیکھ کے آئی ہوں۔ بڑے شریف لوگ ہیں۔ باپ حافظ قرآن ہے، تکیم تھے اب بیٹائی سے عروم ہونے کی وجہ سے حکمت نہیں کرتے۔ دو بڑے بھائی ہیں، ایک بینک میں کیشئر ہے، دوسرے کی کپڑے کی دکان ہے۔ مڈل کلاس گھرانہ ہے مگر مذہبی اور رکھ رکھاؤ والے خاندانی لوگ ہیں۔ نسب سے بڑی بہن کی شادی ہو چکی ہے، بس یہی باقی ہے۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ آج وہ لوگ تمہیں دیکھنے آرہے ہیں۔“

”اگر آپ انہیں پہلے ہی میرے بارے میں سب بتادیں تو شاید انہیں آنے کی زحمت نہ کرنا پڑے۔ میرا مطلب ہے نہ ان کا وقت ضائع ہونے ہی مارا۔“

”میں کوئی دھوکے سے تمہاری شادی نہیں کر رہی۔ سب بتایا ہے انہیں۔ انہیں ان باتوں پر اعتراض نہیں، بس نسب کے والد کی واحد شرط ہے کہ لڑکا صوم و صلوة کا پابند ہو اور وہ ہمنا شاء اللہ سے ہو۔ بھائی چاہتے ہیں کہ تم عزت سے ان کی بہن کو گھر پہ دو وقت کی روٹی کھلانے کے قابل ہو اور وہ بھی اللہ کے فضل سے تم ہو۔“

”اور وہ خود وہ لڑکی کیا چاہتی ہے؟“ میں اب بھی متذبذب تھا۔

”وہ تمہارا رشتہ نہیں مانگنے آئی، ہم مانگنے گئے تھے۔ ابھی یہ نوبت نہیں آئی کہ شریف گھرانوں کی لڑکیاں اپنی شرطیں کتنا ہی پھریں۔ حافظ قرآن باپ کی حافظ قرآن بنی ہے۔ پردے کی پابند، حیادار، ایک مکمل شرفی اور گھریلو لڑکی۔ ہر لحاظ سے تمہارے قابل ہے۔ نسب۔“

کان میں سنایا۔

”آ جاؤ بھئی! تمہاری سسرالی خواتین دوسرے پنڈال میں تمہاری منتظر ہیں۔ تمہاری دلہن بھی اسٹج پہ ہے۔ ساتھ بیٹھ کے تصاویر اور دودی وغیرہ بٹوالو، بعد میں لکھانا لگ جائے گا تو ہر بولنگ میس میں یا ہم کام رہ جائے گا۔“

”ایسا بھی اہم اور لازمی فریضہ نہیں ہے۔ مودی بٹوانا، پلیز سعید بھائی جان! مجھے نہیں رہنے دیتے۔ وہاں خواتین میں تو بالکل ہی ایزی ٹیٹل نہیں کروں گا۔“

”حد کرتے ہو یا! شادیں کیا روز روز ہوا کرتی ہیں۔ مودی تو بٹوانا پڑے گی، یادگار ہوتی ہے۔“

”تو یہ یادگار لمحات واپس اپنے گھر جا کے بھی محفوظ کیے جاسکتے ہیں۔“ میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ”آپ پلیز باجی کو یہ بات سمجھائیے۔“

اور شاید ان کے سمجھانے پہ باجی مان ہی گئیں، جب ہی دوبارہ بلاوائیں آیا۔

نئی سچائی گاڑی میں اس کے برابر بیٹھے ہوئے مجھے یہ بات بالکل بھی محسوس نہ ہوئی مگر گھر آنے کے بعد جب باجی نے ڈرائنگ روم میں ہمیں ایک صوفے پہ بٹھاتے ہوئے، تصاویر اور مودی بٹوانے ہوئے مختلف شگون وغیرہ ادا کیے تو میرا دھیان پہلی بار اس جانب گیا، میں ٹھنک گیا اور اس کے بعد مجھے جیسے کونج کی لگ گئی۔ میری پہلی کوشش تھی کہ یہ سب فضول اور وقت ضائع کرنے والی رسمیں جلد از جلد ختم ہوں۔ میں اپنے کمرے میں جاسکوں اور..... اور..... بہر حال یہ صبر آزما انتظار ختم ہوا۔ باجی نے اسے میرے پہلو سے اٹھایا اور فاطمہ، مریم ام اس کا بھاری میران شرارہ سنبھالتی اسے کمرے تک لے جانے لگیں تو اس کا ہر اٹھنا قدم میرے اندیشے کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں اسے اپنی بہنوں کے جھرمٹ میں آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا اور میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔

”وہ ہاتھ، ہیر، ناک، کان..... ہر لحاظ سے مکمل ہے جیسے کتم ہو۔“ باجی کی یقین دہانی یاد آئی اور ان کا وہ پڑھوٹو لہجہ..... ”جیسے کتم ہو۔“

”جیسا کہ میں۔“ میں نے سوچا۔ ”کیا کیا باجی آپ نے میں تو اپنے ہی وجود کے ادھور ہونے کے احساس سے نکل نہیں پارا تھا کہ آپ نے ایک اور ادھورے وجود کو میرا ہم قدم بنادیا۔“

زنہب..... میری نئی ٹیٹل دلہن، میری منکوحہ..... جسے میں صرف سوا گھنٹہ قبل بیاہ کے لایا تھا..... وہ میرے ہی جیسی تھی۔ اتنی ہی مکمل، جتنا کہ میں..... اور اتنی ہی نامکمل جتنا کہ میں.....

اس کا قد تو شاید مجھ سے بھی ڈیڑھ دو انچ کم تھا۔ میں چھوڑے کی طرح دیکھنے والے کے ساتھ چپ چاپ سارے بنگلے چھوڑ کے ٹیرس پہ چلا آیا۔ وہاں کی سب لائٹیں آف تھیں۔ میں اندھیرے میں کھڑا رخصت ہوتے مہمانوں کو دیکھ رہا تھا اور اندازے سے لگا رہا تھا کہ اس ”بے مثال کھیل“ سے متاثر ہو کر کس کس نے..... کس کن الفاظ میں مدح سرائی کی ہوگی۔

”مہمان یوں کھڑے ہو رہنا! بالآخر صالح باجی نے مجھے ڈھونڈ نکالا۔ میں نے پلٹ کر انہیں دیکھا۔ پتہ نہیں اس سے انہیں میری نظروں میں کیا نظر آیا۔ گلے، شکوے، فریاد..... نہ جانے کیا کچھ کہہ پہلی بار میرے سامنے کڑوا کے نگاہ جھکانے پہ مجبور ہو گئیں۔“

”کیوں کیا باجی آپ نے ایسا۔ بتائیے، کیوں کیا آپ نے۔ مجھے آپ سے، کم از کم آپ سے یہ توقع نہیں تھی۔“

”میں نے تو.....“ انہوں نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر کہہ نہ سکیں۔

”آپ نے مجھے مکمل طور پہ قماشانا نے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔“

”میں نے تمہارے لیے بہتر سوچا۔“

”بہتر، یہ بہتر ہے باجی! کچھ تو انصاف سے کام لیجئے۔“

”تو تم کی توقع کر رہے رہنا! میں تمہارے لیے بر وقت، صحت مند خور پری ڈھونڈ کے لاتی۔“ انہوں نے سفاکی کی انتہا کر دی۔ میں قدرے لا جواب ہو کے چپ ہو گیا۔ غصے کے مارے یہ بات وہ کہتے تھیں مگر اب خود باجی کی تلگنی پہ خائفانہ نظر آ رہی تھی۔

”رخصا! میرے بھیا! تیری باجی تیرے لیے غلط فیصلہ کیسے کر سکتی ہے۔ تم ہی بتاؤ، تم شادی سے اس لیے کرا رہے تھے نا کہ تم احساس کمتری اور مرغوبیت کا شکار ہو کے نہیں رہنا چاہتے تھے۔ مجھے تمہارا یہ گریز سمجھ میں آ گیا تھا اور میں تمہیں اس میں حق بجانب بھی جانتی تھی۔ واقعی اگر کوئی ناول لڑکی تمہارے رکھ رکھاؤ، چاندیاد..... یا پھر تعلیم..... تمہاری عادتوں وغیرہ سے متاثر ہو کے تم سے شادی کر بھی لیتی تو کیا یہ کتنا عرصہ یہ پسندیدگی برقرار رہتی۔ ظاہری کشش اور خوبصورتی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اگر خود کسی کے دل میں یہ احساس نہ بھی ہو تو دنیا اس احساس کو چمکانے میں پیچھے نہیں رہتی۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی اچھے دل کی..... عمدہ ذہن والی لڑکی تمہیں اس غماں کے ساتھ صدمہ دل سے اپنا لیتی مگر یہ لوگ، دنیا والے کچھ ہی عرصے میں طرہ طے دے دے کر اسے فیصلے کو غلط سمجھنے پہ مجبور کر دیتے۔ اگر تم اس احساس سے بچنا چاہتے تھے تو میں بھی تمہیں اس دکھ سے بچانا چاہتی تھی، اس لیے زینب کو کچھ کے خیال آیا کہ وہ ایسی لڑکی ہے۔ جس کی تمہیں ضرورت نہ ہو مگر اسے تمہاری ضرورت بہر

حال ہے۔ وہ تمہارے ساتھ صرف خوش ہی نہیں رہے گی بلکہ قسمت کی اس مہربانی پہ ناز اس بھی ہوگی۔“

”لوگ تو اب بھی چپ نہ بیٹھیں گے باجی! ہمارا کپل دنیا کے لیے ایک مذاق بن جائے گا۔ باتیں تو اب بھی سننا پڑیں گی۔“

”مگر یہ باتیں کچھ دن تک تم دونوں کو صرف ملول ہی کریں گی، دلوں میں فاصلہ تو پیدا نہیں کریں گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتے ہوئے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے، اپنے اپنے دکھ درد بانٹتے ہوئے، تم دونوں کو یہ سب سنائی ہی نہ دے۔ تم ایک دوسرے کی رفاقت میں اتنے کھل مل جاؤ کہ دنیا کو ہی بھول جاؤ۔“ وہ غم آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ دبا کر بولیں۔ یہ سہانا خواب دکھانے پہ میں نے ممنون لگا ہوں سے انہیں دیکھا۔

اسی خواب کی ڈور تھام کے میں نئے سرے سے خود کو حوصلہ دلانا اپنے کمرے میں گیا۔ بید کے ایک سرے پہ ٹھکری سا بناوہ مختصر سا وجود میرے اندر نئے جذبات جگا گیا۔ میں نے آہستگی سے گھونکٹھٹا۔ اس کا چھوٹا سا گول چہرہ بے پناہ معصومیت اور پاکیزگی سیٹھے ہوئے تھا۔ صاف گندی رنگت والے عام سے نقوش کے حامل اس چہرے پہ بے حد خاص آنکھیں تھیں۔ حیا سے بوجھل، کشادگی اور وسعت سمیٹے گہری سیاہ جھٹکی، لائنی پکوں والی پُرکشش آنکھیں۔ اس کا انھما سا گدرا ہوا ہاتھ میرے ہاتھ میں سا گیا اور میں نے اسے وہ بریلست پہنا دیا جو بڑے شوق سے منہ دکھائی کے لیے خرید آیا تھا۔

اگلے روز ویسے ہی تقریب کے لیے تیار ہوتے ہوئے میں کل والے احساسات کو بالکل فراموش کیے ایک بار پھر سینکڑوں لوگوں کا سامنا کرنے کے لیے خود کو اعتماد سے عاری محسوس کر رہا تھا۔ اس سے میں، میں نے خود کو کد سے زیادہ لاچار اور بے بس محسوس کیا تھا۔

”باجی! یہ آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔“ میں ایک بار پھر وہی شکایت لے کر ان کے روبرو تھا۔ وہ حیران ہو کے مجھے دیکھنے لگیں۔ چپے کبڑی ہوں۔

”اتنا سمجھانے کے باوجود.....؟“ یوں بھی صبح ناشتے کے بعد مجھے مطمئن و گن دیکھ کر وہ خاصی خوش تھیں۔

”رضا! میں کیا کروں تمہارا۔“ وہ جیسے زچ ہو گئیں۔

”میں اپنے آپ کو ہسٹنہال کے دوسروں کے طرز و نمونے سے بچا بچا کے تھک چکا تھا۔ آپ نے مجھے ایک اور وجود کی شرمساری میں بھی حصر دیا بنا ڈالا۔ میں اپنے حصے کے مذاق

سمیٹا اب اس کے حصے کی شرمندگی کا بوجھ بھی اٹھاؤں۔“

”شرمندہ تو تمہیں ہونا چاہئے رضا! مگر اپنے ہونے نہیں، اپنے ان الفاظ پہ شرم کرو۔ ابوجی کی محبت اور فخر و مان یا د کرو، امی کے دکھانے کے نفل یاد کرو جو وہ تمہاری ہر سالگرہ پہ ساری ساری رات پڑھا کرتی تھیں۔ ہم بہنوں کو یہ دیکھو جو اتنے غرور سے تمہیں ہسیا کہہ کر پکارتی ہیں۔ تم نے تو ہمارے پیار کو مٹی میں ملا دیا۔ ابو کے فخر سے تے اپنے اور اچھے ہوئے سر کو جھکا دیا۔ تم..... تم..... رضا! خود کو ایک بوجھ کہہ رہے ہو، اپنے ہونے پہ شرمساری محسوس کر رہے ہو۔ نذیب سے نفرت اور کراہیت کا اظہار کرنے کا مطلب ہے کہ تم اپنے آپ سے کراہیت محسوس کر رہے ہو۔“

”نہیں باجی.....“ میں تڑپ اٹھا۔

”رضا! جب تک تم خود اپنے آپ کو تعظیم نہیں دو گے، دوسرا کوئی کیا دے گا؟ جتنی محبتیں تمہیں حاصل ہیں ان پہ قانع..... بلکہ مغرور ہو جاؤ تو دنیا والوں کا گریز دکھ نہیں دے گا۔ کیا تم معصوم لڑکی کو نہیں چاہ سکتے، اس غامی کے باوجود.....“

میں نے کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور پھر کوشش..... کوشش اور کوشش.....

نذیب کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا ویسے تو مشکل نہ تھا۔ تعلیمی لحاظ سے وہ صرف میٹرک پاس تھی لیکن بے حد سلیبی ہوئی اور ڈین لڑکی تھی۔ مذہبی رنگ اس کی فطرت و عادات میں نمایاں تھا۔ بیچ وقت نماز، تلاوت قرآن پاک نے اس کے چہرے پہ نور پھیلا رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ گھریلو امور میں خالق اور اخلاق کے لحاظ سے بھی بے مثل تھی۔ یقیناً وہ ایک ایسی بیوی تھی جس کے ساتھ کی تمنا ہر انسان کر سکتا ہے اور اس کا ساتھ پا کے شکر ادا کر سکتا ہے۔ میں بھی خوش تھا، مطمئن تھا مگر صرف اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر۔ باہر نکلنے ہی وہ نذیب جو مجھے گھر میں کسی نعمت سے کم نہیں لگتی تھی، رحمت لگنے لگتی۔ لوگوں کے ریمارکس۔

”وہ دیکھو، واٹ آپکل۔“

”اللہ ملانی جوڑی، ایک ہونا، اک بوئی۔“

”ماما! دیکھیں، بلل مین ایڈل ایڈی۔“

”واؤ! گریا اور گڈے کا کٹر لگ رہا ہے۔“

تب میرا دل چاہتا اس کے ساتھ ساتھ خود بھی کسی جگہ مقید ہو کے رہ جاؤں۔ جہاں کسی کی نظریں ہم تک نہ پہنچ سکیں۔ میں اس کے ساتھ باہر نکلنے سے ہر گز اجازت دیکھتا تھا مگر ان پانچ ماہ میں کتنی ہی بار مجبوراً کبھی کھانا پڑا، کبھی تو لوگوں کے اس رُخس کے نتیجے میں، میں

بہت جتنا بھٹتا ہی گھر آیا۔ کئی کئی دن اس سے بلاوجہ اکھڑا اکھڑا ہوتا۔ وہ حیرانی سے میرے بدلتے رویے کو دیکھتی اور میں حیرانی سے اس کے بے بسی ملاحظہ کرتا۔ شاید یہ سب باتیں اس کی سماعت تک پہنچی نہ تھیں یا شاید وہ اتنی بے حس تھی کہ اپنا مذاق بٹھا بھی اس پر اثر نہ کرتا تھا۔

☆=====☆

اور یہ ہے میری عمر کا تیسواں سال۔

میری عمر کا تیسواں سال شروع ہوا اور میری شادی کے پہلے پانچ مہینے تمام ہوئے۔ زینب کے ساتھ اس نئی زندگی کے آغاز میں بلاشبہ کی بار میرے قدم ڈگمگائے، کئی بار میرا حوصلہ ٹوٹا لیکن کبھی صالحہ باجی کی نصیحتیں، کبھی خدیجہ باجی کی پیار بھری جھڑپیں، کبھی ابو جی کی وہ پرانی باتیں اور کبھی خود زینب کی مصصومیت اور اچھائی مجھے سنبھال لیا کرتی لیکن پانچ ماہ بعد ملنے والا یہ جھکا سب سے شدید تھا۔

”آپ کی بیوی امید ہے۔“

لیڈی ڈاکٹر کے یہ الفاظ میرے لیے قطعی غیر متوقع تھے۔

یہ ایسی انہونی تو نہ تھی۔

ہماری شادی کو نصف سال گزرنے والا تھا اور ایسا بہر حال جلد یا بدیر ہوتا ہی تھا، لیکن اس کے باوجود میں حیران بھی تھا اور پریشان بھی۔

میرا خیال ہے یہ بتانے کی ضرورت تو نہیں۔ میں سہام رضا۔ چارٹ ڈیڑھ اچ کے قدر تیس سال کی عمر میں محض اڑتالیس کلو وزن رکھنے والا ایک مرد، زینب سہام رضا۔ تین فٹ نو اچ کے قدر اکیس سال کی عمر میں صرف پچیس کلو وزن رکھنے والی ایک عورت۔ یعنی جسمانی لحاظ سے ایک اینارمل مرد اور عورت اگر کسی بچے کو جنم دینے والے ہیں تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ بچہ نارمل ہی ہوگا۔ ماں باپ میں سے اگر کسی ایک کے جنم میں بھی اینارملٹی موجود ہو تو فنی پرنسٹ چانسر ہوتے ہیں کہ ہونے والے بچے میں وہ اینارملٹی منتقل ہو سکتی ہے جبکہ ہم دونوں میاں بیوی ہی۔۔۔۔۔

اس خبر کو سنتے ہی یہ پہلا خیال تھا جو میرے دل میں آیا اور یہ پہلا خیال ہی اتنا روح فرسا تھا کہ اس نے اس خبر پہ مجھے ڈھنگ سے خوش تک نہ ہونے دیا۔ میں باپ بننے جا رہا تھا یہ تصور ہی کتنا خوش کن ہو سکتا ہے لیکن میری کمزوریاں مجھے یہ خوش منانے سے روک رہی تھیں۔

نہیں میں باپ نہیں بننے والا۔ میں۔۔۔۔۔ میں تو۔۔۔۔۔ ایک اور سزا پانے والا ہوں۔ میں۔

کچھ تخلیق نہیں کرنے جا رہا، میں ایک نوزائیدہ وجود کو اپنے اینارمل جنم و ارث میں دیتے ہوئے اسے مسخ کرنے جا رہا ہوں۔ میں ایک نیا رشتہ نہیں، ایک نیا مذاق بنانے والا ہوں۔ وہ ننھا وجود ہماری زندگی میں نہیں، ہماری شرمندگیوں میں شامل ہونے آ رہا ہے۔ اپنے جسے کسی شرمساریاں سمیٹے۔

ان سب سوچوں اور اندیشوں سے یکسر بے نیاز زینب بے انتہا خوش نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ڈاکٹر نے اسے دونوں جہاں کی خوشیوں کی نوید سنا دی ہو۔ اندرونی تہجان آمیز مسرت کی وجہ سے اس کا گندی چہرہ ہتھار ہا تھا۔ اس کے لبوں کی لرزش بے حد نمایاں تھی۔ گھر آنے کے بعد اس نے محبوب نظر وں سے میری طرف دیکھا مگر میرے پتھریلے تاثرات دیکھ کے ٹھٹھک گئی۔

”پتہ ہے، میں پہلے ہی جاتی تھی۔“ اس نے پلکیں جھکاتے ہوئے انگلیاں مسلتے ہوئے حیا سے بو جھل آواز کے ساتھ کہا۔

”لیکن مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں یہ محض میری خوش فہمی نہ ہو۔ میں بھلا ایسی خوش نصیب۔۔۔۔۔ لیکن شکر ہے اللہ نے ہمیں اس خوشی سے نوازا۔“ میرے جذبات سے بے نیاز وہ مسلسل اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ میں نے خود کو بیڈ پہ اوندھا کر لیا۔

”سچ بتائیں، آپ کو امید تھی؟ میرا مطلب ہے ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے آپ کو اندازہ تھا؟“ اس نے شرما تے ہوئے سوال کیا۔ کافی دیر چپ رہنے کے بعد میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”بھئی آپ اتنے حیران ہیں۔“ اس نے میری خاموشی کی وجہ دریافت کی۔

”اب سب سے پہلے صالحہ باجی کو فون کر کے یہ خوشخبری سناتے ہیں۔ انھیے نا، وہ کتنی خوش ہوں گی۔“ اس نے میرا شانہ ہلا کے کہا۔ میں نے آنکلی سے سر کوٹ لی۔

”نہیں، میں انہیں فون نہیں کروں گا زینب!“

”ہائے، تو کیا میں کروں گی؟ نہیں نہیں، مجھے تو بہت شرم آئے گی۔ ان سے میں کیسے یہ بات کہہ پاؤں گی۔ انھیں ایسا کرتے ہیں، آپ کل مجھے اُمی کی طرف چھوڑ آئیں۔ میں بھائی سے بات کروں گی، ان سے کہنے میں مجھے زیادہ پرہیز نہیں ہوگی۔ وہ اُمی کو بتا دیں گی اور اُمی خود ہی صالحہ باجی اور خدیجہ باجی کو۔۔۔۔۔“

”نہیں زینب!“ میں اس کی بات کا تئیر ہی سے اٹھ کے بیٹھ گیا۔

”تم ان سے بھی کچھ نہیں کہو گی۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“ وہ زرد پڑ گئی۔
”ہمیں یہ پچ نہیں چاہئے نرنب۔“

”آپ جانتے ہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ اس کے لیوں نے نامحسوس سی حرکت کی۔ اگر میں اس وقت اس کے بالکل نزدیک نہ بیٹھا ہوتا تو ہرگز نہ سن پاتا۔
”ہاں، اور میں مشکل سے ہی بھی مگر بہت سوچ سمجھ کے یہ فیصلہ کر پایا ہوں۔“ اس کی ولی کیفیت کا اندازہ کر کے میں نے اس کے ہاتھ تھام لیے اور ہولے سے سہلانے لگا مگر اس نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ واپس کھینچ لیے اور دشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”فیصلہ؟“ آپ ہوتے کون ہیں یہ فیصلہ کرنے والے؟“ وہ چلائی۔ ان پانچ ماہ میں بلاشبہ میں نے پہلی بار اس کی اتنی بلند آواز سنی تھی۔
”اور تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ کرنے والی۔“ اس کے چلانے پہ مجھے بھی غصہ آ گیا۔

”تم اس کیلی اس بچے کو پیدا کرنے اور پالنے کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔“
”اور آپ بھی اس بچے کو زندگی سے محروم کرنے کا سفاک فیصلہ نہیں بنا سکتے۔“
بلکہ آپ تو کیا میں بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکتی۔ ہماری رسالت ہی کیا ہے جو ہم ایک ایسی زندگی کو سانس لینے سے روکیں جو حکم الہی سے وجود میں آ رہی ہے۔ یہ گناہ ہے اور پھر اپنی ہی اولاد کو۔۔۔ آپ کا دل نہیں کانا ہے بات کہتے ہوئے۔ آپ کے دل میں محبت کا کوئی جذبہ۔۔۔“
”میرا دل کا پتہ ہے نرنب! مگر یہ سوچ کر کہ وہ سب تکلیفیں اس کی زندگی کا بھی حصہ نہیں گی جو میں نے کہیں۔ وہ سب ٹھوکریں اس کا بھی مقدر ہو گئی جو میرا ہے۔ میرے دل میں محبت ہے نرنب! اور یہی محبت مجھے اسکا رہی ہے کہ میں اسے ان تکلیفوں سے بچاؤں، اس کی قسمت میں یہ سب نہ آ دوں۔“

”نہ آپ نے اپنی قسمت بنائی تھی اور نہ کسی اور کی قسمت بنانے پہ قادر ہیں اور مجھے سمجھ میں نہیں آتا آپ کن تکلیفوں، کن ٹھوکر اور کن تکلیفوں کی بات کر رہے ہیں۔ کیا ہے جو آپ کو نہیں ملا؟“

”تم کیا جانو نرنب! خاندان میں، گلی محلے سے لے کر اسکول، کالج اور یونیورسٹی تک مجھے ہمیشہ خجارت کا سامنا کرنا پڑا۔ مجھے کسی نے دوستی کے لائق نہیں جانا۔ کبھی مجھے میری ذہانت اور لیاقت کی وجہ سے نمایاں نہیں ہونے دیا گیا، اس لیے کہ میری ذات کی سب سے نمایاں چیز تو میرا قد تھا۔ جو اتنا مختصر اور اتنا کم ہونے کے باوجود اس قدر اہم تھا کہ میری ہر

”تم کسی سے کچھ بھی نہیں کہو گی۔ سنا تم نے، کچھ بھی نہیں۔“

”لیکن۔۔۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا مگر میں نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

”بس، میں نے کہہ دیا کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں۔ نہ ابھی نہ پھر بھی۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایسی باتیں بھلا کب جھپٹی ہیں اور۔۔۔ اور مجھے سمجھ نہیں آتا، ہم یہ

بات چھیماں گے کیوں؟ خوشی میں اپنے ہی شریک نہ ہوں تو کیا فائدہ؟“

”خوشی؟“ کیسی خوشی؟ تم پاگل ہو نرنب اتنی خود غرض نہ بنو۔ اپنی خوشی میں مگن ہو کے یہ بات فراموش نہ کرو کہ تم کیا ہو۔ اٹھو۔ یہ دیکھو، کیا ہو تم۔؟“ یہ حد اشتعال کے ساتھ میں نے اسے بازو سے تھام کے اپنے کے سامنے کھڑا کیا۔ میرا جارجا نہ رویہ اس کے لیے بالکل نئی چیز تھا۔ وہ سبھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

”یہ ہو تم اور یہ میں ہوں، تمہارا شوہر۔ غور سے دیکھو۔ کیا یہ عورت اور یہ مرد ایک صحت مند اور نارمل بچہ پیدا کر سکتے ہیں؟ جواب دو نرنب۔“ میں نے اسے تقریباً جھجھوڑ ڈالا۔ اس کا کچھ منٹ پہلے خوشی سے گنار ہوتا چہرہ اب لٹھے کی مانند سفید تھا۔ وہ خدشہ جو اس خبر کو سننے ہی میرے دل و دماغ میں کٹھنی مار کے بیٹھ گیا تھا، اب اس کی سوچوں میں بھی سرسرا نے لگا۔

”آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟“ اچانک اس ہراس سے باہر آتے ہوئے وہ سلگ اٹھی۔ ”ابھی ابھی ہمیں یہ خوشخبری ملی ہے اور آپ ایسی بدشگونی کی باتیں کر رہے ہیں۔“
”بدشگونی وغیرہ بکواس باتیں ہیں۔ حقیقت پسندوں اور حقیقت سے ہے کہ ہماری اگر کوئی اولاد ہو گی تو وہ ہمارے جیسی ہی ہو گی۔“

”میں نہیں مانتی یہ محض آپ کا وہم بھی ہو سکتا ہے اور بالفرض یہ حقیقت ہے بھی تو حقیقت تسلیم کرنے کے لیے ہی ہوتی ہے، اسے بدلنا ہمارے اختیار میں نہیں۔ صرف حقیقت پسند بننے سے کیا ہوگا، حقیقت کو قبول کرنا بھی سیکھئے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب یہ کہ اب جو بھی سے سو ہے۔“ وہ مجھے سمجھانے میں ناکامی محسوس کرتے ہوئے بڑی لاچار سی لگ رہی تھی۔ ”کیا کیا جا سکتا ہے، ہم قسمت سے لڑو نہیں سکتے۔ اگر ہمارا بچہ۔۔۔“

”کیا کیا جا سکتا ہے؟ یعنی تمہارے خیال میں جو ہونے جا رہا ہے، میں اسے ہونے

دون۔“ میں نے تیز لہجے میں کہا۔

خوبی پہ چھا جاتا تھا۔ جنہیں کیا پتہ کن حالات میں، میں نے تعلیم حاصل کی اور اس کا بھی مجھے کیا فائدہ ہوا۔ کی تو میں نے دکا نداری ہی۔ ابوجی کا خواب میں چاہنے کے باوجود پورا نہ کر سکا۔ جو انہوں نے دیکھ رکھا تھا کہ ان کا اکھٹا پیٹا کوئی اعلیٰ انفریجے گا، ڈاکٹر وکیل یا انجینئر بن کے ان کا نام روشن کرے گا مگر میں کیا کرتا، ہر پوست کے لیے مجھے میرے قدم کی دھڑ سے نااہل قرار دے دیا جاتا۔ میں وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔

”میں محسوس کر سکتی ہوں۔“ اس کا طیش بھی ذرا کم ہوا اور اس نے آہستگی سے کہا۔

”اس لیے کو تفریباً مجھے بھی یہ سب کچھ سہنا پڑا تھا۔ میں بھی یونہی کڑھا کرتی تھی۔ میں نے بھی اسکول جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اباجی کے کہنے پہ مارے باندھے میرے کمر کا امتحان پرائیویٹ طور پر دیا مگر آگے پڑھنے پہ تیار نہ ہوئی، مگر پھر غصے کے بھی نہیں۔ میرا خیال تھا کہ پڑھ لکھ کے مجھ میں کون سا فرق آ جائے گا۔ پھر اباجی ہی کے کہنے پہ میں نے قرآن حفظ کرنا شروع کیا۔ اس علم سے حصول سے انکار کرنے کی جرأت میں نہ کر پائی اور مجھی میرے خیال میں تبدیلی آنا شروع ہوئی۔ میں نے اپنی ذات کی ان خامیوں پہ جلنا کرھنا چھوڑ دیا، اب میں ان ہزار رفتوں کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرنے لگی جو خدا نے مجھے دی تھیں۔ مجھے ایک دینی و مذہبی گھرانے میں پیدا کیا، مجھے نیک اور صالح والدین کی اولاد دینا جنہوں نے میری اعلیٰ تربیت کی، مجھے حافظ قرآن بننے کی سعادت عطا فرمائی اور وہ دیا جس کی امید بھی کسی کو نہ تھی، آپ جیسا شوہر اور اب ماں بننے کی نوید۔ کیا ایک مکمل عورت کی یہی زندگی نہیں ہوتی؟ یا اسے کچھ اور بھی چاہیے ہوتا ہے؟۔۔۔ نہیں ناں تو پھر میں مکمل عورت کیوں نہیں ہوں، اور میری زندگی مکمل کیوں نہیں۔“

”تم جو بھی کو نہ نسا، میرا فیصلہ نہیں بدل سکتا تمہاری کئی باتیں درست تھیں۔ چلو تم کہتی ہو تو میں خود کو خوش نصیب تک ماننے پہ تیار ہوں مگر میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔“ اس کی باتوں پہ دھیرے دھیرے قائل ہوتے دل کو میں نے پھر سے آنے والے وقت کی سنگینی سے ڈرایا اور اپنے فیصلے پہ ڈھٹائی سے جمارہا۔

”میں دیکھتی ہوں آپ یہ فیصلہ کیسے نہیں بدلتے۔“ وہ ہتھیلیوں کی پشت سے بپتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آپ کی اس فضول ضد کے آگے ڈٹ کے کھڑے ہونے کے لیے اگر میری ہمت کم پڑی تو میں مدد کے لیے پکارنے سے گریز نہیں کروں گی۔“ وہ جیسے دواغ دہتی کرے سے نکلی۔

اگلے دو دن تک ہمارے درمیان بات چیت برائے نام رہی۔ بلکہ جو تھوڑی بہت ہوئی بھی وہ میری ہی جانب سے تھی، وہ چٹان کی طرح مضبوطی سے جکھی کھڑی تھی۔ ایسا نہ تھا کہ میں نرم پڑ رہا تھا بلکہ میں اسے دھرج اور شٹائی سے آدھ کرنا چاہتا تھا۔ تیسرے دن مجھے احساس ہوا کہ وہ اس خود ساختہ ناراضی کو اپنے لیے حوالہ کی طرح استعمال کر رہی ہے۔ یوں تو وقت ٹپکتا جائے گا۔ میں نے ذرا سخت لہجے میں اس سے کہا۔

”بہت ہو گیا نسا، اب تیرے سوسے بہا لیے تم نے۔“ تم کیا سمجھتی ہو مجھے کوئی کھ نہیں ہوگا۔ یا یہ سب میں کس شوق کے مارے، اپنے دل کی خوشی پوری کرنے کے لیے کر رہا ہوں۔ یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔ زیادہ دیر کے وقت ضائع مت کرو۔ میں ڈاکٹر سے ٹائم لے لیتا ہوں۔ تم تیار۔۔۔“

”بس سمجھو۔“ وہ تڑپ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ یہ طے کرنے کا حق آپ کو کسی نے نہیں دیا کہ ہمارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں۔ اللہ ہمارے لیے جو ٹھیک سمجھتا ہے، وہی کرتا ہے۔“

”تو یہی سمجھ لو کہ اللہ کی مرضی بھی اس میں ہوگی۔“

”ستر ماؤں سے بڑھ کے چاہئے والا اللہ اگر اس زندگی کو لا رہا ہے تو وہ اس کی قسمت بھی لکھ چکا ہوگا۔ جسے بدلنے کا اختیار آپ کو نہیں۔“ وہ کمرے سے نکل گئی۔ حیرت انگیز بات تھی کہ اس کی اتنی کڑی کسل بائیں سننے کے بعد بھی مجھے فخر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تو دونا آ رہا تھا۔ میں چپ چاپ کمرے میں اندر اکیسے اپنے ستر میں دیکارہا۔

اس نے دھمکی دی تھی کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ کسی کو مدد کے لیے پکارنے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔ اگلے دو گھنٹوں میں اس نے اپنی دھمکی پہ بھی عمل کر ڈالا۔ سب سے پہلے صالہ باجی کا فون آیا۔

”مبارک ہو بھئی، میرا راجا بھیا اب پایا بنے والا ہے۔“ ان کی مبارک باد بدلتی آواز میں خوشی اور جوش اٹھائیاں نہ تھا، جتنا کہ وہ باد باد غصہ چھلک رہا تھا۔ میں بھانپ گیا کہ نسا اب انہیں سارے معاملے سے آگاہ کر چکی ہے اور وہ صرف مجھے نونے کی غرض سے تہدید باندھ رہی ہیں۔ ان کی مبارک باد کے جواب میں، میں نے چپ سا مدھر دیکھی۔

”کیا ہوا، کیا خوشی کے مارے آواز تک نہیں نکل رہی۔“ اب ان کی آواز میں طنز بھی شامل ہو گیا۔

”جب آپ کو نسا نے ساری بات بتا دی ہے باجی، اتویوں بھگو بھگو کے مارنے کی

کیا ضرورت ہے، کہ ڈالے سب کچھ، جتنی صلواتیں سناٹی ہیں، سنا ڈالے۔“ ان کی طبیعت اور مزاج سے اچھی طرح واقف ہونے کی وجہ سے میں نے خود کو ہر قسم کی بری پہلی سننے کے لیے تیار کیا۔

”میں تمہارے منہ سے سنا چاہتی تھی۔“ کچھ عرصے کے بعد ان کی آواز سناٹی دی، جو اب بالکل سپاٹ اور بے تاثر تھی۔

”ہوں تو فندی نا..... زنب لاکھ اچھی سہی، ماں جانی تو نہیں، بھائی ہے۔ جب اس نے روتے بھکتے یہ بات مجھے بتائی تو میں نے اس کا ذرا یقین نہ کیا، الٹا اسے ڈانٹا کہ میرے رخصتے کے بارے میں ایسا اس نے کہا ہی کیوں؟ وہ کیا پاگل ہے، نفسیاتی مریض ہے جو ایسی بات کہے گا۔ کتنے اعتماد سے میں نے اسے جھٹلایا،“ ان کی بات پر میں شرمندہ ہو گیا۔

”رضا! کیوں کہاں تم نے؟“

”بائی، میں.....“ میں نے طریقے سے انہیں اپنے خدشات سے منحصر آگاہ کیا۔

”رضا! میں اتنی پرچی کبھی تو نہیں لیکن پھر بھی تمہاری بات سمجھ گئی ہوں، لیکن مجھے ایک بات تو بتاؤ! واقعی اولاد بقول تمہارے ماں باپ سے وراثت میں سب کچھ لے کے پیدا ہوتی ہے تو پھر تم ایو جی جیسے تو مند اور سودہ..... ای کے جیسے سرخ و سفید کیوں نہیں تھے؟ ہماری نسل میں دادا، پردادا..... سارے خیمیاں میں یہ مرض نہیں نہیں تھا..... پھر تم نے کہاں سے لیا؟ کیا اس سوال کا جواب ہے تمہاری سائنس کے پاس۔ دیکھو رضا اگر صحت مند اور نادرل ماں باپ کے ہاں ایسی اولاد پیدا ہو سکتی ہے جو ذرا سا جسمانی عیب رکھتی ہو تو پھر کمزور ماں باپ صحت مند اور تندرست اولاد کیوں نہیں پیدا کر سکتے؟“

غالب توقع انہوں نے ڈانٹا، نہ جھڑکا بلکہ ایک واضح سوال چھوڑ کے فون بند کر دیا۔ ابھی میں اس کا جواب دھڑوڑی رہا تھا کہ خدیجہ بائی آئیں۔ ان کی آنکھیں متورم تھیں جیسے راستے بھرو روتی رہی ہوں۔

”بے حیا، بے شرم۔“ کمرے میں آتے ہی وہ شروع ہو گئیں۔ وہ سب جو سننے کی توقع میں صابر بائی سے کر رہا تھا، اس کا آغاز انہوں نے کر دیا۔

”ناشکر! کہیں کا۔“ کہتا ہے مجھے یہ اولاد نہیں چاہئے۔ ارے تجھے نہیں چاہئے تو اس بد نصیب کو کیوں ستاتا ہے، کیوں اسے مجبور کر رہا ہے۔ جہاں جاکر اللہ سے لگے کہ..... اولاد تو تجھے ای کی ذات دے رہی ہے۔ جا، جاکر کہہ دے کہ تجھے یہ رحمت نہیں چاہئے۔ تو دنیا کا واحد شخص ہوگا جو خود اللہ کو اس کی رحمت و برکت واپس لوٹائے گا۔“

یہ خواب جو کوئل ہے ○ 249

”آپ میری پوری بات تو سنیں۔“ میں ان کی حالت سے گھبرا گیا۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔

”مجھے نہیں سننی یہ کیجیہ جلائے والی باتیں۔ ارے میرے توبہ سے آگ گئی ہے۔ ہم پاگل تھے جو تجھ سے اتنے سالوں سے محبت کرتے آ رہے ہیں۔ میری ماں دیوانی تھی جو مرے وقت تک روز رات کو تیرا ہاتھ چوم کر دم کرنے کے بعد سوئی تھی اور میرا باپ وہ تو سب سے بڑا نادان تھا جس نے بیٹے کو اپنی باسط اور حیثیت سے بڑھ کے لاڈلو آسائش سے پالا۔ اولاد کی محبت اور اس کی آزمائش سے ڈر رہا ہے۔ کم قاتل انسان یہ آزمائش بھی قسمت والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ تجھے میری غالی گود نظر نہیں آتی۔ تجھے میری ویرانی نظر نہیں آتی۔ میرے جیسے کتنے ہیں جو راتیں جاگ جاگ کے دعائیں مانگتے ہیں، بعد سے میں روتے بھکتے ہیں مگر..... تجھے بن مانگے نعت مل رہی ہے اس لیے ناشکر! بن رہا ہے۔“

میرا سر جھک گیا۔ پچھلے شرمندگی نے مجھے کسی سے آنکھ ملانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔ جب میں نے یہ جذباتی فیصلہ کیا تھا تب بھی مجھے اندازہ تھا کہ یہ فیصلہ کسی کے لیے بھی آسانی سے قابل قبول نہ ہوگا، سب ہی بڑھ چڑھ کے مخالفت کریں گے لیکن اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ میں سب کو اپنے بڑے زور و لال کے ذریعے قائل کر لوں گا..... اور ہو یا کیا میں خود ہی.....

”اللہ کی رحمت سے مایوسی کفر ہے۔ تو ایسا کیوں سوچتا ہے۔ یہ بھی تو سوچ سکتا ہے اللہ تیری محرمیوں کے ازالے کے لیے تجھے اولاد دے رہا ہے۔ جو خواب ابوی تیرے حوالے سے پورے نہیں کر پائے، انہیں مکمل کرنے“ وہ..... آ رہا ہے۔ اگر کوئی اندیشہ ہے بھی تو دعا مانگ میرے بھائی اللہ سے رحم مانگ، اس کا کرم طلب کر۔ تیرے اکیلے کا ہاتھ نہیں، نہ تب اور نہ چاروں بہنوں کی جھولیوں بھی مانگنے کے لیے انھیں کی اور مجھے اللہ سے پوری امید ہے ان شاء اللہ میرے بھائی کے انگن میں چاند سا پچ..... صحت مند بچہ کھیلے گا۔“ ان کا غصہ شاید میری پسائی دیکھ کے کم ہو گیا۔

”اور اگر خدا خواستہ..... خدا خواستہ..... میرے منہ میں خاک دھول، اگر تیرا کوئی داعیہ بھی مجھ کا تو ٹھیک ہے تو خود کو آزمائش میں مت دالنا، میری جھولی میں ڈال دینا۔ میں اسے پال لوں گی۔“

”آپ.....؟ آپ کیسے؟“

”ویسے ہی جسے ابوی اور امی نے جنمیں پالا تھا، پھیلی کا چھالنا بنا کر۔ اللہ کے حضور

شکرانے ادا کر کے... ویسے ہی میں بھی یا لوں گی۔“

اور یہ میری زندگی کا پہلا سال ہے۔

وہ پہلا سال جس میں میں خود کو خوش نصیب محسوس کر رہا ہوں کیونکہ آج اللہ مجھے اپنی رحمت سے نوازنے والا ہے۔ زینب اندر لبر لبر رہی ہے۔ بہر میں، خدیجہ باجی، فاطمہ اور میری ساس بہن سب خوش ہیں۔ ڈاکٹر نے پہلے ہی بتا رکھا ہے کہ بڑھاپا بچے میں سے ناسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ دونوں میں سے ایک بچہ میں خدیجہ باجی کی سوتیلی گود میں ڈال دوں گا۔ زینب نے میرے فیصلے کی بھر پور تائید کی تھی۔

ان خواہوں میں رنگ بھرنے والے ننھے سے وجود کا میں بے چینی سے منتظر ہوں۔

”دنیا میں جب بھی کوئی نیا وجود جنم لیتا ہے تو وہ اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اللہ ابھی انسان سے مایوس نہیں ہوا۔“

عین - شین - قاف

[illegible]

عالمی ہسپتال
نسبت روڈ، چوک میوہ ہسپتال، لاہور

علی رضا ایلیگز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور 7247414